باسمہٖ سبحانہٗ وتعالیٰ

حضرت حکیم الامت اور انکے خلفاء کی سیاسی خدمات کا تفصیلی جائزہ

زیر نظر کتاب میں حضرت حکیم الامت رحؒ اور انکے خلفاء کی سیاسی خدمات اور پولیٹیکل معاملات میں انتہائی بصیرت و فراست کا تفصیلی جائزہ اور مختلف سیاسی اشکالات کا حل پیش کیا گیا ہے

مجازِ بیعت مفتیِ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کراچی

ترتیب : رانا محمد اشرف

نظرثانی : حضرت مولانا محمد اِقبال صاحب قریشی

ناشر

ادارہ تالیفات اشرفیہ جناح ٹاؤن، مسجد تھانے والی
ہارون آباد، ضلع بہاولنگر

باسمہٖ سبحانہ و تعالیٰ

حضرت حکیم الامت اور ان کے خلفاء کی سیاسی خدمات

(تفصیلی جائزہ)

ترتیب: رانا محمد اشرف
نظر ثانی: حضرت مولانا محمد اقبال صاحب قریشی

مجاز بعیت مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کراچی

زیر نظر کتاب میں حضرت حکیم الامت اور ان کے خلفاء کی سیاسی خدمات اور پولٹیکل معاملات میں انتہائی بصیرت و فراست کا تفصیلی جائزہ اور مختلف سیاسی اشکالات کا حل پیش کیا گیا ہے۔

ناشر: ادارہ تالیفات اشرفیہ
جناح ٹاؤن / مسجد تھانے والی ہارون آباد ضلع بہاولنگر

قیمت =/80 روپے

نام کتاب	:	حضرت حکیم الامت اور ان کی خلفاء کی سیاسی خدمات (تفصیلی جائزہ
ترتیب	:	رانا محمد اشرف
نظر ثانی	:	حضرت مولانا محمد اقبال صاحب قریشی
ناشر	:	ادارہ تالیفات اشرفیہ جناح ٹاؤن۔ ہارون آباد ضلع بہاولنگر
پرنٹر	:	شرکت پرنٹنگ پریس 43۔ نسبت روڈ۔ لاہور
تعداد	:	ایک ہزار
قیمت	:	=/80 روپے

فہرست

انتساب

میرے پیارے نانا جی چوہدری نذیر احمد خاں المعروف شاہ جی کے نام جو سال 1926ء ہندوستان کے آبائی قصبہ بھگلدنہ ضلع ہوشیار پور سے تھانہ بھون اپنی اصلاح اور تعلیم و تربیت کے لئے حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہ کی خدمت میں حاضر خدمت ہوئے۔ اور اسی تعلیم و تربیت کے ثمرہ میں آج یہ کتاب پیش خدمت ہے۔

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندگی

رانا محمد اشرف

بیت الاشرف

ہارون آباد

تقریظ

پیر طریقت حضرت مولانا محمد اقبال صاحب قریشی دامت برکاتھم تعالیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم و علی آلہ واصحابہ اولیاء اجمعین ○ اما بعد

پیر طریقت حضرت مولانا محمد اقبال صاحب قریشی دامت برکاتھم العالی مجاز بیعت حضرت مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کراچی

حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت زار کے متعلق جب رات کے وقت خیال آجاتا ہے۔ تو نیند اڑ جاتی ہے اور اگر کھانے کے وقت خیال آجاتا ہے تو بھوک ختم ہو جاتی ہے۔ اب اس بات میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی علیحدہ اسلامی سلطنت کا خیال سب سے پہلے کس کو آیا؟ اس بات کا مکمل کریڈٹ حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا تھانوی قدس سرہ کو جاتا ہے۔ اس کتاب میں اسی بات کے متعلق اور حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی علیحدہ اسلامی سلطنت کے قیام کے متعلق کیا خدمات ہیں؟ اس بات پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔

ہمارے ملک میں ۹ نومبر کو ہر سال یوم اقبال منایا جاتا ہے۔ ۲۵ دسمبر کو یوم قائداعظم منایا جاتا ہے۔ اور ان قومی تہواروں پر ہر سال عام تعطیل ہوتی ہے۔ ۲۰ جولائی جو کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ کا یوم وفات ہے۔ اگر ۲۰ جولائی کو قومی تہوار قرار دیکر عام تعطیل کر دی جائے۔ تو پھر بھی کچھ نہ کچھ حق خدمت ادا ہو جاتا ہے اور ہمارے نسل نو ان واقعات سے متعارف ہو سکتی ہے۔ کہ ہمارے اسلاف کی

ہمارے لئے اور ہمارے ملک کے لئے کیا خدمات ہیں؟

مشفقی جناب رانا محمد اشرف صاحب کو اپنی اسلاف اور اسلاف کی تاریخ سے بچپن ہی سے غایت دلچسپی ہے اور اس سلسلہ میں ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ حال ہی میں انہوں نے قیام پاکستان و حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کے عنوان سے تحقیقی کتاب مرتب کی ہے۔ جسمیں بہت سے گوشوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپکی سابقہ تالیف "جوڑوں کا درد' اسباب و علاج" کی طرح اسے بھی عوام و خواص میں قبولیت عطا فرمائے۔ اور مولف کو اجر جزیل سے نوازے۔ آمین۔

محتاج دعائے خیر
بندہ محمد اقبال قریشی
امام و خطیب جامع مسجد تھانیوالی
ہارون آباد
یکے از خدام مجلس صیانۃ المسلمین
مورخہ ۲۳ ذوالحجہ ۱۴۱۹ھ

ایک تاریخی مغالطہ

ستمبر ۱۹۳۰ء لندن میں چودھری رحمت علی نے لفظ پاکستان تجویز کیا۔ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قیام کا خیال حضرت علامہ محمد اقبال نے مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۳۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں اپنے خطبہ صدارت کے دوران پیش کیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء لاہور کے تاریخی اجلاس میں ملی نصب العین کے طور پر ایک قرار داد کے ذریعہ باقاعدہ الگ وطن کا مطالبہ کیا گیا۔ مگر ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے خطبہ اور قرار داد لاہور کے ذریعہ باقاعدہ الگ وطن کا مطالبہ کیا گیا۔ مگر ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے خطبہ اور قرار داد لاہور میں لفظ پاکستان کہیں بھی استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ اسے ہندو اور برطانوی پریس نے تمسخر و استہزا کے طور پر اچھالا۔ اسلامی سلطنت کے قیام کا جو خیال ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے مسلم لیگ کے مذکرہ بالا اجلاس میں پیش کیا تھا۔ بالکل وہی خیال جون ۱۹۲۸ء میں ان سے بہت پہلے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ اپنی مجلس عام میں کئی بار اظہار فرما چکے تھے۔ بلکہ اس کا مکمل خاکہ اور حصول کا پروگرام بھی بنا چکے تھے اسکی تفصیل آپ کتاب ہذا میں مطالعہ فرمائیں گے۔ یہاں صرف اس تاریخی مغالطہ کو دور کرنا ہے۔ کہ مسلمانوں کے لئے علیحدہ اسلامی سلطنت کے قیام کے خیال سب سے پہلے ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کو نہیں بلکہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ کو آیا۔ یہ جون سال ۱۹۲۸ء کی بات ہے۔ جس کا اظہار حضرت حکیم الامت نے بار بار مجالس عامہ میں بھی فرمایا۔ اس تاریخی مغالطہ کو دور کرتے ہوئے جہاں ۹ نومبر کو ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے یوم پیدائش پر ہر سال عام تعطیل ہوتی ہے۔ وہاں ۱۴ رجب المرجب ۱۳۶۲ ہجری بمطابق ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کو جو کہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی کا یوم وفات ہے۔ اس دن بھی عام تعطیل ہونی چاہئے۔ تاکہ عوام الناس اور آئندہ آنے والوں نسلوں کو معلوم ہوسکے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے علیحدہ اسلامی سلطنت کے قیام کا خیال سب سے پہلے کس کو آیا؟ امید ہے کہ اہل دانش اور ارباب اقتدار اس بات پر غور فرمائیں گے۔

دعاؤں کا محتاج
رانا محمد اشرف (گولڈ میڈلسٹ)
بیت الاشرف ہارون آباد

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہ کے متعلق قائداعظم کا فرمان

ایک شخص نے قائداعظم سے سوال کیا ہندوستان کے بڑے بڑے علماء تو کانگرس کے ساتھ ہیں۔ کیا مسلم لیگ کی حمایت کرنے والا کوئی عالم دین بھی ہے؟ قائداعظم نے برجستہ جواب دیا۔ کہ مسلم لیگ کی حمایت کرنے والا ایک ایسا عالم دین ہے کہ اگر ترازو کے ایک پلڑے میں ہندوستان کے سب علماء کو بٹھا دیا جائے۔ اور دوسرے پلڑے میں ہمارے ان عالم دین کو بٹھا دیا جائے تو ہمارے والا پلڑا جھک جائیگا۔ وہ شخص بڑا حیران ہوا اور پھر سوال کیا کہ وہ اتنا بڑا عالم دین کون ہے۔ قائداعظم نے جواب دیا کہ وہ تھانہ بھون کے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ہیں۔

مسٹر جناح قائداعظم کا ایک خط حضرت کے نام

رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ ہی کا زمانہ لیگ اور کانگرس میں باہمی مصالحت کی گفتگو ہو رہی ہے اور مسٹر جناح گفتگو کرنے والے ہیں۔ حضرتؒ کو یہ فکر ہوئی کہ مسٹر جناح شرعی احکام سے واقف نہیں کہیں اس مصلحت میں کچھ خلاف شرع شرائط پر صلح نہ ہو جائے تو مسلمانوں کے لئے بڑی مشکل ہوگی اسلئے مسٹر جناح کے نام اس مضمون کا خط لکھا کہ محض سیاسی اور اقتصادی معاملات میں تو آپکو کچھ بتلانے کی ضرورت نہیں لیکن مذہبی امور میں آپکو ان سے مصالحت کرنے کا حق اس وقت تک نہیں ہے جب تک آپ علماء ماہرین سے مسودہ صلح دکھلا کر مشورہ نہ کرلیں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی امر خلاف شرع طے ہو جائے پھر دشواریاں پیدا ہوں اسکے جواب میں مسٹر جناح صاحبؒ کا خط انگریزی میں آیا جسکا ترجمہ یہ ہے۔

خط قائداعظم :۔ مجھ کو مولانا مظہرالدین نیز نواب زادہ لیاقت علی صاحب سے گفتگو کرنے کا موقع ملا اور میں بہت زیادہ خوش ہوا یہ معلوم کرکے کہ آپکو آل انڈیا مسلم لیگ کے مقصد اور پروگرام سے پوری ہمدردی ہے۔ مجھ کو آپ کا خط ملا لیکن موجودہ متعدد مشاغل اور عدم حاضری بمبئی کے سبب آپؒ کو جواب اس سے قبل نہ دے سکا۔ چند نکات جو میرے سامنے پیش کیۓ گئے میں نے انکو بغور تحریر کرلیا ہے اور آپکو یقین دلاتا ہوں کہ میں انکے متعلق آپ سے ضرور مشورہ کرونگا جب وقت آوے گا۔ آپ کی مہربانی کا شکریہ

گرامی نامہ حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
بنام قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم

مکرم و محترم دام کرمہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الطاف نامہ نے مسرور و ممنون
اور نہایت درجہ مطمئن فرمایا۔ دل سے دعا کی کہ اللہ تعالے آپ کو دین اسلام
کی قوت کا ذریعہ بنا دے۔ میں بکثرت دعا میں مشغول رہتا ہوں۔ اللہ تعالے
قبول فرما دیں۔ واقعی آپ نے جیسا تحریر فرمایا ہے آپ کے بہت مشاغل
ہیں اور نہایت اہم ہیں۔ میں ایک منٹ کو بھی گوارا نہیں
کرتا کہ ان میں کسی درجہ کا بھی حرج ہو۔ اس بنا پر میں بلا کسی
تکلف کے عرض کرتا ہوں کہ میری معروضات کے جواب دینے کا اہتمام
نہ فرمایا جاوے۔ میں منتظر نہ رہوں گا۔ صرف اسکی اجازت عطا فرما دیجیئے
کہ جس وقت کوئی مفید بات میرے ذہن میں آوے تو اسکو عرض کر دیا
کروں اور وہ آپ کے پیش نظر رہے۔ البتہ اگر میری کسی تحقیق کو کسی خدمت
یا مشورہ کی غرض سے کوئی استفسار یا استدعا آپ کے ذہن عالی میں آجاوے
تو آپ کے الطاف نامہ آنے کو فخر سمجھوں گا۔ والسلام

اشرف علی عفی عنہ
از تھانہ بھون ضلع مظفر نگر
۱۱ ربیع الثانی ۵۸ھ

جاری کردہ:۔ مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان۔ لاہور

حاصل کردہ از نیشنل آرکائیوز آف پاکستان، اسلام آباد

گرامی نامہ حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

بنام قائداعظم محمد علی جناح مرحوم

مکرم و محترم و ام مجدہم السلام علیکم رحمتہ اللہ۔ الطاف نامہ نے مسرور و ممنون اور غایت درجہ مطمئن فرمایا۔ دل سے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ نے آپکو دین اسلام کی قوت کا ذریعہ بنا دیں میں بکثرت دعا میں مشغول رہتاہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرما دیں=۔ واقعی آپ نے جیسا تحریر فرمایا ہے آپ کے بہت مشاغل ہیں اور نہایت اہم ہیں۔ میں ایک منٹ کے لئے بھی گوارا نہیں کرتا اور ان میں کسی درجہ کا بھی ہرج ہو۔ اس بناء پر میں بلاکسی تکلف کے عرض کرتا ہوں کہ میری معروضات کے جواب دینے کا اہتمام نہ فرمایا جاوے۔ میں انتظار نہ کرونگا۔ صرف اسکی اجازت عطا فرما دینا کافی ہے کہ کسی وقت کوئی مفید بات میرے ذہن میں آوئے تو اسکو عرض کر دیا کروں اور وہ آپ کے پیش نظر رہے البتہ اگر میرے لائق کوئی خدمت یا مشورہ کی غرض سے کوئی استفسار ابتداء" ہی ذہن عالی میں آجاوے تو آپ کے الطاف نامہ آنے کو فخر سمجھونگا والسلام

اشرف علی تھانوی"

وجہ تالیف

بعد الحمد و الصلوٰۃ

حضرت مولانا صوفی عبدالحمید صاحب سواتی مہتمم مدرسہ عربیہ نصرت العلوم گوجرانوالہ نے ایک کتاب تالیف فرمائی ہے جس کا نام ہے "مولانا عبیداللہ سندھی کے علوم و افکار" اس کتاب میں حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی اور ان کے مریدین مر متعبین کو زبردست تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ حالانکہ کتاب کا اصل موضوع یہ نہ ہے۔ اس پر حضرت مولانا جسٹس مفتی محمد تقی صاحب عثمانی نے سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے۔

"کتاب کے فاضل مولف نے اصل موضوع سے ہٹ کر ان اکابر علماء کا نام لیکر جنہوں نے قیام پاکستان کی تحریک میں حصہ لیا تھا۔ ان کے بارے میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ (معاذاللہ) مداہنت، بزدلی اور حماقت کے مرتکب ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان کا تذکرہ انہوں نے اس طرح فرمایا ہے۔

1۔ "مولانا تھانویؒ کے مریدین و متبعین علماء کرام میں بہت سے اچھے لوگ تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، قاری محمد طیب صاحبؒ، مفتی محمد شفیعؒ، مولوی ظفر احمد عثمانیؒ، مولانا اطہر علی بنگالیؒ، استاذ العلماء مولانا خیر محمد جالندھریؒ، صوفی کامل حضرت مولانا محمد حسن امرتسریؒ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور اس طرح کے بے شمار علماء کرام نہایت اچھے لوگ تھے اور اپنی ہمت و طاقت کے مطابق دین و مذہب کی خدمت کرتے رہے۔ دینی تعلیم اور تصنیف، ارشاد و بیعت وغیرہ کے ذریعے یقیناً ان لوگوں نے بے بہا خدمات انجام دی ہیں، لیکن پولٹیکل معاملات میں یہ لوگ بالکل صفر تھے اور انگریز جیسی چالاک ڈپلومیٹک اور ظالم حکومت سے ٹکر لینا ان لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی اور نہ یہ لوگ قید و بند، جیل خانوں کی سختیاں برداشت کرنے کی ہمت و طاقت رکھتے تھے...... سیاسی معاملات کی پیچیدگیوں سے بے خبر یہ نیک لوگ مسلم لیگ جیسی جماعت کے جھانسے میں آگئے۔"

دراصل فاضل مولف سے سیاسی بصیرت کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لئے ان اکابر

علماء کو چاہئے تھا کہ ’’مسلم لیگ‘‘ کے بجائے ’’کانگریس‘‘ کے جھانسے میں آتے اور جیل خانوں کی سختیاں خود برداشت کر کے اکھنڈ بھارت کو تحفہ گاندھی، نہرو اور پٹیل کی خدمت مبارک میں نذر کر دیتے لیکن ان حضرات نے ایسا نہیں کیا اور یہی ان کی وہ غلطی ہے جس کی بنا پر ’’پولٹیکل معاملات‘‘ کے یہ فاضل ممتحن صفر نمبر دینے پر مجبور ہوئے اور آگے چل کر انہی اکابر علماء کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ

’’غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کیلئے نہ ان حضرات کی کوئی تعلیم و تربیت تھی اور نہ ہمت و طاقت اور نہ مصائب کو انگیخت کرنے کی جرات۔ غلامی ایک ایسی ملعون بیماری ہے آپ جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم جب فرعون کی غلامی سے آزاد ہوئی تو وہ کتنی پست ہمت تھی۔ اللہ کے نبیؑ کی بات پر بھی کان نہیں دھرتے تھے اور انا ھھنا قاعدون سے لب کشائی کرتے تھے۔ جب تک ان سے اس غلامی کے دور کی پست ہمتی، سستی کاہلی اور کام چوری کی عادت دور نہ ہوتی، اس وقت تک وہ جہاد میں شریک نہ ہو سکے۔‘‘ (صفحہ 129)

دراصل ’’غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کیلئے ان حضرات کی کوئی تعلیم و تربیت‘‘ اس لئے نہیں تھی کہ جن اکابر علماء کا فاضل مولف نے نام لیا ہے ان کی تعلیم و تربیت دارالعلوم دیوبند کے ماحول میں حضرت شیخ الہندؒ، حضرت علامہ نور شاہ صاحب کشمیریؒ اور حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ جیسے حضرات کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ یہ تربیت تو ان حضرات میں جرات و عزیمت پیدا کرنے میں ناکام رہی، اب جو تربیت اس کام کے لئے ناگزیر تھی اسی کتاب کے صفحہ 255 پر فاضل مولف نے ایسی تربیت کا اصل ماخذ و منبع بیان فرمادیا ہے، ارشاد ہے کہ:۔

> ’’انگریز کے خلاف بھی جدوجہد میں مسٹر گاندھی کا جذبہ بہت قومی تھا۔ الغرض کہ مسلم غیر مسلم سب ہی گاندھی کو اپنا لیڈر مانتے تھے۔‘‘ (ص255)

اب ظاہر ہے کہ یہ اکابر علماء مسٹر گاندھی کی ’’صحبت بابرکت‘‘ اور ان کی تربیت و رہنمائی سے محروم ہے جس نے ’’مسٹر گاندھی‘‘ کی صحبت میں رہ کر غلامی کی زنجیریں توڑنے کی تربیت حاصل نہ کی ہو، اس میں آزادی کا سلیقہ کیسے آئے؟ اور جن لوگوں نے اس مسلم لیڈر کی پکار پر لبیک نہ کہا ہو ان میں غلامی کے خلاف ہمت و طاقت کیسے پیدا ہو؟ ایسے لوگوں کی

مثال تو انہی لوگوں سے دی جاسکتی ہے جو اللہ کے نبیؐ کی بات پر کان دھرنے کے بجائے انا ھهنا قاعدون کہا کرتے تھے۔ انا لله وانا علیه راجعون۔

آزادی ہند کے طریق کار کے بارے میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان جو اختلاف رائے پیدا ہوا وہ ہر باخبر شخص کو معلوم ہے۔ اس مسئلے میں اکابر علماء کی رائیں بھی مختلف تھیں۔ اور ہر ایک نے مسلمان کے حق میں جس راستے کو اپنے نزدیک بہتر سمجھا اسے اختیار کیا۔ دونوں طرف کے اکابر علماء نے اس اختلاف کو ہمیشہ شرافت و متانت کی حدود میں رکھا اور ایک دوسرے کی تذلیل و تحقیر سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ حضرت تھانویؒ' حضرت علامہ عثمانیؒ اور حضرت مدنی قدس سرہٗ ہم نے اس میں اعتدال اور حد شناسی کی جو مثالیں قائم کی ہیں وہ ہماری تاریخ کا درخشاں باب ہیں۔

حضرت مدنی قدس سرہٗ کی رائے اگرچہ تقسیم ہند کے حق میں نہ تھی' لیکن پاکستان بننے کے بعد ان کا یہ فقرہ مشہور و معروف ہے کہ مسجد بننے سے پہلے یہ اختلاف کیا جاسکتا ہے کہ اس جگہ مسجد بنائی جائے یا نہیں؟ لیکن جب مسجد بن جائے تو اس کا تحفظ واحترام ہر مسلمان کا فرض ہے۔ لہٰذا پاکستان بننے کے بعد مسلمانوں کو اس کے تحفظ کی کوشش کرنی چاہئے۔

خود فاضل مولف نے زیر تبصرہ کتاب میں لکھا ہے کہ:۔

> "جب محمد علی جناح یعنی قائداعظم کی وفات ہوئی تھی تو مولانا مدنیؒ نے ان کی ہمشیرہ محترمہ مس فاطمہ جناح اور مسٹر لیاقت علی خان کے نام تار دیا تھا اور مرحوم قائداعظم کی تعزیت کی تھی اور حضرت مدنیؒ نے یہ کہا تھا کہ مجھے مسٹر محمد علی جناح کے فوت ہونے پر بڑا افسوس ہے اور میں ان کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی بخشش اور مغفرت فرمائے۔"
>
> (ص248)

واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے اختلافات میں بڑوں کا طرز عمل یہی ہوتا ہے اور یہ بات صرف حضرت مدنیؒ ہی کی حد تک محدود نہیں' حضرتؒ کے بیشتر متولین اور متبعین جنہوں نے حضرتؒ کی صرف سیاست ہی میں نہیں بلکہ حضرتؒ کے تدین و تقویٰ' للّٰہیت اور اخلاق فاضلہ میں بھی حضرتؒ کا اتباع کیا ہے' ان کا حال بھی یہی ہے کہ سیاسی اختلافات کے باوجود وہ دوسری جانب کے اکابر علماء کی توقیر و تعظیم میں کبھی کمی نہیں کرتے اور ان کے حق میں کوئی

ثقیل لفظ برداشت نہیں کرتے اور الحمد اللہ یہی حال دوسری جانب بھی ہے۔

اول تو جس اختلاف کا باب چالیس سال پہلے بند ہو چکا اسے از سر نو زندہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اور اگر تاریخ کا ریکارڈ درست رکھنے کیلئے اس کا تذکرہ ضروری ہو تو فریقین کا موقف علمی دلائل کے ساتھ آسانی سے بیان کیا جاسکتا ہے' دوسرے کے موقف پر تنقید بھی کی جاسکتی ہے لیکن ان نفوس قدسیہ کی شخصی تحقیر و تنقیص کا کسی جانب کوئی جواز نہیں (ماہنامہ "الحسن" لاہور ماہ اکتوبر 1991ء)

ان نفوس قدسیہ کے متعلق برملا یہ کہا جاسکتا ہے

تر دامنی پہ ہماری نہ جائیو اے میر
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

کتاب مذکورہ میں انہی نفوس قدسیہ کی سیاسی خدمات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ اعتراض ختم ہو جائے گا کہ "پولٹیکل معاملات میں یہ لوگ بالکل صفر تھے اور انگریز جیسی چالاک ڈپلومیٹک اور ظالم حکومت سے ٹکر لینا ان لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی۔"

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ اور ان کی سیاسی خدمات

اکابرین دیوبند میں جن بزرگوں نے تحریک پاکستان اور مسلم لیگ کی حمایت میں سب سے طاقتور آواز بلند کی وہ حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانوی کی آواز تھی۔ حضرت مولانا کا طبعی میلان یکسوئی کے ساتھ تصنیف و تالیف، تعلیم و تربیت، اصلاح امت اور ہدایت خلق کی طرف تھا۔ اس لئے عملی طور پر سیاسی اور ملکی تحریکوں میں براہ راست حصہ نہ لیا اور نہ ہی آپ کسی سیاسی جماعت میں منسلک ہوئے۔ البتہ جب کبھی ملک میں کوئی سیاسی تحریک شروع ہوئی اس کے بارے میں ایک ماہر شریعت عالم دین ہونے کی حیثیت سے اس کی شرعی حیثیت پر فقیہانہ نظر بصیرت ڈال کر نتائج واضح کرنے اور ملت کی علمی اور دینی راہنمائی کا فریضہ ادا کرنے میں کبھی بھی دریغ نہ فرمایا۔ آج یہ بحث چل نکلی ہے کہ حضرت مولانا تھانوی اور ان کے مریدین متبعین علماء کرام پولیٹیکل معاملات میں بالکل صفر تھے اور سیاسی معاملات کی پیچیدگیوں سے بھی بے خبر تھے۔ حالانکہ حقیقت میں بالکل ایسی بات نہ تھی۔ یہاں ہم حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہ کی سیاسی خدمات کا جائزہ لیں گے۔ لیکن پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ سیاست کس کو کہتے ہیں؟ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں۔

سیاست کی قسمیں اور علماء کا منصب

سیاست کے دو حصے

سیاست کے دو حصے ہیں ایک سیاست کے شرعی احکام یہ بے شک شریعت کا جز ہے اور کوئی عالم اس سے ناواقف نہیں۔ چنانچہ ابواب فقیہہ میں کتاب السیر کا ایک مستقل جز ہے۔ جس کی درس تدریس کا پابندی سے اہتمام ہے۔

دوسرا حصہ سیاست کا تجرباتی تدبیریں ہیں جو ہر زمانہ میں حالات و واقعات اور آلات

وغیرہ کی تبدیلی سے بدلتی رہتی ہیں۔ اور یہ حصہ شریعت کا جز نہیں اور علماء کا اس میں ماہر ہونا ضروری نہیں۔ اس کی مہارت کے دوسرے ذرائع ہیں جن کا حاصل تجربہ اور خاص مناسبت (کا ہونا) ہے۔

لیکن اوپر جو عرض کیا گیا کہ سیاست کا یہ حصہ یعنی تجرباتی تدبیریں شریعت کا جز نہیں' اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حصہ شریعت کے علماء کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں...... کیونکہ کوئی واقعہ اور کوئی عمل اور کوئی تجویز ورائے دنیا میں ایسی نہیں جس کے جواز میں شریعت سے تحقیق کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ گو وہ شریعت کا جز نہ ہو (لیکن) جز نہ ہونے سے تابع نہ ہونا لازم نہیں آتا۔

(البدائع ص24)

سیاست میں کودنا علماء کا منصب نہیں

اگر تم یہ چاہو کہ (علماء) اس سے آگے بڑھ کر سیاست میں عملی طور پر بھی حصہ لیں اور تمہارے سیاسی جلسوں اور مظاہروں میں شریک ہوا کریں تو یہ کام ان کا نہیں' اور نہ تم کو انہیں مجبور کرنے کا حق ہے۔ تم نے علماء کو سمجھا کیا ہے۔ علماء جس کام کو کر رہے ہیں وہ اس قدر اہم وضروری ہے کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ جس بستی میں ایک عالم ہو اور جہاد شروع ہو جائے تو اس عالم کو میدان جہاد میں جانا جائز نہیں۔ کیونکہ علماء اگر مر جائیں گے تو علم دین کو کون سنبھالے گا۔ اسی لئے ہمارے حاجی صاحب علماء کو ہجرت کرنے سے منع کرتے تھے۔ اب لوگ اس کو تو دیکھتے نہیں کہ علماء کو سیاست میں پڑنے سے خود فقہا اسلام نے منع کیا ہے۔ بس ان کو تو الزام دینے سے کام ہے۔ مسلمانوں پر جو بھی مصیبت آئے اس کا الزام سب سے پہلے علماء پر ہے۔

جو کام علماء کا ہے وہ کریں...... علماء سے مسائل پوچھو۔ دنیا کے حاصل ہونے کی (اور سیاسی) تدبیریں انہیں کیا معلوم۔

جب حضور ﷺ جیسے علوم اولین و آخرین کے جاننے والے کے لئے فن باغبانی کے مسئلہ تابیر...... سے واقف ہونا لازم نہیں تو معلوم ہو گیا کہ یہ کوئی نقص نہیں۔ پھر غضب ہے کہ نبی کا فنون سے واقف نہ ہونا کوئی نقص نہ ہو اور ایک مولوی بیچارہ اگر فن سیاست نہ جانتا ہو تو اس کا یہ نقص (عیب) سمجھا جائے اور اس کو ملامت کا نشانہ بنایا جائے۔

(الافاضات الیومیہ ص74ج10)

نبی کے لئے بھی سیاست میں حصہ لیناضروری نہیں

الم ترالی الملاء من بنی اسرائیل اذا قالو النبی لھم بعث لنا ملکا نقاتل فی سبیل الله

ترجمہ:۔ کیا تجھ کو بنی اسرائیل کی جماعت کا قصہ جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا ہے تحقیق نہیں ہوا۔ جب کہ ان لوگوں نے اپنے پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کردیجئے کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال کریں۔ (بیان القرآن)

ان آیتوں سے اثبات مدعی (دعویٰ کے ثابت کرنے) کی تقریر یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے باوجود ان میں ایک نبی کے موجود ہونے کے ان نبی سے یہ نہیں کہا کہ آپ ہمارے (سیاسی) قائد بنئے بلکہ اس مقصد کیلئے بادشاہ مقرر کرنے کی درخواست کی۔ سو اگر نبی کافی سمجھے جاتے اور نبی کا سیاسی قائد ہونا ضروری ہوتا تو ایسی درخواست کیوں کی جاتی۔ اور اگر یہ شبہ ہو کہ یہ نبی اسرائیل کی غلطی تھی کہ اس غلطی پر ان کے نبی نے تنبیہ کیوں نہیں فرمائی کہ میں کافی ہوں' بلکہ بادشاہ مقرر کرنے کا انتظام شروع فرمادیا۔ تنبیہ کیوں نہیں فرمائی۔ بلکہ اس درخواست کو بلا نکیر قبول فرمالیا۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ ہر نبی کے لئے بھی سیاست میں تجربہ و مناسبت لوازم میں سے نہیں۔ چہ جائے کہ علماء و مشائخ کیلئے لازم ہو بلکہ مفسرین کی نقل سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے لئے اللہ کی سنت یہی رہی کہ وہاں کے سیاسی معاملات بادشاہوں سے متعلق ہوتے تھے اور بادشاہ انبیاء کے حکم اور مشورہ کے مطابق چلتے تھے۔ چنانچہ تفسیر مظہری نے بھی ابعث لنا ملکا کے تحت یہی لکھا ہے۔ (البدائع صہ 25)

حضور علیہ وسلم صلی اللہ کی دو شانیں' شان نبوت' شان سلطنت

حضور علیہ صلی اللہ کی دو شانیں تھیں۔ شان نبوت اور شان سلطنت۔ اس کے بعد خلفاء راشدین بھی دونوں کے جامع تھے' مگر اب یہ دونوں شانیں دو گروہ پر تقسیم ہو گئیں۔ شان نبوت کے مظہر علماء ہیں اور شان سلطنت کے مظہر سلاطین اسلام۔ اب اگر یہ سلاطین (بادشاہ) علماء سے استغناء (بے پروائی) کرتے ہیں تو حضور علیہ صلی اللہ کی ایک شان سے اعراض لازم آتا ہے اور اگر علماء سلاطین کی مخالفت کرتے ہیں تو اس سے بھی حضورؐ علیہ صلی اللہ کی ایک شان سے اعراض لازم آتا ہے۔

اب دونوں کے جمع کرنے کی صورت یہ ہے کہ سلاطین (بادشاہوں) سے تو میں کہتا ہوں کہ وہ اپنے حدود (قوانین) میں کوئی حکم اس وقت تک نافذ نہ کریں جب تک اہل حق علماء سے استفادہ نہ کرلیں اور علماء سے یہ کہتا ہوں کہ وہ نفاذ کے بعد اس پر کاربند ہوں (یعنی عمل کریں اور تائید کریں۔)

اگر حضور ﷺ کی یہ دو شانیں اس طرح جمع ہو جائیں تو مسلمانوں کی فلاح و بہبودی کی صورت نکل آئے اور ان کی ڈوبتی ہوئی کشتی ساحل پر آلگے ورنہ اللہ ہی حافظ ہے۔

(ملفوظات صفحہ نمبر 221، اصلاح المسلمین صہ 516)

کام کی تقسیم اور کامیابی کا طریقہ

سب کو مل کر کام کرنے کا یہ مطلب ہے کہ ...... تجربہ کا کام تو لیڈر کریں کہ وہ کسی کام کے کرنے سے پہلے علماء سے جائز ناجائز معلوم کرلیں اور احکام بتلانے کا کام علماء کریں۔ اس طرح ہر شخص اپنے فرض منصبی کو انجام دے۔ اس صورت میں کامیابی کی امید نکل سکتی ہے کہ ہم اپنا کام کریں وہ اپنا کام کریں۔

سب کے مل کر کام کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ سب ایک کام میں لگ جائیں یا ایک کا کام دوسرا کرنے لگے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک مکان تیار کیا جارہا ہے اس کی تیاری کے لئے معمار (کاریگر) کی بھی ضرورت ہے۔ بڑھئی کی بھی ضرورت ہے، مزدور کی بھی ضرورت ہے۔ اب یہ بتلاؤ کہ سب مل کر جو تعمیر کا کام کر رہے ہیں۔ اس کا کیا طریقہ ہے۔ یہی کہو گے کہ کاریگر اینٹ لگائے۔ مزدور گارا پہنچائے، اینٹ پہنچائے، بڑھئی آرا چلائے جب یہ سمجھ میں آگیا۔ اب میں پوچھتا ہوں اگر یہ سب مل کر اینٹ ہی لگانے لگیں یا سب کے سب آرا ہی چلانے لگیں، یا سب کے سب گارا ہی پکڑانے لگیں تو کیا مکان تیار ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ اسی طرح یہاں خیال کرلو کہ سب کو ملکر کام کرنے کے یہ معنی ہیں کہ تجربہ کا کام تو لیڈر کریں اور احکام بتلانے کا کام علماء کریں۔ ہر قوم کیلئے تقسیم خدمات ضروری ہے اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔

تمام اہل تمدن اس کی ضرورت پر متفق ہیں۔ چنانچہ جنگ میں فوج جاتی ہے۔ فوجی افسر جاتے ہیں۔ منشی، محرر، کلکٹر اور جج وغیرہ نہیں جاتے پھر نہ معلوم مولویوں کے ذمہ سارا کام کیوں رکھا جاتا ہے کہ وہ تفسیر و حدیث و فقہ کا علم بھی حاصل کریں، فتویٰ بھی دیں، وعظ بھی

کہیں، درس و تدریس بھی کریں، مدرسے بھی قائم کریں اور لیڈروں کے ساتھ جھنڈا لیکر سیاست میں بھی شریک ہوں۔

(الافاضات الیومیہ ص13 ج1) التبلیغ ص15 الحدود والقیود)

لیڈروں کی ذمہ داری

لیڈروں (اور مسلم نیتاؤں) پر لازم ہے کہ جو کچھ قومی ترقی کے طریقے سوچیں ان کو پہلے علماء کے سامنے پیش کر کے شرعی فتویٰ حاصل کر لیا کریں کہ یہ جائز ہے یا نا جائز۔ (یہ مناسب ہے یا نہیں) جب علماء فتویٰ دے دیں اس کے بعد ان سیاسی تدبیروں پر عمل کیا جائے۔

تقسیم خدمات بہت ضروری ہے، قومی ترقی کے اسباب اور ذرائع تو لیڈروں کو سوچنا چاہئے اور ہر تدبیر کے جواز و عدم جواز کو اپنی رائے سے طے نہ کریں بلکہ علماء سے استفتاء کر لیا کریں، ورنہ محض ترجمہ پڑھنے سے قرآن (حدیث) حل نہیں ہو سکتا۔

(خلاصہ یہ کہ) لیڈر علماء سے پوچھ کر کام کریں (یعنی) تجربہ کا کام لیڈر کریں اور کام کرنے سے قبل علماء سے جائز و نا جائز معلوم کر لیا کریں۔

التبلیغ الحدود والقیود الافاضات صہ 14/1)

نام نہاد لیڈروں کی بحالی

آج کل کے لیڈر اکثر عقل سے کورے ہیں۔ جب عقل صحیح نہیں پھر ایسی عقل میں اسلامی احکام کیسے آئیں...... پھر نماز نہیں، روزہ نہیں، زہد نہیں، تقویٰ نہیں، ان اعمال سے بھی عقل میں نور پیدا ہوتا ہے...... پھر دعویٰ بھی ہے کہ ہم قوم کی کشتی کے ناخدا ہیں۔

ایسے (لیڈروں) کی بدولت مسلمانوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ ہر روز ایک نیا لباس بدل کر پلیٹ فارموں پر آ کھڑے ہوئے ہیں۔ (ملفوظات صفحہ اصلاح المسلمین صہ 527)

اگر کہا جاتا ہے کہ تم خود عمل کر کے دکھلاؤ پہلے اپنی اصلاح کرو کیونکہ تمہارا نہ ظاہر ٹھیک ہے نہ باطن، نہ صورت، نہ سیرت اور مسلمانوں کے رہبر اور مقتدر بنتے ہو؟ تو جواب میں کہتے ہیں کہ آپ ذاتیات پر حملہ کرتے ہیں۔ ارے بھلے مانسو تم اللہ اور رسول ﷺ کے احکام پر حملہ کرو، احکام الٰہیہ کے بجائے اپنے دماغ سے ہوئی باتوں پر عمل کرنے کیلئے دنیا (کے مسلمانوں) کو مجبور کرو۔ اسلامی احکام کی پامالی کرو۔ مگر دوسرا تمہارا کسی حالت پر بھی

نوٹس نہ لے، ایسی حالت میں تمہیں ہی دوسروں کو کہنے کا کیا حق ہے؟ دوسرا تمہاری کیوں ماننے لگے۔ وہ بھی یہی کہہ کر الگ ہو جائے گا کہ میری ذاتیات سے آپ کو کیا بحث، چلو چھٹی ہوئی۔ آدمی کچھ تو عقل سے کام لے۔

(ایسے لوگوں) کی بڑی دوڑ یہ ہوتی ہے کہ کوئی جلسہ (ہنگامہ) کر لیا، دو چار ریزرویشن پاس کرالئے۔ (ایسے ہی لوگ) دین کے پکے دشمن ہیں۔ دوستی کے پردہ میں دشمنی کر رہے ہیں۔ احکام اسلام کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں...... ہاتھ دھو کر اسلام کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں...... اور قوم کے خیر خواہ، رہبر، مقتدا بنے ہوئے ہیں۔ اسلام کو غیروں سے شکایت نہیں اس کو تو مسلمانوں ہی سے شکایت ہے۔

طلبہ مدارس کی سیاست میں شرکت

سخت افسوس ہے کہ بعض لوگوں کی یہ حالت ہے کہ علم دین میں مشغول ہونے کو فضول اور بے کار سمجھتے ہیں نہ معلوم یہ سبق کہاں سے حاصل کیا ہے۔ یورپ میں بھی تو یہ طریقہ نہیں، وہاں بھی بعض اوقات اس قسم کی (سیاسی) تحریکات ہوتی ہیں مگر جو جماعت علم حاصل کرنے میں مشغول ہے اس کو ان تحریکات میں شرکت کی اجازت نہیں دی جاتی۔

(الافاضات ص13 ج1)

میری رائے ہے کہ کسی تحریک میں بھی طالب علم کو شرکت کی اجازت نہ ہونا چاہئے۔ آئندہ کے لئے اس میں سخت نقصان ہے جو اس وقت محسوس نہیں ہوتی۔ آخر میں پوچھتا ہوں کہ جب پڑھنے پڑھانے میں کوئی مشغول نہ رہے گا۔ تو پھر کام کرنے والی علماء کی جماعت کہاں سے پیدا ہو گی...... جو کرتا ہے تم ہی کرو۔ طلبہ کو تو اپنے کام میں لگا رہنے دو تاکہ آئندہ دین کے احکام بتلانیوالی جماعت کا سلسلہ جاری رہے۔ کیا یہ خیال ہے کہ آئندہ دین کی ضرورت ہی نہیں رہے گی جیسا کہ کہتے ہیں کہ مسائل کا وقت نہیں کام کا وقت ہے...... میں کہتا ہوں اگر دین نہ رہا اور احکام اسلام کو پامال کرنے کے بعد کوئی کام بھی کیا تو وہ کام پھر دین کا نہ ہو گا۔

طلبہ کو اس قسم کی کمیٹیوں اور جلسوں میں شرکت کی اجازت ہرگز نہیں دینا چاہئے۔ کیا ان کاموں کے لئے طلبہ ہی رہ گئے ہیں اور مسلمان کچھ کم ہیں ان سے کام لو۔

(الافاضات الیومیہ ص99 ج1، ص121ج)

دینی مدارس میں سیاست کی تعلیم

فرمایا جب حضور علیہ صلی اللہ جیسے علوم اولین کے جاننے والے کے لئے فن باغبانی کا مسئلہ تابیر سے واقف ہونا لازم نہیں (جیسا کہ مشکوۃ شریف کی روایت میں آیا ہے) تو معلوم ہو گیا کہ یہ کوئی نقص (اور عیب) نہیں۔ پھر غضب ہے کہ نبی کا تو فنون سے واقف نہ ہونا کوئی نقص (عیب) نہ ہو اور ایک مولوی بیچارہ اگر فن سیاست نہ جانتا ہو تو اس کا یہ نقص سمجھا جائے اور اس کو ملامت کا نشانہ نہ بنایا جائے۔

تو تعلیم یافتوں کی کیا شکایت آج کل کے مولوی خود پھسل گئے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے میرے سامنے خود یہ تجویز پیش کی کہ علماء کو ماہر سیاست ہونا چاہیے۔ ان کو مصر پہنچایا جائے۔ بیرت بھیجا جائے تاکہ وہاں کے ماہرین سیاست سے وہ سیاست سیکھ کر آئیں اور یہاں کے مدارس دینیہ میں طلبہ کو سیاست کا باقاعدہ نصاب تجویز کر کے سیاس کا درس دیا کیں۔

میں نے کہا کہ اس کے بجائے کہ یہاں سے علماء سیاست سیکھنے کے لئے بھیجے جائیں' وہاں سے ماہرین سیاست کو تنخواہ دیکر بلایا جائے اور وہ علماء کے سامنے اپنے سیاسی اصول کو پیش کر کے ان کے متعلق احکام شریعہ پوچھیں اور علماء انہیں سیاسی جزئیات کے متعلق شرعی احکامات بتلائیں اس طرح ماہرین سیاست تو ماہر شریعت ہو جائیں اور ماہرین شریعت ماہر سیاست ہو جائیں...... بس اس وقت تو ہاں ہاں کرتے رہے پھر وہی خبط۔

(الافاضات الیومیہ ص74ج10)

مروجہ سیاست میں علماء کے شریک نہ ہونے کی ایک وجہ

ہندوستان میں موجودہ سیاست کا حاصل یہ ہے کہ گورنمنٹ کے قانون کے ماتحت رہ کر اپنے حقوق کی حفاظت کی جائے...... لہٰذا موجودہ سیاست کیلئے ضروری ہوا کہ گورنمنٹ کے تمام قوانین پر بھی عبور ہو اور انگریزی (یعنی حکام) کی طبیعت اور مزاج سے بھی پوری واقفیت ہو اور یہ بات پیدا ہوتی ہے ان میں گھل مل کر رہنے سے اور ظاہر ہے کہ علماء ان سب باتوں سے ناواقف ہیں۔ تو یہ اگر سیاست میں بحثیت لیڈر کام کریں گے تو ان کا ناواقفی کے سبب مسلمانوں کو بجائے نفع کے نقصان پہنچے گا۔ پھر تجربہ شاہد ہے کہ عام سیاسی لیڈر ملکی مصلحتوں کو دین پر مقدم رکھتے ہیں اور جب مصلحت و مذہب میں تعارض ہوتا ہے تو مذہب میں بعید تاویل کرنے میں دریغ نہیں کرتے علماء بھی اس میں مبتلا ہو رہے ہیں اور ان کی

تاویل چوں کہ بے رنگ دین ہوتی ہے اس لئے وہ عام مسلمانوں کو زیادہ غلطی میں مبتلا کرتی ہے۔
(البدائع بدیعہ نمبر10 ص27)

علماء کو سیاست میں حصہ لینا کب ضروری ہے؟

اگر کسی وقت کوئی سیاسی جماعت ایسی نہ ہو جو کہ علماء سے احکام پوچھ پوچھ کر عمل کیا کرے جیسا کہ اس وقت غالب ہے تو اس وقت علماء ایسی جماعت کے پیدا ہونے کے منتظر نہ رہیں ورنہ محبان دنیا (مفاد پرست لیڈر) دینی مقاصد کو (اور امت کو) تباہ کردیں گے۔ بلکہ وہ خود اپنے میں سے ایسی جماعت بنائیں جو علم و عمل دونوں میں سیاست و شریعت کی جامع ہوں۔ مگر یہ حکم سیاست مدینہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ سیاست بدینہ یعنی طب بلکہ اسباب معاش میں سے جتنے فرض کفایہ ہیں مثلاً تجارت' زراعت سب کا یہی حکم ہوگا۔

اور ان سب مفاسد کی اصلاح کیلئے جماعت کا انتظام کرنا ہر حال میں استطاعت کے ساتھ مشروط ہوگا۔ یہ ایک کلی تحقیق ہے۔
(البدائع صہ 24' افادات' اشرفیہ صہ 95)

علماء کی سیاسی جماعت کا طریقہ کار

اس وقت طریقہ کار یہ مفید ہو سکتا ہے کہ سیاسی جماعت علیحدہ ہو اور مذہبی علیحدہ اور مذہبی جماعت اپنا اصلی کام تبلیغ کا اس طرح انجام دے کہ مسلمانوں کی سیاست جماعت کی نگرانی کرے کہ یہ سیاسی جماعت مسلمانوں کے حقوق گورنمنٹ سے مطالبہ کرتے وقت شریعت کے خلاف عمل نہ کر بیٹھے اور چونکہ موجودہ زمانہ میں سیاسی جماعت مذہبی جماعت سے پوچھ کر عمل کرنے کی عادی نہیں رہی' اس لئے علماء کے ذمہ ہے کہ خود اس جماعت کے پاس پہنچیں اور احسن طریقہ سے تبلیغ کریں۔

اگر علماء اپنا اصلی کام تبلیغ رکھتے تو عظمت و وقار میں چار چاند لگ جاتے۔ اگر علماء حضرات تبلیغ فرما کر لیڈروں کو سنبھالتے اور ان کو مفید مشورے اور طریقہ کار سے رہنمائی کرتے تو اس طرز میں شرعی طریقہ پر مسلمانوں کے حقوق (ان کے جان و مال) کی حفاظت بھی ہوتی اور علماء کی عظمت بھی بڑھتی۔ (البدائع صہ 28)

سیاست میں کفار مشرکین سے مدد لینے اور ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کا شرعی حکم

فی شرح الیسر الکبیر باب السثانه باھل الشرك واستعانه المشرکین بالمسلمین...... ولا بلس بان یستعین المسلمون باھل الشرك علی اھل الشرك اذاکان الاسلام ہوا الظاہر

اس روایت کا حاصل یہ کہ کفار کے ساتھ ایسے معاملات میں (یعنی سیاسی امور میں کفار...... کے ساتھ) شرکت کی شرط یہ ہے کہ وہ ہمارے تابع ہوں اور اگر وہ ہمارے تابع نہ ہوں تو ان کے ساتھ شرکت جائز نہیں۔ جس کی وجہ سے اسی روایت میں مذکور ہے کہ جب انہیں بھی مستقل قوت حاصل ہے تو شرکت میں اندیشہ ہے کہ جب مجموعی قوت سے ان کا مقابل مغلوب ہو جائے پھر وہ اپنی قوت سے مسلمانوں کو مغلوب کر سکتے ہیں۔

اور اگر کہیں اس شرط کے خلاف ہوا ہے جیسے ایک غنیم کے مقابلہ میں نجاشی کی مدد حضرات صحابہ نے لی تو اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ نجاشی اس وقت مسلمان ہو گئے تھے یا یہ وجہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت میں کسی پناہ کی حاجت تھی اور نجاشی بہ نسبت اس غنیم کے مسلمانوں کے لئے مفید تھے۔اس لئے اس موقع پر وہ شرط نہیں رہی یہ حاصل ہے روایت کا۔

(معاملۃ المسلمین صفحہ نمبر 31' اشرف الواسخ ج203/3)

شرعی قوانین کے نفاذ کے متعلق جدوجہد

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی کی خواہش تھی کہ ہندوستان میں ایک دارالسلام قائم ہو جائے تاکہ ہم شرعی عدالتیں قائم کر سکیں اور معاشرہ کو جن روزافزوں جرائم نے تباہ کرر کھا ہے اس کی اصلاح کی جا سکے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے حضرت نے ہی سب سے پہلے کوشش شروع کی۔ مسلمانوں کے سرزمین ہند پر قدم رکھنے کے فوراً بعد ہندوستان کے ساحلی علاقہ کے ہندو راجاؤں کے عہد حکومت میں مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کیلئے الگ مسلمان افسر مقرر ہوتا تھا جو اسلامی قانون کی رو سے ان پر حکم لگاتا تھا۔ جیسا کہ چوتھی صدی ہجری کا نوجوان سیاح ابن حوقل ہندوستان کے ساحلی علاقہ کے دورہ کے حالات میں لکھتا ہے کہ:

> 'ان تمام علاقوں میں مسلمان کسی حکم اور فیصلہ کو اس وقت تک تسلیم کرتے پر آمادہ نہ ہوتے تھے جب تک ان پر خود مسلمان ہی حاکم نہ ہو۔ ان پر حدود اور سزاؤں کے نفاذ کا یا ان پر شہادت اور گواہی دلانے کا حق مسلمانوں کے سوا کسی دوسرے کو نہیں ہے۔ خواہ اس علاقہ میں مسلمانوں کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو۔"

(داستان عمل ص152 ابن حوقل ص228)

حضرت تھانوی بھی اسی طرح یہاں مسلمانوں کے معاملات ان کی شریعت کے مطابق فیصلہ کرانا چاہتے تھے۔

تحریک تقرر قضاۃ

ہندوستان میں قاضیوں کے تقرر کی تحریک سب سے پہلے حضرت تھانوی نے شروع کی۔ آپ نے حضرت حافظ محمد احمد صاحب مرحوم مہتمم دارالعلوم دیوبند کی توجہ اس طرف

مبذول کرائی۔ انہوں نے حضرت کی تحریک پر مسٹر مانٹیگو سابق وزیر ہند سے اس کی ضرورت کو ظاہر فرمایا۔ بعض ممبران کو اسمبلی اور کونسل میں یہ معاملہ پیش کرنے کی ترغیب دی۔ بعض ذرائع سے سائمن کمیشن کے سامنے بھی اس کی ضرورت کو ظاہر کیا گیا۔ میرٹھ میں حضرت کے ایماء پر انجمن نصب القضاء قائم ہوئی۔ اس نے رسالہ "القول الماضی" وغیرہ شائع کر کے لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا۔ 1929ء میں بمقام دہلی اس سلسلہ میں ایک خاص جلسہ منعقد کیا گیا جس میں تمام ممبران اسمبلی اور عمائد شہر دہلی کے علاوہ حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری اور مولانا محمد علی صاحب جوہر اور ممتاز علماء دیوبند و سہارنپور تشریف لائے۔ دربار اشرفیہ کی طرف سے مولوی عبدالکریم صاحب گمتھلوی نے نمائندگی کے فرائض انجام دیئے اور ممبران اسمبلی پر پوری طرح اس مسئلہ کی اہمیت واضح کر دی گئی۔ انہوں نے بھی اس کی اہمیت وافادیت کا احساس کرتے ہوئے اس سلسلہ میں کوشش کرنے کا یقین دلایا لیکن یہ سعی کارگر ثابت نہ ہوئی۔

تقرر قاضی کی ضرورت

فرمایا۔ نصب قاضی کے بابت کونسل میں مسئلہ پیش ہو رہا ہے کہ اگر سرکار کی طرف سے قاضی کا تقرر ہو جائے تو جن مسائل کا بدون قضاء قاضی کے نفاذ نہیں ہو سکتا وہ ہونے لگے۔ مگر مسلمان اس مسئلہ میں متفق نہیں ہوتے یعنی مسلمان ممبر وہ اس کو ضروری ہی نہیں جانتے۔ ابھی ایک جماعت مشورہ کے لئے مجتمع ہوگی وہ اپنی رائے دے گی پھر معاملہ کونسل میں رکھا جائے گا۔ اگر میں معذور نہ ہوتا اور جا سکتا تو اس جماعت مشورہ میں ضرور جاتا (آنت اترنے کا عارضہ عذر تھا) کوئی مولوی صاحب نہیں جاتے۔ میں نے مولوی ظفر احمد (سلمۂ) سے کہا ہے یہ جائیں گے۔ انگریز کہتے ہیں کہ ہم کو اس کی ضرورت معلوم نہیں ہوئی ورنہ ہم اس کے واسطے تیار ہیں۔ افسوس انگریز تو تیار ہیں مگر مسلمان تیار نہیں۔ مخالف تو متفق ہیں مگر دوست مخالف۔ اس پر کوئی کہے گا کہ انگریزوں کی تعریف کرتا ہے تو اس میں تعریف کی کیا بات۔ یہ ایک واقعہ ہے میں نے تحریکات خلافت کے زمانہ میں رائے دی تھی کہ نصب قاضی کی تحریک کرو سلطان حاصل کرنے کی تحریک نہ کرو۔ مگر خبط تو یہ تھا کہ یا سلطنت لیں گے یا جان دیں گے۔ کھائیں گے گھی سے یا جائیں گے جی سے۔ بین بین کا کوئی

درجہ ہی نہیں رکھا۔ سلطنت ہی چاہتے تھے۔ بس مل گئی سلطنت۔ مسلمان اتفاق کر کے اس معاملہ کو کونسل سے منظور کرا لیتے پھر اپنا اپنا قاضی علیحدہ علیحدہ بنا لیتے سینوں کا شیعوں کا قادیانیوں کا سب کا الگ الگ قاضی مقرر ہو جاتا۔ میری تو یہاں تک رائے ہے کہ جو مسلمان آنریری مجسٹریٹ ہیں سرکار انہیں کو قاضی کے اختیار دے دیتی گو وہ اکثر جاہل ہوں گے مگر کسی عالم سے فتویٰ لیکر فیصلہ کر سکتے ہیں۔

قانونی وراثت

ایک مرتبہ حضرت کی مجلس میں ذکر آیا کہ پنجاب میں وراثت کا قانون شریعت مقدسہ کے خلاف ہے۔ بہن بیٹی وغیرہ کو میراث سے حصہ نہیں ملتا۔ وہاں کے لوگ رواج کے پابند ہیں۔ شرعی قانون وراثت کی بجائے قانون رواج عام رائج ہے اور کسی کو اس کا احساس نہیں۔ نہ اس طرف توجہ ہے۔ تو حضرت نے بڑے اہتمام سے فرمایا کہ وہاں کے مسلمانوں کو اس طرف توجہ دلانا نہایت ہی ضروری ہے۔ مولوی عبدالکریم گمتھلوی نے عرض کیا کہ حضرت علمائے کرام اگر خاص سعی فرمائیں تو ممکن ہے کہ کچھ لوگ سمجھ جائیں۔ ورنہ ایسے معاملہ میں معمولی سعی سے تو نفع کی امید نہیں۔ فرمایا جس قدر کوشش ہو سکے اس میں دریغ نہ کرنا چاہئے۔ نفع کی فکر میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ مولوی صاحب موصوف نے اپنے وطن جا کر اپنے نواح میں اِس مسئلہ کی طرف لوگوں کی توجہ دلانی شروع کی۔ امر تسر اور لاہور میں بھی اس غرض کیلئے جلسے کئے۔ مگر کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

حضرت تھانوی جب مولوی صاحب کے سسرال موضع اڑون میں تشریف لے گئے اور راجپورہ میں قیام فرمایا تو وہاں پھر یہ مسئلہ وراثت پیش ہوا۔ تو حضرت نے اس کیلئے مولوی صاحب کو پنجاب کے سفر کی پھر ترغیب دی۔ انہوں نے مصارف کلی کا عذر کیا تو آپ نے واپس جاتے ہی ابتدائی مصارف کیلئے اپنی طرف سے تیس روپے بذریعہ منی آرڈر بھیج دیئے۔ مولوی صاحب نے اس مسئلہ میں ایک سوال نامہ مرتب کر کے علماء کرام کی تائید حاصل کرنے کیلئے چالیس پچاس جگہ مشاہیر علماء کو روانہ کیا اور خود توکلا علی اللہ پنجاب روانہ ہو گئے۔ سرہند وغیرہ اترتے ہوئے لاہور پہنچے۔ وہاں زیادہ تر وقت اہل علم اور اسلامی انجمنوں کو اس جانب توجہ دلانے میں صرف کیا۔ اتفاق سے انہیں یہاں ایک ایسی جماعت بھی مل گئی جس نے بعض ارکان کو کسی قدر اس مسئلہ کا خیال تھا۔ اور تھوڑی بہت جزوی کوشش کا بھی ارادہ تھا۔ مگر لوگوں کی مخالفت کے سبب کامیابی کی کوئی سبیل نظر نہ آنے پر انہوں نے

حضرت کو اطلاع دی تو آپ نے لکھا کہ:

"جب تک ناامیدی نہ ہو ایک دفعہ جان توڑ کوشش کر لینی چاہیے۔"

اس پر مولوی عبدالکریم صاحب آگے بڑھے۔ آپ ابھی وزیر آباد تک ہی پہنچے تھے کہ علماء حضرات کی طرف سے ان کے استفتاء کا جواب موصول ہو گیا جسے چھپوانے کی غرض سے تھانہ بھون واپس آ گئے۔ اور ان کو "ظلم پنجاب کے متعلق خدائی وصیت" کے عنوان سے چھپوا کر پنجاب روانہ ہونے والے تھے کہ ہندوؤں نے اطراف آگرہ میں شدھی کی تحریک شروع کر دی۔ جب اس کی خبر تھانہ بھون پہنچی تو حضرت تھانوی نے مولوی صاحب موصوف سے دریافت کیا کہ اگر تم وہاں چلے جاؤ تو قانون وراثت کی سعی میں تو کچھ حرج واقع نہ ہو گا۔ انہوں نے عرض کیا کہ صرف تاخیر ہو جائے گی اور تو کچھ حرج نہیں۔ فرمایا:

"بس تو پھر الاہم فالاہم پر عمل کرنا چاہیے۔ بسم اللہ کر کے آگرہ اور اس کے نواح میں جا کر پہلے مسلمانوں کو ہندو ہونے سے بچاؤ۔"

چنانچہ مولوی صاحب آگرہ کی طرف روانہ ہو گئے اور فتویٰ بذریعہ ڈاک پنجاب کے شہریوں میں بغرض تقسیم بھیج دیا۔ تاکہ وہاں بھی کام جاری رہے اور ایک دوسرا رسالہ "غضب المیراث" کے نام سے بھی شائع کر کے تقسیم کیا گیا۔ جب یہ ختم ہو گئے تو دوبارہ چھپوائے گئے اور ان کے اخراجات کا حضرت تھانوی نے انتظام فرمایا۔

حضرت تھانوی جمعیتہ العلماء کو اس طرف توجہ دلانے کیلئے برابر تین جلسوں میں مولوی عبدالکریم صاحب کو بھیجتے رہے۔ دو دفعہ تو کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ تیسری دفعہ اتنی کامیابی ہوئی کہ 1347ھ 25-1924ء میں بمقام مراد آباد ایک پرزور قرارداد اس سلسلہ میں منظور ہوئی جب فتنہ ارتداد کی آندھی کچھ تھمی تو پھر مولوی صاحب کو حکم ہوا کہ:

"میرا خیال ہے کہ ان سب قصوں کو چھوڑ کر پنجاب کا سفر تحریک عدل فی المیراث کیا جائے۔"

اور اس مرتبہ ان کے ہمراہ مولانا عبدالمجید صاحب بچھرایونی کو بھی بھیجا گیا۔ اس دورہ سے صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ بہت سے لوگوں نے قانون رواج عام بدلوانے کی سعی شروع کر دی اور بالآخر پاکستان بننے کے بعد 1948ء میں اس قسم کا قانون معرض وجود میں آ گیا۔

جبری تعلیم

1928ء میں ریاست الور میں دینی تعلیم حکماً بند کر دی گئی اور تمام چھوٹے بڑے دینی مدارس و مکاتب یک قلم توڑ دیئے گئے۔ اس کی اطلاع مولوی عبدالکریم صاب نے جو ان دنوں مدرسہ معین السلام قصبہ اڑون ضلع گڑگانواں سے متعلق تھے۔ حضرت تھانوی کو بھیجی اور دعا کیلئے لکھا کہ کسی طرح یہ قانون منسوخ ہو جائے۔ حضرت نے دعا کے ساتھ لکھا کہ اس سلسلہ میں قانونی چارہ جوئی کی جائے اور اخراجات کیلئے ان کے تخمینہ کے مطابق مبلغ یک صد روپیہ پیش کرنے کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ مولوی صاحب اس مثل کے ضروری کاغذات کی نقل حاصل کر کے جس کی رو سے تعلیم دین بند کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ وکلاء وغیرہ سے مشورہ لینے کے لئے دہلی پہنچے۔ کاغذات کے ملاحظہ سے یہ راز کھلا کہ جس طرح فلسطین کے مسلمانوں نے طمع نفسانی میں وہاں کی زمینیں خود یہودیوں کے پاس بیچ دیں تھیں اور اسلامی دنیا فلسطین میں یہود کے غلبہ کے خلاف ڈھول پیٹتی رہی تھی۔ اس طرح یہاں بھی ہندوؤں نے چالاکی کر کے دینی مکاتب کے بند کرنے کی درخواستیں خود مسلمانوں سے دلوا رکھی تھیں اور ان کی بنا پر حکام ریاست نے تعلیم دین بند کر دی تھی۔ گو وکلاء نے کہا کہ اب کچھ نہیں بن سکتا مگر حضرت کی تاکید کے پیش نظر مولوی صاحب نے ہمت نہ ہاری اور حکام متعلقہ کو اس سازش کے خلاف درخواستیں وغیرہ دینی شروع کر دیں۔

یہ سلسلہ ابھی تک جاری تھا کہ دہلی سے خبر آئی کہ وہاں بھی جبری تعلیم کے قانون تحت تمام دینی مدارس توڑے جا رہے ہیں۔ مولوی عبدالکریم صاحب تمام حالات معلوم کر کے فوراً تھانہ بھون پہنچے اور اطلاع دی کہ اس وقت تک گیارہ مکاتب ٹوٹ چکے ہیں۔ جن میں تقریباً اڑھائی سو طلباء قرآنی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور یہی وبا ملحقہ اضلاع میں بھی پھیل رہی ہے۔ اس پر حضرت تھانوی بہت پریشان ہوئے اور آپ کو سخت صدمہ پہنچا۔ آپ کے حکم سے مولوی صاحب نے اس بارہ میں ایک استفتاء مرتب کیا۔ حضرت نے اس کا جواب تحریر فرما کر دیگر علماء کرام کے دستخط حاصل کرنے کا امر فرمایا۔ چنانچہ مولوی عبدالکریم صاحب نے اس پر علماء دیوبند، سہارن پور، دہلی اور میرٹھ کے دستخط حاصل کر کے

اسے شائع کر دیا اور اس تحریک کو چلانے کیلئے انجمن خدام القرآن قائم کی۔ حضرت کی دعا اور مالی امداد سے اس تحریک کو بڑے زور سے چلایا گیا اور تھوڑی مدت بعد بفضلہٖ تعالیٰ تمام دینی مدارس کھل گئے۔ یہاں تک کہ مراد آباد' سہارنپور وغیرہ مقامات پر بھی روک تھام ہو گئی۔ پھر جہاں جہاں سے خبر آتی کہ وہاں دینی مدارس بند کئے جا رہے ہیں وہاں فی الفور مناسب کارروائی کر کے ان کو اس ارادہ سے باز رکھا جاتا۔ اگر اس وقت فی الفور حضرت اس طرف توجہ نہ فرماتے تو نتائج یقیناً روح فرسا ہوتے۔

قانون اوقاف

1930ء مین نواب جمشید علی خاں صاحب کی ہمراہی میں چند اعلیٰ طبقہ کے وکلاء اور روسا کے ایک باضابطہ نیم سرکاری وفد نے جس کے صدر حافظ ہدایت حسین صاحب بیرسٹر کانپور تھے تھانہ بھون حاضری کی اطلاع دی۔ حضرت نے قصبہ کے رئیس اعظم اور اپنے بھتیجے حضرت مولانا شبیر علی صاحب تھانوی کو ان کے استقبال کیلئے تاریخ مقررہ پر اسٹیشن پر بھیجا اور ان کے قیام کا انتظام بھی مولانا کے دولت خانہ پر کیا۔

یہ وفد اس امر کی تحقیق کرنے کے لئے حاضر ہوا تھا کہ آیا مسلمانوں کے اوقاف کے انتظامی معاملات میں غیر مسلم حکومت کو دخیل بنانا جائز ہے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں ان حضرات نے ایک سوال نامہ جو قریباً سو سوالات پر مشتمل تھا۔ شرعی تحقیق کے لئے حضرت کی خدمت میں اپنی آمد سے قبل ہی بھیج دیا تھا۔ تاکہ حضرت سوچ بچار کر رکھیں۔ مگر حضرت کو کثرت مشاغل کی وجہ سے انہیں ابھی دیکھنے کا اتفاق ہی نہ تھا کہ وفد پہنچ گیا۔ چونکہ وفد کے ارکان اعلیٰ طبقہ کے افراد پر مشتمل تھے اس لئے حضرت ان کو خانقاہ میں آنے کی تکلیف دینے کے بجائے خود ان کی قیام گاہ پر گفتگو کرنے کیلئے تشریف لے گئے۔

اصول بحث

حضرت نے ارکان وفد سے گفتگو کرنے کیلئے مندرجہ ذیل امور بطور اصول موضوع پیش کئے:

1۔ مسائل کا جواب عرض کرنے کے لئے میں حاضر ہوں۔ مگر مشورہ و مصلحت کے متعلق کچھ عرض کرنے سے میں اس لئے معذور ہوں کہ مجھ کو اس سے مناسبت نہیں۔

2۔ بعض مسائل عین وقت پر مستحضر نہیں ہوتے۔ ان کے جوابات سے معذور ہوں گا۔ البتہ اگر ان کی یادداشت لکھ کر مجھ کو دے دی جائے تو کتابیں دیکھ کر اطمینان سے جواب دے سکتا ہوں۔

3۔ مسائل پر اگر کچھ شبہات ہوں تو ان کا جواب دینا ہم لوگوں کے ذمہ نہیں کیونکہ ہم

لوگ مسائل کے ناقل ہیں۔ بانی نہیں۔ جیسے قوانین کے متعلق اگر کوئی شبہ یا خدشہ ہو اس کا جواب مجلس قانون ساز کے ذمہ ہے۔ جج یا وکیل کے ذمہ نہیں۔

حاضر جوابی

متذکرہ بالا اصولوں پر جب گفتگو شروع ہوئی تو حضرت نے ان حضرات کو صاف کہہ دیا کہ چونکہ یہ مذہبی فعل ہے اس لئے اس کے اندر غیر مسلم کا دخل دینا مذہبی دست اندازی ہے اور مذہبی دست اندازی کرنا یا اور کسی طرح سے اس میں مداخلت کی کوشش کرنا صاف جرم ہوگا۔ جیسے کہ نماز جو ایک خالص مذہبی فعل ہے۔ اس کے اندر کسی طرح جائز نہیں کہ غیر مسلم کو دخیل بنایا جائے۔

اسی طرح یہ بھی جائز نہیں ہوگا کہ کسی غیر مسلم سے دست اندازی کی درخواست کی جائے۔ یا کوئی ایسی کوشش کی جائے کہ وہ غیر مسلم وقف کے انتظامی معاملات میں دخیل ہو۔

وفد کی طرف سے گفتگو ہندوستان کے ایک مشہور بیرسٹر (1) کر رہے تھے۔ جو فن جرح میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے اور لوگ انہیں جرح کا بادشاہ کہتے تھے۔

حضرت تھانوی کی مذکورہ بالا تصریح سن کر بیرسٹر صاحب موصوف نے کہا کہ معاف فرمایئے نماز میں اور وقف میں فرق ہے۔ اس لئے کہ نماز کا تعلق مال سے نہیں ہے اور وقف کا تعلق مال سے ہے۔ اس وقت چونکہ متولیوں کی حالت خراب ہو رہی ہے اس لئے اوقاف کے اندر وہ بڑی گڑبڑ کرتے ہیں۔ اس کی آمدنی مصارف خیر میں صرف نہیں کرتے خود کھا جاتے ہیں۔ ہم نے چاہا کہ یہ واقعہ ان کے نام سے لکھا جائے۔ اس لئے مولانا شبیر علی صاحب تھانوی، مہتمم خانقاہ سے ان کا نام دریافت کیا تو انہوں نے لکھا کہ حضرت کے اندر ایثار اور عیب پوشی کا بہت اہتمام تھا۔ وہ ضرورت ہوتی تو ہار مان لیتے تھے۔ اور اگر کہیں یہ ضرورت دوسرے کی ہار کا اظہار بہ ضرورت دینی کرنا ہوتا تھا تو پھر اس کا نام ظاہر نہیں فرماتے تھے۔ لہٰذا میں بھی اتباعاً ان کا نام ظاہر کرنے سے معذور ہوں حالانکہ مجھے ان کا نام و پتہ معلوم اور یاد ہے۔ (مکتوبہ گرامی مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۵۵ء)

حکیم الامت نے فرمایا اچھا اگر آپ کے نزدیک نماز کی نظیر ٹھیک نہیں ہے تو زکوٰۃ کو ہی لے لیجئے۔ کہ ایک خالص مذہبی فعل بھی ہے اور اس کا تعلق مال سے بھی ہے۔ اور بہت سے مسلمان ایسے بھی ہیں جو اپنے مال کی زکوٰۃ نہیں نکالتے۔ مگر چونکہ مذہبی فعل بھی ہے اس لئے اس میں غیر مسلم کی مداخلت جس قسم کی بھی ہو ناجائز سمجھتے ہیں۔

بیرسٹر صاحب نے کہا اچھا صاحب نکاح اور طلاق بھی آپ کے نزدیک خالص مذہبی

فعل ہے یا نہیں۔

حضرت نے جواب دیا جی ہاں۔

اس پر انہوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ اگر ایک عورت کو شوہر نے طلاق دی۔ مگر اب وہ عورت اس مرد سے جدا ہونا چاہتی ہے اور مرد اس کو نہیں جانے دیتا۔ بلکہ روکتا ہے اور طلاق سے انکار کرتا ہے تو ایسی صورت میں کیا اس عورت کو جائز نہیں کہ عدالت میں اس کے متعلق استغاثہ دائر کرے اور شہادت سے طلاق کو ثابت کر کے حکومت سے اپنی آزادی میں مدد حاصل کرے۔ تو دیکھئے نکاح و طلاق مذہبی فعل ہیں۔ مگر اس میں غیر مسلم کا دخل جائز ہوا۔

حضرت نے جواب دیا۔ آپ نے غور نہیں کیا۔ یہاں دو چیزیں جدا جدا ہیں۔ ایک تو وقوع طلاق اور ایک اثر طلاق یعنی وہ حق جو اس عورت کو مرد کے طلاق دے دینے سے حاصل ہو گیا ہے اور مرد اس حق کو چھیننا چاہتا ہے جس میں عورت کا ضرر ہے تو یہاں وہ عورت غیر مسلم حکومت کا دخل قصداً خود طلاق میں نہیں چاہتی۔ بلکہ طلاق سے اس کو جو حق آزادی حاصل ہوا ہے جس کے استعمال نہ کر سکنے سے اس کو ضرر پہنچتا ہے۔ اس ضرر کو دفع کرنے کیلئے وہ عورت عدالت سے مدد چاہتی ہے۔

بیرسٹر صاب نے کہا کہ معاف فرمایئے۔ اسی طرح ہم یہاں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جیسے یہاں عورت کا ضرر ہے۔ اسی طرح اوقاف کے اندر گڑبڑ ہونے میں مساکین کا ضرر ہے۔ سو جیسے وہاں اس ضرر سے بچنے کی خاطر غیر مسلم کے دخل کو جائز رکھا گیا ہے۔ اسی طرح یہاں اوقاف میں ضرر سے بچنے کیلئے غیر مسلم کا دخل جائز ہونا چاہئے۔

حضرت نے جواب دیا کہ آپ نے غور نہیں کیا۔ وہاں تو شوہر کے حبس سے اس عورت کا ضرر ہے اور یہاں اوقاف میں متولی کی خیانت سے مساکین کا ضرر نہیں بلکہ صرف عدم النفع ہے۔ ضرر اور چیز ہے۔ عدم النفع اور چیز ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیئے۔ مثلاً آپ کی جیب میں ایک سو روپے کا نوٹ تھا۔ ایک شخص نے آپ سے وہ چھین لیا تو یہ ضرر ہوا اور اگر میں آپ کو ایک نوٹ دینا چاہتا ہوں مگر پھر کوئی اس نوٹ کے دینے سے منع کر دے تو اس میں آپ کا ضرر کچھ نہیں ہوا بلکہ صرف عدم النفع ہوا۔

اعتراف وفد

اس پر سب لوگوں نے بے ساختہ سبحان اللہ اور صل علیٰ کہنا شروع کر دیا اور بیرسٹر صاحب خاموش ہو گئے اور پھر کوئی شبہ پیش نہیں کیا۔ مگر حضرت کی حاضر جوابی سے بشاش ہو گئے اور یہاں سے بہت ہی خوش خوش رخصت ہوئے اور کہنے لگے کہ:

"بعض لوگوں نے ہم کو بہت ہی خشک جواب دیئے۔ جس سے ہماری بہت دل شکنی ہوئی۔ مگر یہاں حاضر ہو کر جو ہم کو نفع ہوا اور جو علوم ہم کو اس مجلس میں حاصل ہوئے وہ کہیں حاصل نہیں ہوئے۔ ہم نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ استفادہ کی غرض سے گاہ بگاہ یہاں حاضر ہوا کریں گے۔"

جب ارکان وفد واپس اسٹیشن کو روانہ ہوئے تو حضرت بھی انہیں رخصت کرنے کی غرض سے اسٹیشن پر تشریف لے گئے اور فرمایا کہ جب آپ یہاں سٹیشن پر آکر اترے تھے اس وقت اس لئے نہیں آیا کہ اس وقت میرا آنا آپ کی جاہ کی وجہ سے ہوتا اور اب جو میں آیا ہوں اب تو یہ آنا آپ کی چاہ یعنی محبت کی وجہ سے ہوا ہے۔

نقل یادداشت

حضرت تھانوی نے ارکان وفد کی رہنمائی کیلئے اس وقت مندرجہ ذیل ایک مختصر سی یادداشت لکھ دی تاکہ اس کی روشنی میں اگر یہ کوئی تجویز اصلاح اوقاف کے سلسلہ میں کر سکیں تو کریں:

1۔ وقف کرنا ایک مالی عبادت ہے اور خالص عبادت ہے۔ جیسے زکوٰۃ دینا عبادت ہے اور خالص عبادت ہے۔

2۔ گو وقف کا نفع بسا اوقات عباد کو بھی پہنچتا ہے جبکہ ان عباد کیلئے کوئی استحقاق مقرر کردے مگر پھر بھی وقف خالص عبادت رہے گا۔ معاملہ نہ رہے گا۔ جیسے زکوٰۃ خالص نفع عباد کیلئے ہی موضوع ہے۔ دوسرے مصارف مسجد وغیرہ میں صرف نہیں ہو سکتی۔ بخلاف وقف کے کہ وہ ان مصارف میں بھی شرط وقف کے موافق صرف ہو سکتا ہے جس سے ثابت ہوا کہ زکوٰۃ کا تعلق عباد کے ساتھ بہ نسبت وقف کے زیادہ ہے۔ مگر باوجود اس کے زکوٰۃ خالص عبادت ہے معاملہ نہیں۔ پس وقف خالص عبادت ہونے میں زکوٰۃ سے بھی زیادہ ہے۔

3۔ جب وقف مثل زکوٰۃ کے بلکہ زکوٰۃ سے بھی زیادہ خالص عبادت ہے۔ اس میں کسی خرابی کا ہونا ایسا ہوگا جیسے زکوٰۃ میں کسی خرابی کا ہونا اور اس خرابی کی اصلاح کیلئے گورنمنٹ کا دخل دینا ایسا ہوگا جیسا زکوٰۃ کی خرابی کی اصلاح کے لئے گورنمنٹ کا دخل نہیں۔

4۔ زکوٰۃ میں ایسا دخل دینا یقیناً دخل فی المذہب ہے۔ اسی طرح وقف میں دخل دینا دخل فی المذہب ہوگا۔ خواہ خود دخل دیا جائے۔ خواہ کسی کی درخواست پر دخل دیا جائے۔ پھر سوال یہ ہے کہ پھر وقف کی خرابیوں کا کیا انسداد ہو یا ایسا ہے جیسا یہ سوال کیا جائے کہ اگر نماز روزہ، حج یا زکوٰۃ میں کوتاہی کرے۔ اس کا کیا انسداد ہے۔ کیا اس کا کوئی شخص یہ جواب تجویز کرسکتا ہے کہ گورنمنٹ کو ان کوتاہیوں پر جرمانہ وغیرہ مقرر کرنے کا حق ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ اس کا انتظام خود مسلمان کرسکتے ہیں۔ خواہ اس کو افہام تفہیم کریں۔ خواہ اس کو تولیت سے معزول کریں جبکہ واقف نے ان کو اس قسم کے اختیار دیئے ہوں خواہ اس سے قطع تعلق کریں۔ اگر ایسا نہ کریں تو ان کی کوتاہی ہوگی۔ گورنمنٹ کو پھر بھی دخل دینے کا حق نہیں۔

مسودہ پر غور وخوض

اگرچہ حضرت تھانوی کی رائے یہی تھی کہ ایسا قانون بنانے کا حکومت کو قواعد شرعیہ کی رو سے اختیار نہیں اور دیوبند اور سہارنپور کے علماء کرام بھی حضرت تھانوی کی تائید میں تھے۔ مگر بعض حلقوں سے وفد کو حسب خواہش جواب مل گیا اور اہل وفد نے ایک مسودہ قانون مرتب کرکے کونسل میں پیش کردیا جو رائے عامہ معلوم کرنے کیلئے مشتہر کیا گیا۔ اس کی مشتہری پر مولانا حافظ عبداللطیف صاحب مظاہر العلوم سہارنپور نے حضرت تھانوی کی اس طرف توجہ مبذول کرائی۔ ان کی تحریک اور حضرت کی تائید سے علماء دیوبند و سہارنپور 24 ماہ ذقیعدہ 1352ھ کو تھانہ بھون جمع ہوئے اور بعد غور و خوض سب کی یہی رائے ہوئی کہ حضرت تھانوی کی زیر نگرانی اس پر تفصیلی نظر کرکے اس کے نقائص واضح کئے جائیں اور اس میں ایسی ترامیم کردی جائیں کہ یہ مسودہ شریعت کے مواقف ہوجائے۔ اس غرض کیلئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی (مفتی اعظم پاکستان) مولوی جمیل احمد صاحب تھانوی مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور اور مولوی عبدالکریم صاحب پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی

اور انہوں نے ہر ہر جزو میں حضرت سے استصواب کر کے غور و خوض کے بعد ترمیم مسودہ مرتب کیا۔ حضرت نے اس کو تحقیقی نظر سے دیکھنے کے بعد دستخط فرمائے اور اس کو 25 ذی الحجہ 1352ھ مطابق 1934ء کو دیو بند میں آخری بار غور و خوض کے لئے روانہ کیا گیا۔ جہاں صبح سے عشاء تک اس پر بحث و تمحیص ہوتی رہی اور بالآخر یہ بالاتفاق منظور ہوا۔ جس پر تیس علماء کرام کے دستخط ثبت ہوئے اور یہ ترمیمی مسودہ کونسل کو بھیج دیا گیا۔ اس مسودہ پر مکالمہ کی غرض سے 22 اپریل 1934ء کو اس مسودہ کے مجوز حافظ ہدایت حسین صاحب بیرسٹر و ممبر کونسل آف اسٹیٹ نواب جمشید علی خاں صاحب ممبر لیجسلیٹو اسمبلی حاجی وجیہہ الدین صاحب ممبر اسمبلی حاجی رشید احمد خاں صاحب سوداگر اسلحہ دہلی تھانہ بھون پہنچے اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق مہتمم صاحب دیو بند' مفتی صاحب دیو بند' مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور سہارنپور سے ناظم صاحب مظاہر العلوم' مولانا محمد زکریا صاحب و دیگر علماء کرام تشریف لائے۔ حضرت تھانوی کی موجودگی میں پانچ گھنٹے تک اس مسودہ پر مفصل گفتگو ہوئی۔ بالآخر حافظ ہدایت حسین صاحب نے مجوزہ مشورہ میں اصلاحات کو تسلیم کر لیا۔ بعض میں کچھ عذر کیا اور بعض پر غور کا وعدہ کیا۔

اس سلسلہ میں جس قدر اخراجات ہوئے ان کا ایک تہائی حصہ حضرت تھانوی نے اپنی گرہ سے خود ادا کیا۔

قانون تنسیخ نکاح

ایک عرصہ سے تقرر قضاۃ کا سلسلہ موقوف ہونے کی وجہ سے مسلمان عورتیں سخت مصائب و مشکلات میں گرفتار تھیں اور ستم رسیدہ مستورات کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ بہ تمسہ لیکر تبدیلی مذہب کی آڑ میں ظالم خاوندوں سے نجات حاصل کریں۔

ان کے حال زار پر بھی حضرت تھانوی کو ہم سب سے پہلے توجہ فرمانے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ نے ان کے مسائل پر علماء مدینہ منورہ' دیوبند' سہارنپور سے بار بار فتویٰ حاصل کئے اور کامل تحقیق فرما کر پانچ سال کی محنت شاقہ کے بعد ایک رسالہ الحلیلۃ الناجزہ تصنیف فرمایا اور ایک ہزار روپیہ کی لاگت سے اسے چھپوا کر اور اس پر دوسرے علمائے کرام

کی تصدیق کرا کر ممبران اسمبلی میں تقسیم کیا کہ اس کے مطابق ایک مسودہ قانون تنسیخ نکاح مرتب کر کے بغرض منظوری اسمبلی میں پیش کیا۔

تقریباً تمام علماء ہند نے اس رسالہ کی تائید و تصدیق فرمائی اور ممبران اسمبلی نے بہت جلد قانون بنوانے کی سعی شروع کردی اور ایک مسودہ مسلم قانون فسخ نکاح کے نام سے کاظمی صاحب نے اسمبلی میں پیش کر دیا۔ مگر اس مسودہ میں وہ قیود و شرائط نظر انداز کر دیں جو حضرت نے فقہ کی ورق گردانی اور علمائے محققین سے مراجعت کے بعد تحریر فرمائی تھی۔ بہرحال 1939ء میں ایکٹ نمبر 8 انفساخ نکاح منظور ہو گیا۔ جس کے ذریعہ عورتوں کے لئے ظلم و تشدد سے نجات پانے کی سبیل نکل آئی اور تب سے اس قانون پر عملدرآمد ہوتا چلا آرہا ہے۔

آرمی بل

دوسری جنگ عظیم شروع ہونے پر گورنمنٹ نے اسمبلی میں ہندوستان کی طرف سے فوجی امداد دینے کا ایک بل پیش کیا جس کی کانگرس نے بڑی مخالفت کی۔ مگر قائداعظم نے اس کی حمایت کی۔ قائداعظم اور مسلم لیگ کے خلاف کانگرسیوں نے آسمان سر پر اٹھالیا اور بلطائف الحیل قائداعظم کو بدنام کرنا شروع کردیا۔ اس واویلا کا اثر خانقاہ تھانہ بھون تک بھی جا پہنچا اور کانگرس زدہ لوگوں نے آرمی بل کی آڑ میں حضرت تھانوی کو قائداعظم سے برگشتہ کرنے کیلئے طرح طرح کی چالیں چلنی شروع کردیں۔ مسلسل پراپیگنڈا سے حضرت کو بھی کچھ تشویش سی ہوئی۔ مگر حقیقت حال سے آگاہ ہوئے بغیر آپ نے کوئی اعلان شائع کرنے سے انکار کردیا اور ایک وفد جو مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مولانا ظفر احمد عثمانی صاحبؒ اور مولوی عبدالکریم صاحب گمتھلوی پر مشتمل تھا قائداعظم کی خدمت میں دہلی بھیجا کہ ان سے معلوم کرے کہ انہوں نے آرمی بل کی حمایت کن وجوہات کی بنا پر کی ہے۔ وقت مقررہ کے مطابق وفد دہلی پہنچ گیا۔

قائداعظم کی وضاحت

وفد نے قائداعظم سے آرمی بل کی حمایت کے وجوہ دریافت کئے۔ قائداعظم نے کہا کہ:

"کانگریس نے حقیقت حال پر پردہ ڈال کر میرے خلاف پراپیگنڈا کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کانگریس خود آرمی بل کی حمایت کرنے کو تیار تھی۔ مگر اس کی شرط یہ تھی کہ فوجی بھرتی تناسب آبادی کے لحاظ سے ہو۔ یعنی اس وقت فوج میں ستر فیصد مسلمان تھے۔ کانگریس کا مطالبہ تھا کہ 25 فیصد مسلمان لئے جائیں۔ تب وہ آرمی بل کی حمایت کرے گی۔ اس پر ہوم ممبر نے کہا کہ خطرہ ہمارے سر پر ہے اور ہم فوج کو توڑ کر نئی فوج نہیں بنا سکتے۔ اس پر ڈاکٹر مونجے نے کہا کہ ایک سال میں ہم آپ کو ایک لاکھ فوجی تربیت یافتہ نوجوان دے سکتے ہیں۔ ہوم ممبر نے کہا آپ ایک سال کہتے ہیں ہم کو ایک مہینہ کی بھی مہلت نہیں ہے۔ خطرہ سر پر ہے۔ اس کے بعد اجلاس لنچ کیلئے ملتوی ہو گیا اور صدر اسمبلی نے مجھ سے گفتگو کی کہ آپ آرمی بل کی حمایت کر سکتے ہیں کہ نہیں؟ میں نے کہا کہ دو شرطوں پر کر سکتا ہوں۔ ایک یہ کہ فوجی تناسب جو اس وقت ہے وہ ہمیشہ قائم رہے۔ دوسرے یہ کہ مسلمان فوج مسلمانوں کے مقابلہ میں کبھی نہ بھیجی جائے۔ چنانچہ یہ شرطیں منظور کر لی گئیں اور میں نے آرمی بل کی حمایت شروع کر دی۔"

وفد نے کہا کہ انگریزی فوج میں مسلمانوں کا بھرتی ہونا مسلمانوں کیلئے کیسے مفید ہو سکتا ہے؟ اس کا فائدہ سراسر انگریزوں کو ہو گا۔ قائداعظم نے کہا کہ:

"اس میں ذرا غور کیجئے۔ آپ کو جان لینا چاہئے کہ انقلاب ناگزیر ہے۔ ہندوستان آزاد ہو کر رہے گا۔ اگر آزادی ہند کے وقت مسلمان فوج میں نہ ہوئے تو جس کی فوج ہو گی طاقت اسی کے ہاتھ میں رہے گی۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ فوج میں بھرتی ہوں۔ تاکہ انقلاب کے وقت طاقت مسلمان کے ہاتھ میں رہے۔"

قائداعظم یہ کہہ کر رکے اور پھر فوراً سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا:

"آپ کو حالات کا کچھ علم نہیں۔ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ایک وقت ایسا آرہا ہے کہ اگر ان کے ہاتھ میں ہتھیار نہ ہوا تو ان کی جان مال اور عزت محفوظ نہ رہے گی۔

وفد کو اگرچہ ملاقات کیلئے آدھ گھنٹہ وقت دیا گیا تھا۔ مگر ڈیڑھ گھنٹہ تک گفتگو ہوتی رہی۔ درمیان میں وفد نے کہا کہ اگر آپ کا کچھ ہرج ہوتا ہے تو ہم گفتگو ختم کردیں۔ قائداعظم نے کہا کہ:

"نہیں۔ دوسرے لوگ جو مجھ سے ملنا چاہتے ہیں میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے کیا کہیں گے۔ لیکن آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ میں نہیں جانتا۔ اس لئے آپ جس قدر گفتگو کرنا چاہیں شوق سے کریں۔ میں برابر سنوں گا۔"

جب اس وفد نے واپس جاکر حضرت کو تمام حالات سنائے تو آپ کو نہ صرف تسلی بلکہ مسرت بھی ہوئی کہ قوم کے اس مخلص رہنما کی نظر صرف آج کے حالات پر ہی نہیں بلکہ آج سے نو دس سال بعد ہونے والے واقعات کو بھی وہ اپنی چشم فراست سے برابر دیکھ رہے ہیں۔ جب مجلس عام میں اس وفد کی ملاقات کا ذکر آیا اور مخالفین لیگ نے حضرت اور قائداعظم کی تائید میں پایا تو ان کے عزائم مشئومہ پر اوس پڑ گئی۔

لمحہ فکریہ

اندازہ لگایئے اور انصاف کیجئے کہ ایک دور افتادہ غیر معروف قصبہ میں بیٹھا ہوا یہ دور بین مرد درویش کس طرح ہندوستان میں پاکستان کی داغ بیل ڈالنے میں مصروف تھا۔ تن واحد ہے۔ کوئی جماعت نہیں۔ چندہ نہیں، جلسہ نہیں، جلوس نہیں، اخبار نہیں، ماحول سارے کا سارا مخالف ہے۔ حصول پاکستان کی باقاعدہ جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی۔ مگر حضرت تھانوی دامے دامے قدمے سخنے اس مقصد کیلئے مصروف جدوجہد ہیں جس کا اظہار علامہ اقبال نے 29 دسمبر 1930ء کو ان الفاظ میں کیا تھا کہ:

"میں صرف ہندوستان اور اسلام کے فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کا مطالبہ کررہا ہوں (کیونکہ) مسلمانان ہندوستان کو اپنی روایات و تمدن کے ماتحت اس ملک میں آزادانہ نشوونما کا حق حاصل ہے۔"

تحریک پاکستان اور علمائے دیوبند

چند کتابوں کا سرسری جائزہ

تحریک پاکستان اور علمائے دیوبند کے موضوع پر کافی کچھ لکھا جاچکا ہے ہے مگر یہ امر قابل افسوس ہے کہ اب تک جو کچھ بھی منصہ شہود پر آیا اس میں تصویر کا محض ایک ہی رخ پیش کیا گیا ہے۔ اس صورت حال نے ایک عام فرد کے ذہن پر یہ بات نقش کر دی ہے کہ اول تو سرے سے علماء کا تحریک پاکستان سے کوئی تعلق ہی نہیں اور اگر ہے تو محض اتنا کہ انہوں نے تحریک و قیام پاکستان کی مخالفت کی' اور بس۔ اس موضوع پر شائع شدہ کتب میں یہی تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ مدرسہ دیو بند مجموعی طور پر اول تا آخر پاکستان کی مخالفت میں سرگرم رہا ہے۔ اس سلسلے میں ضیاء الحسن فاروقی کی کتاب The Deoband School and the Demand for Pakistan. خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ ضیاء الحسن فاروقی کی مندرجہ بالا کتاب ۱۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں صرف دو صفحات ۱۰۳۔ ۱۱۹ پر مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کا محض چار سطروں میں ذکر کیا گیا ہے۔ چوہدری حبیب احمد کی کتاب تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء و صفحات ۱۰۳۹) پڑھنے کے بعد اس خیال کو مزید تقویت ملتی ہے کہ علماء دیوبند کی اکثریت تحریک پاکستان کے خلاف تھی۔ ڈاکٹر پیٹر ہارڈی نے اپنی کتاب Partners in Freedom and True Muslims. میں تحریک آزادی میں حصہ لینے والے ان مسلمان علماء کے سیاسی افکار کا جائزہ لیا ہے جنہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے ہندوؤں کے ساتھ تعاون کیا۔ کتاب میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کے سیاسی رجحانات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا تذکرہ چند سطروں میں کیا گیا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی کتاب Ulema in Politics. شائع ہوئی۔ ۴۳۲ صفحات کی اس ضخیم اور تحقیقی کتاب میں علماء کی سیاست میں عمل دخل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب میں جہاں مولانا مودودی سے لے کر مولانا حسین احمد مدنی' مولانا آزاد اور مولانا سندھی اور دیگر علماء کے کارناموں کا

تفصیلی تذکرہ موجود ہے وہاں مولانا اشرف علی تھانوی کے سیاسی رجحانات اور خدمات کو محض ۲۳ سطروں پر مشتمل ایک پیراگراف میں سمودیا گیا ہے۔ مولانا محمد شفیعؒ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا ظفر احمد تھانویؒ کو دو صفحات سے زائد جگہ نہیں مل سکی۔

ڈاکٹر وحید الزمان کی کتاب Towards pakistan میں نیشنلسٹ مسلمانوں کے سیاسی افکار پر بحث کی گئی ہے۔ ۲۵ صفحات پر مشتمل ایک علیحدہ باب میں مولانا ابوالکلام آزاد، جمیعتہ العلماء ہند، مجلس احرار وغیرہ کا تذکرہ تو ملتا ہے لیکن مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے سیاسی افکار و خدمات پر بحث غیر ضروری سمجھی گئی۔

ڈاکٹر کے کے عزیز نے اپنی کتاب The Making of Pakistan جو کہ لندن سے شائع ہوئی تھی کے ایک باب میں نیشنلسٹ مسلمانوں کے زیر عنوان مولانا آزاد اور جمیعتہ العلماء ہند کی سیاسی سرگرمیوں پر بحث کی ہے۔ اس باب میں سات سطروں میں مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا ذکر کیا گیا ہے۔ فاضل مصنف نے جمیعتہ العلماء اسلام کی تشکیل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ۱۹۴۶ء میں جمیعتہ العلماء میں پاکستان کے مسئلہ پر پھوٹ پڑ گئی اور ایک گروپ نے علیحدگی اختیار کرکے جمیعتہ العلماء اسلام کے نام سے ایک علیحدہ تنظیم کرلی۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو جماعت کے دو راہنما بتلایا گیا۔ جبکہ مولانا تھانویؒ ۲۱ جولائی ۱۹۴۳ء کو وفات پاچکے تھے اور جمعتہ العلماء اسلام کی تشکیل ۱۹۴۶ء کی بجائے اکتوبر ۱۹۴۵ء کو عمل میں آئی تھی۔

ڈبلیو سی سمتھ جس نے ہندوستانی مسلمانوں کی فکری، سیاسی اور قومی تحریکوں پر ایک مبسوط کتاب Modern Islam in India تحریر کی ہے، ایک مقالہ Politics The Ulema in Indian لکھا اپنے موضوع پر ایک مختصر جائزہ ہے۔ مصنف نے ایک ایسے موضوع پر جو ایک طویل عہد پر پھیلا ہوا ہے مختصراً سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اس نے ہندوستان کی مسلم سیاست میں علمائے دیوبند کے رویے اور رجحان سے تو بحث کی ہے لیکن تحریک آزادی پاکستان کے تعلق پر روشنی نہیں ڈالی اور نہ کسی عالم کا ذکر کیا۔ انفرادی طور پر محض مولانا ابوالکلام آزاد کو موضوع بنایا ہے۔

۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے تحریک پاکستان کے موضوع پر ایک نہایت وقیع کتاب ہماری قومی جدوجہد تحریر کی۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی تحریک، پاکستان کے

سرگرم کارکن، علامہ اقبال کے قریبی ساتھی، مشہور ادیب اور افسانہ نویس ہیں۔ اپنی اس کتاب میں ڈاکٹر بٹالوی نے علماء دیوبند سے متعلق چند ایک باتیں ایسی لکھ دیں جن کا تعلق انشاء پردازی اور افسانہ نویسی سے تو ہوسکتا ہے مگر تاریخ نویسی سے ہرگز نہیں۔
ڈاکٹر بٹالوی کی ان افسانوی باتوں کا جائزہ لینا اس لیے ضروری ہوگیا ہے کہ ایک عام صورت میں علماء بالخصوص علماء دیو بند کے خلاف ایک منظم تحریک کے ذریعے ذہنوں کو پہلے ہی زہر آلود کر دیا گیا ہے۔ یہ تاثر عام پھیلا دیا گیا ہے کہ علماء دیو بند کی اکثریت تحریک و قیام پاکستان کے خلاف تھی۔ حالانکہ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ تحریک پاکستان کے ضمن میں علمائے دیو بند واضح طور پر دو مختلف اور متضاد نظریاتی گروہوں میں منقسم تھے۔ اگر ایک طرف مولانا حسین احمد مدنیؒ کی زیر قیادت ایک گروپ کانگرس کی حمایت میں متحدہ ہندوستان کے لیے سرگرم عمل تھا تو دوسری جانب مولانا اشرف علی تھانوی کی راہنمائی میں علماء کا ایک دوسرا باا ثر اور مضبوط گروہ تحریک پاکستان کی خاطر اپنی تحریری، تقریری اور علمی صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہا تھا۔ یہاں اس امر کا تذکرہ بے جانہ ہوگا کہ براعظم پاک و ہند میں مولانا اشرف علی تھانوی کا حلقہ مریدین ہزاروں سے نکل کر لاکھوں تک پھیلا ہوا تھا اور یہ بات خارج از امکان ہے کہ کوئی مرید اپنے مرشد کی ہدایات اور رجحانات کے برعکس کوئی اور نظریات رکھے یا ان پر عمل کرے اور یہ کہ جب تک مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنے اس رجحان کو ظاہر نہیں کیا تھا، برابر اور مسلسل ان کے مریدین و مسترشدین ووابستگان کی طرف سے استفساری خطوط بکثرت آرہے تھے کہ وہ کدھر قدم بڑھائیں؟ پھر مولانا کی طرف سے مسلم لیگ کی حمایت میں ان کی رائے کی اشاعت کے بعد ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ایسے مسلمان جو غیر جانبداری اور تذبذب کی حالت میں تھے، پوری قوت کے ساتھ مسلم لیگ کا ساتھ دینے لگے اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (جو عرصہ سے سیاست سے یکسو ہو کر گوشہ گمنامی میں زندگی گزار رہے تھے) مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور مولانا اطہر علیؒ وغیرہم علماء کی ایک عظیم جماعت میدان میں آئی اور دیکھتے دیکھتے مسلم لیگ کی کایا پلٹ گئی۔ دراصل مسلم لیگ کو تقویت اور مقبولیت عامہ ان ہی علماء کی تائید اور حمایت سے حاصل ہوئی۔ ورنہ عام مسلمان، مسلم لیگ کو انگریزوں کی حاشیہ بردار سمجھ کر اس میں شرکت سے گریز کرتے تھے۔ یہی علماء تھے جنہوں نے قریہ قریہ، کوچہ کوچہ جاکر اس طلسم کو توڑا

اور عوام الناس کی ڈھارس بندھائی اور ان کو مسلم لیگ میں شرکت پر آمادہ کیا۔ ان حقائق کو چھپانا' اور ان سے رو گردانی یا ان کو جھٹلانا' آفتاب پر خاک ڈالنے اور صداقت کا منہ چڑانے کے مترادف ہے جو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

ایک تاریخ نویس کے لیے ضروری ہے کہ وہ غیر جانبدار ہو' اس کی تحریروں میں اس کے جذبات کو بالکل دخل نہ ہو' جو بات کہے حوالہ جات کے ساتھ بیان کرے' افسانہ نویسی سے احتراز کرے۔ خود ڈاکٹر بٹالوی نے اپنی مندرجہ بالا کتاب میں تاریخ نویسی کے ان بنیادی اصولوں کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "تاریخ نویسی کا مسلمہ اصول یہ ہے کہ واقعات کے بیان کرنے میں پوری دیانت برتی جائے۔ البتہ واقعات کی تاویل و توجیہات اور تعبیر اور ان سے نتائج اخذ کرنے کا حق ہر شخص کو حاصل ہے۔"

(۱) لیکن یہ امر نہایت ہی افسوسناک ہے کہ ڈاکٹر بٹالوی نے اپنے ہی بیان کردہ تاریخ نویسی کے اصولوں کو خود ہی مجروح و پامال کیا۔ ڈاکٹر بٹالوی لکھتے ہیں "کوئی مانے نہ مانے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جناح مسلمانوں کا پہلا سیکولر Secular لیڈر تھا جس نے ہماری سیاست کو پیشہ ور مولویوں سے نجات دلائی۔ سرسید مرحوم بھی سیکولر لیڈر تھے لیکن مولویوں نے ان پر کفر کا فتویٰ لگا کر انہیں واجب القتل قرار دیا تو اس غریب کو بھی جان بچانے کے لیے اور مولویوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے ان ہی کے ہتھیار استعمال کرنے پڑے۔" (۲) اپنی اس تحریر میں ڈاکٹر بٹالوی نے دو غیر مستند غیر تاریخی باتیں بیان کیں۔ پہلی یہ کہ جناح مسلمانوں کا سیکولر لیڈر تھا۔ سیکولر سے اگر ڈاکٹر بٹالوی کی مراد یہ ہے کہ قائداعظم سیاست اور مذہب میں تفریق کے حامی تھے تو یہ بات تاریخی طور پر غیر مستند ہے۔ قائداعظم کی تقاریر کو پڑھئے صورت حال کی وضاحت ہو جائے گی۔ سٹریچی ہال علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی کے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا " مجھے بحیثیت مسلمان دوسری اقوام کے معاشرت اور تہذیب کا پورا احترام ہے لیکن مجھے اپنے اسلامی کلچر اور تہذیب سے بہت زیادہ محبت ہے میں ہرگز نہیں چاہتا کہ ہماری آنے والی نسلیں اسلامی تہذیب' تمدن اور فلسفہ سے بے بہرہ ہوں(۱) جون ۱۹۳۸ء میں میمن چیمبرز آف کامرس اینڈ میمن مرچنٹس ایسوسی ایشن کے سپاسنامے کا جواب دیتے ہوئے فرمایا "مسلمانوں کے لیے پروگرام تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے ان کے پاس تو ۱۳۰۰ برس سے ایک مکمل پروگرام موجود ہے اور وہ قرآن پاک ہے۔ میرا اسی قانون

الہیہ پر ایمان ہے اور میں جو آزادی کا طالب ہوں وہ اسی کلام الٰہی کی تعمیل ہے۔(۲) ایک اور موقع پر انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا "میں نہ کوئی مولوی ہوں اور نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلام کا اپنے طور پر مطالعہ کیا ہے۔ اس عظیم الشان کتاب میں اسلامی زندگی سے متعلق ہدایات کے باب میں زندگی کا روحانی پہلو معاشرت، سیاست معیشت غرض انسانی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جو قرآن مجید کی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لیے بہترین ہیں بلکہ اسلامی سلطنت میں غیر مسلموں کے لیے بھی سلوک اور آئینی حقوق کا اس سے بہتر تصور ممکن نہیں" (۳) فروری ۱۹۴۸ء میں امریکی عوام کے نام ایک پیغام میں آپ نے فرمایا "پاکستان کا دستور ابھی آئین ساز اسمبلی نے تیار کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی شکل کیا ہوگی لیکن یہ ایک جمہوری آئین ہوگا جس میں اسلام کے بنیادی اصول شامل ہوں گے۔ یہ دستور زندگی میں آج بھی اس طرح قابل عمل ہیں جس طرح آج سے ۱۳۰۰ سال قبل قابل عمل تھا۔ اسلام نے ہمیں جمہوریت کا سبق دیا ہے۔" ایک اور موقع پر فرمایا کہ "قرآن مجید صرف مذہبی اصولوں تک محدود نہیں بلکہ یہ زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے۔"

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ

اکابرین دیوبند میں جن بزرگوں نے تحریک پاکستان اور مسلم لیگ کی حمایت میں سب سے طاقتور آواز بلند کی وہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کی آواز تھی، حضرت مولانا کا طبعی میلان یکسوئی کے ساتھ تصنیف و تالیف تعلیم و تربیت اصلاح امت اور ہدایت خلق کی طرف تھا' اس لئے عملی طور پر سیاسی اور ملکی تحریکوں میں براہ راست حصہ نہ لیا۔ اور نہ ہی آپ کسی سیاسی جماعت میں منسلک ہوئے۔ البتہ جب کبھی ملک میں کوئی سیاسی تحریک شروع ہوئی اس کے بارے میں ایک ماہر شریعت عالم دین ہونے کی حیثیت سے اسکی شرعی حیثیت پر فقیہانہ نظر بصیرت ڈال کر نتائج واضح کرنے اور ملت کی علمی اور دینی راہنمائی کا فریضہ ادا کرنے میں کبھی دریغ نہ فرمایا' آل انڈیا نیشنل کانگریس شروع میں ایک اعتدال پسند جماعت تھی۔ لیکن بعد میں ظاہر ہوگیا کہ اسکی کارروائیوں سے مسلمانوں کے مفادات کو زبردست نقصان پہنچ سکتا ہے۔ سرسید احمد خاں پہلے آدمی تھے' جنہوں نے اعلانیہ کانگرس کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس سے الگ رہیں' اور اپنے آپ کو تعلیم کیلئے وقف کر دیں مولانا اشرف علی تھانوی کا مشورہ بھی یہی رہا اور ان کی دلیل یہ تھی' کہ کانگریس میں چونکہ اکثریت غیر مسلموں کی ہے اس لئے اس جماعت کی اصلاح نا ممکن ہے۔ حضرت حکیم الامت کے خیال میں کانگریس کی مقبولیت کی اصل وجہ اسمیں مسلمانوں کا شریک ہونا تھا۔ حضرت حکیم الامت نے اس کے متعلق فرمایا کہ ہندوؤں کی پچاس سالہ مردہ کانگریس کو مسلمانوں نے زندہ کیا۔ جب تک مسلمانوں نے شرکت نہ کی تھی۔ کسی نے کانگریس کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ اگر خدانخواستہ یہ جماعت ہندوستان میں برسراقتدار آگئی تو یہ بھی ہندوستان میں وہی کرے گی۔ جو بالشویک کر رہے ہیں' اس زمانے میں جمیعت العلمائے ہند کا اجلاس دہلی میں ہوا۔ حضرت حکیم الامتؒ تھانوی کو شرکت کی دعوت ملی' حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا۔ واقعات نے مجھ کو اس رائے پر بہت پختہ کر دیا ہے۔ کہ مسلمانوں خصوصاً" علماء کا کانگرس میں شامل ہونا میرے

نزدیک مذہبا" مھلک ہے۔ بلکہ کانگریس سے بیزاری کا اعلان کر دینا بہت ضروری ہے۔ علماء کو خود مسلمانوں کی تنظیم کرنی چاہیئے اور مسلمانوں کا کانگریس میں داخل ہونا اور داخل کرنا میرے نزدیک انکی اپنی موت کے مترادف ہے' بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ ہم کانگریس میں شرکت اسی وجہ سے کرتے ہیں' کہ اس پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے اور ہمارا غلبہ ہو اگر مقصود واقعی یہ ہے' تو اس کا حصول مسلم لیگ میں زیادہ آسان ہے کیونکہ مسلم لیگ والے اتباع کیلئے آمادہ ہیں۔ چنانچہ مسلم لیگ کے بڑے بڑے ارکان نے مجھے لکھا ہے کہ ہم حضرات علماء کی رائے کے اتباع کیلئے تیار ہیں اور کانگریس والے تو خود اپنا تابع بناتے ہیں۔ ان پر غلبہ پانا مشکل ہے۔

پاکستان کا اولین نقشہ

مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کو بعض معاصر علماء کی طرح جنگ آزادی، جنگ حقوق آزادی و ملی وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی، ان کے سامنے مسئلہ سیاسی نہیں بلکہ تمام تر دینی تھا۔ وہ صرف اسلام کی حکومت چاہتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں جب پہلی بار حاضری ہوئی تو اس ملاقات میں حضرت نے دارالسلام کی اسکیم خاصی تفصیل سے بیان فرمائی تھی، کہ جی یوں چاہتا ہے، ایک خطے پر خالص اسلامی حکومت ہو سارے قوانین تعزیرات وغیرہ کا اجراء احکام شریعت کے مطابق ہو، بیت المال ہو، نظام زکواۃ رائج ہو، شرعی عدالتیں قائم ہوں وغیرہ، دوسروں قوموں کے ساتھ ملکر کام کرتے ہوئے یہ نتائج کہاں حاصل ہو سکتے ہیں، اس مقصد کے لئے صرف مسلمانوں ہی کی جماعت ہونی چاہئے۔ گویا خانقاہ امداد یہ تھانہ بھون میں بوریہ نشیں اس مرد درویش نے حصول پاکستان و نظام پاکستان کا نقشہ اس وقت پیش کیا۔ جب پاکستان چاہنے والوں کو اس کا خواب و خیال بھی نہ تھا۔ حضرت حکیم الامت تھانوی مسلمانوں کی الگ تنظیم کے رہے حتیٰ کہ جب تک مسلم لیگ نے کانگرس کا ساتھ دیا اس وقت تک حضرت نے مسلم لیگ کا ساتھ نہیں دیا۔ اور جب مسلم لیگ نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کرلی تب حضرت نے اعلانیہ مسلم لیگ کی حمایت فرمائی۔ مسلم لیگ نے کانگریس سے علیحدہ ہونے کے بعد پہلا ایکشن جھانسی کے علاقے میں لڑا تھا۔ وہاں کے مسلمانوں نے تار کے ذریعے حضرت تھانویؒ سے پوچھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں میں سے کس کو ووٹ دیا جائے۔ اس وقت تک حضرت کا ذہن مسلم لیگ کی حمایت کے بارے میں واضح نہ تھا۔ بلکہ یہ خدشہ محسوس کرتے تھے۔ کہ یہ لوگ کہیں مصطفیٰ کمال پاشا (ترکی) کی طرح دین کو مسخ نہ کردیں۔ اس لئے تار کا جواب دینے میں تامل تھا۔ آخر آپ کے بھانجے مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے مشورہ دیا۔ آپ کانگریس کی حمایت کے خلاف تو ہیں ہی تامل صرف مسلم لیگ کی حمایت کرنے میں ہے اس لئے آپ یہ جواب دے دیں کہ کانگریس کو ووٹ نہ دیا جائے۔ یہ جواب حضرت نے پسند فرمایا اور اسی

مضمون کا جوابی تار روانہ کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ کہ مسلم لیگ کامیاب ہوگئی۔ الیکشن میں مسلم لیگ کی کامیابی کی خوشخبری دینے کے لئے مولانا شوکت علی اپنے چند ساتھیوں کو لیکر تھانہ بھون آئے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم نے حضرت تھانوی کے جوابی تار کو فتوے کی صورت میں چھپوا کر بڑی تعداد میں تقسیم کرایا اور جگہ جگہ چسپاں کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جو لوگ کانگریس کو ووٹ دینے آئے تھے۔ وہ بھی یہ فتوی دیکھ کر مسلم لیگ کو ووٹ دے گئے۔ جب کانگریس میں مسلمانوں کے بلا شرط داخلے سے خطرناک نتائج سامنے آگئے تو حضرت تھانوی نے مسلم لیگ کی حمایت اور شرکت کی رائے دی آپ کا یہ فتویٰ بنام تنظیم المسلمین شائع ہوا۔ یہ فتویٰ ۹ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ بمطابق ۱۰ فروری ۱۹۳۸ء کا تحریر شدہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ کی دینی حالت درست کرنے کیلئے حضرت تھانویؒ مختلف اوقات' مقامات میں مسلم لیگ کے زعماء کے پاس اپنی طرف سے وفود بھیجتے رہے' مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس پٹنہ منعقدہ ۲۶ دسمبر ۱۹۳۸ء کو حضرت نے ایک تبلیغی وفد روانہ فرمایا۔ اس وفد نے قائداعظم کو نماز کی تلقین کی اس کا اثر یہ ہوا۔ کہ مسلم لیگ کا اجلاس دو بجے یہ کہہ کر ملتوی کر دیا گیا۔ کہ سب صاحب نماز پڑھیں' قاضی شہر کی امامت میں قائداعظم سمیت تقریباً" کوئی ایک لاکھ افراد نے نماز ادا کی۔ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اس وفد کے امیر تھے' حضرت تھانویؒ کی ہدایت کے مطابق انہوں نے قائداعظم سے ملاقات میں کہا کہ مسلمان ایک دینی قوم ہے جب تک دین کو سیاست سے نہ ملایا جائیگا کامیابی نہ ہوگی' آپ بھی مسلم لیگ کو دین میں شامل کریں' قائداعظم نے یہ خیال ظاہر کیا کہ سیاست کو دین سے علیحدہ ہی رکھنا چاہئے مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے جواب دیا۔ یہ تو یورپ کی سیاست ہے۔ اسلامی سیاست یہ ہے کہ خلیفہ اسلام بیک وقت قائد حرب بھی تھا اور نماز کا امام بھی جب تک مسلمان مسلمان رہے یہی صورت رہی اور جب سے سیاست نے دین کو چھوڑا مسلمان کا تنزل شروع ہوگیا۔ ترکی کے مصطفیٰ کمال نے دین کو چھوڑا تو سلطنت مختصر ہو کر رہ گئی افغانستان کے امان اللہ خان نے دین کو خیرباد کہا تو اسے قوم نے الگ کر دیا۔ قائداعظم پر ان کلمات کا یہ اثر ہوا کہ اگلے دن کھلے اجلاس میں اعلان کر دیا کہ اسلام عقائد و عبادات معاملات' اخلاق اور سیاست کا مجموعہ ہے۔ قرآن مجید نے سب کو ساتھ ساتھ بیان کیا ہے۔ اس لئے سیاست کے ساتھ دین کو بھی لینا چاہئے۔ قائداعظم کی یہ تقریر دہلی کے اخبار "

الامان" نے اس شہ سرخی کے ساتھ شائع کی تھی۔ مولانا حکیم الامت تھانویؒ کی روحانیت کی تاثیر اور قائداعظم کی تقریر'

(اشرف المقالات)

تخیل پاکستان

داستان پاکستان

پاکستان کے لفظ سے دنیا پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۳۰ء میں چودھری رحمت علی ہوشیار پوری کی زبانی آشنا ہوئی۔ جبکہ چند نوجوانوں کو لندن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شمالی ہند کے ایک حصہ کو ہندوستان سے الگ کیا جائے۔

ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قیام کا خیال علامہ اقبال نے مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں اپنے خطبہ صدارت کے دوران میں ظاہر کیا۔ جس کا ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے تاریخی اجلاس میں ملی نصب العین کے طور پر ایک قرار داد کے ذریعہ باقاعدہ مطالبہ کیا گیا۔ مگر علامہ اقبال کے خطبہ اور لاہور قرارداد میں لفظ پاکستان کہیں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ اسے ہندو اور برطانوی پریس نے تمسخر اور استہزاء کے طور پر اچھالا۔ جو قائداعظم کی کوششوں سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو حقیقت بن کر منصۂ شہود پر آگیا۔

تاریخی مغالطہ

اسلامی سلطنت کے قیام کا جو خیال علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے متذکرہ بالا اجلاس میں پیش کیا تھا۔ بالکل وہی خیال ان سے بہت پہلے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اپنی مجلس عام میں کئی بار ظاہر فرما چکے تھے۔ بلکہ اس کا مکمل خاکہ اور حصول کا پروگرام بھی بنا چکے تھے۔ جون ۱۹۲۸ء میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم (جو ابتدا" کانگرس کے بہت بڑے حامی تھے) کے متعمد خاص بلکہ دست راست حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مرید با تمیز مولانا عبدالماجد دریا بادی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں پہلی مرتبہ تھانہ بھون حاضر ہوئے۔ اور اپنی اس اولین ملاقات کا حال اپنی کتاب " نقوش و تاثرات" میں ان الفاظ میں درج کیا۔

"۱۹۲۸ء تھا۔ اور مخاطب روزنامہ "ہمدرد" کا ڈائریکٹر تھا۔ صبح اور دوپہر کی طویل

صحبت میں سیاسی پہلوؤں پر گفتگو آجانا ناگزیر سا تھا۔ گفتگو آئی۔ حضرت نے اتنی معقولیت سے کی کہ ساری بدگمانیاں کافور ہو کر رہیں۔ کون کہتا ہے کہ حضرت گورنمنٹی آدمی ہیں۔ لاحول و لاقوۃ۔ جس نے بھی ایسا کہا جان کر یا بے جانے۔ بہر حال جھوٹ ہی کہا۔ یہ تو خالص مسلمان کی گفتگو تھی۔ مسلمان بھی ایسا جو جوش دینی اور غیرت ملی میں کسی "خلافتی" سے ہرگز کم نہیں۔ پاکستان کا تخیل۔ خالص اسلامی حکومت کا خیال یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں۔ پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان میں پڑیں۔ بس صرف حضرت کو ہم لوگوں کے اس وقت کے طریق کار سے پورا اتفاق نہ تھا۔ لیکن یہ اختلاف کچھ ایسا بڑا اختلاف نہیں۔ نفس مقصد یعنی حکومت کافرانہ سے گلو خلاصی اور دارالاسلام کے قیام میں تو حضرت ہم لوگوں سے کچھ پیچھے نہ تھے۔ عجب نہیں جو کچھ آگے ہی ہوں۔ حضرت کی گفتگو میں جز بالکل صاف تھا۔ حضرت کو حکومت وقت سے جو مخالفت تھی۔ وہ اس کے "کافرانہ" ہونے کی بنا پر تھی۔ نہ کہ اس کے بدیسی یا غیر ملکی ہونے کی بنا پر۔" (نقوش و تاثرات ص ۲۳)

یہ اعتراف و انکشاف ہندوستان کے اس مرد مجاہد کا ہے۔ جو شروع شروع میں سیاسی لحاظ سے حضرت تھانوی کے ہم خیال نہ تھے۔ بلکہ کانگرس کی حامی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ اور آج ارباب کانگرس کو بالخصوص اور عام دنیا کو بالعموم "سچی باتیں" سنانے میں ہندو پاکستان کے اندر اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ممکن ہے آپ کے لئے ان کا یہ انکشاف موجب حیرت ہو۔ کیونکہ یہ بات علامہ اقبال کی اظہار کے پورے پچیس سال بعد منظر عام پر لائی جارہی ہے۔ مگر کسی بات کا علم نہ ہونا اس کے غلط ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔ اور نہ واقعات انسان کی طرح جھوٹ بول سکتے ہیں۔ اور نہ ہی ان کو عقیدت کے پردہ میں زیادہ دیر تک چھپایا جاسکتا ہے۔

حضرت تھانوی ان "رہنماؤں" میں سے نہ تھے جو اپنی "ملکی و ملی خدمات" اور اپنے حقیقت افروز بیانات" اخبارات میں شائع کرانے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ بلکہ وہ تو ایک ایسے رہنما اور مصلح تھے۔ جو انبیائی طریق پر نہایت خاموشی کے ساتھ اصلاح امت اور خدمت خلق میں مصروف تھے۔ جو ایسی خدمات کا اظہار نمود و نمائش اور ریا میں داخل سمجھتے تھے۔ اور اسی لئے وہ اپنی سوانح حیات کا لکھا جانا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ جس کی تفصیل "سیرت کی صورت" میں آچکی ہے۔ مورخ اسلام علامہ سید

سلیمان ندوی کے الفاظ ہیں:

"یہ مرد درویش ایک پرانے قصبہ کی ایک کہنہ مسجد کے ایک گوشہ میں بٹھا ہوا مسلمانوں کے سارے احوال اور ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر نظر ڈال کر حق و باطل نیک و بد اور صحیح و غلط کے درمیان تفرقہ کی لکیر بنانے میں مصروف تھا۔ اس کے سامنے دین کی صحیح تمثال تھی اور اس کو دیکھ دیکھ کر موجودہ زندگی کی تصویر میں جہاں جہاں غلطیاں تھیں وہ ان کے درست کرنے میں مصروف تھا اس نے پوری زندگی اس امر میں صرف کر دی کہ مسلم کی تصویر حیات کو اس شبیہ کے مطابق بنا دے۔ جو دین حق کے مرقع میں نظر آتی ہے۔" (جامع المجددین ص ۲۸)

بنائے پاکستان

مفکر اسلام علامہ اقبال کی لوگوں کے دلوں میں عظمت ان کی اسلام آموز شاعری کی وجہ سے ہے مگر ہمارے دل میں انکی عزت اس نور معرفت کی وجہ سے ہے۔ جو ان کی شاعری کی روح ہے۔ اور جسے وہ اسلامی تعلیمات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اور اس پر انہوں نے اپنے نظریہ پاکستان کی بنیاد رکھی ہے۔ وہ اپنے مذکور الصدر تاریخی خطبہ صدارت میں لگی لپٹی رکھے بغیر اس بات کا صاف طور پر اعتراف کرتے ہیں کہ:

"اسلام پر ابتلاء و آزمائش کا کبھی ایسا وقت نہیں آیا۔ جیسا کہ آج درپیش ہے۔"

اسی ابتلاء کے وہ دو سبب بتاتے ہیں:

الف : "ہندوستان کے مسلمان اس وقت دو عوارض کا شکار ہو رہے ہیں۔ پہلا عارضہ یہ ہے کہ اہم شخصیتوں کا وجود نہیں۔ سر میلکم ہیلی اور لارڈ اروِن کی تشخیص بالکل صحیح تھی۔ جب انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "ملت اسلامیہ نے کوئی راہنما پیدا نہیں کیا۔" راہنماؤں سے میرا مطلب وہ افراد ہیں۔ جن کی اعانت ایزدی یا اپنے وسیع تجربات کی بدولت ایک طرف یہ ادراک حاصل ہو کہ اسلامی تعلیمات کی روح اور تقدیر کیا ہے دوسری طرف ان میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ وہ جدید حوادث کی رفتار کا اندازہ صحت کے ساتھ کر سکیں۔ یہی لوگ ہیں۔ جن پر کسی قوم کی قوت عمل کا انحصار ہوتا ہے۔

ب : دوسرا مرض جو مسلمانوں کے اندر گھر کر چکا ہے۔ یہ ہے کہ ان میں اطاعت

کا مادہ نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آج متعدد افراد اور متعدد جماعتیں الگ الگ راہوں پر گامزن ہیں۔ اور اس سے قوم کے عام افکار اور اس کی عام سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا"۔

اس ابتلاء سے بچنے کی وہ یہ صورت بتلاتے ہیں:

"مسلمانانِ ہند اس وقت اپنی زندگی کے نازک دور میں سے گزر رہے ہیں۔ اس کیلئے کامل تنظیم اور اتحاد عزائم و مقاصد کی ضرورت ہے (کیونکہ) ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے۔ یہ ہے کہ آڑے وقتوں میں اسلام ہی نے مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا ہے۔ مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی۔ اگر آج اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اسکے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سرنو جمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔"

اسی لئے وہ اکابر قوم کو دعوت دیتے ہیں کہ:

"تمام سربر آوردہ مسلمانوں کا خواہ ان کے خیالات کچھ بھی ہوں۔ فرض ہو گا کہ وہ ایک جگہ جمع ہوں اور صرف قراردادیں منظور نہ کریں۔ بلکہ اپنے مقاصد میں کامیابی کے حصول کے لئے مسلمانوں کے لئے کوئی راہ عمل پیش کریں۔"

تاکہ قوم کو اس دور ابتلا و آزمائش سے نکالا جائے۔

راہ عمل

دیکھنا یہ ہے کہ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء سے قبل کسی دوسرے رہنما کو بھی انہی حالات کا احساس ہوا اور اس نے قوم کے سامنے کوئی ایسی راہ عمل پیش کی جس کے لئے علامہ اقبال نے اکابر قوم کو دعوت دی تھی۔ اس سوال کا جواب ہمیں حضرت تھانویؒ کے ایک ملفوظ اور ایک مکتوب سے ملتا ہے۔

عین اس زمانہ میں جبکہ جنگ پاکستان شباب پر تھی اور اطراف و اکناف ہند سے روزانہ دربار اشرفیہ میں لیگی اور غیر لیگی حضرات کی طرف سے رہنمائی کی درخواستیں پہنچ رہی تھیں۔ حضرت تھانوی سے سوال کیا گیا۔ وہ کون سے اسباب ہیں کہ جن کو اختیار کرنے سے مسلمان موجودہ پستی اور تنزل سے نجات حاصل کر سکتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ:

بفضلہٖ تعالیٰ ایسی تدابیر موجود ہیں اور ان کو ضبط کر کے رفاہ عامہ کے لئے شائع بھی کر دیا گیا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ ہوا کہ میں نے مسلمانوں کی موجودہ تباہی و بربادی سے بے چین ہو کر دو کتابیں تصنیف کی تھیں۔ جن سے ایک کا نام ----- صیانۃ المسلمین ہے اور دوسری کا نام حیات المسلمین۔ ان دو کتابوں کے اندر میں نے ان مصائب کا جو اس وقت مسلمانوں پر آرہے ہیں۔ پورا پورا علاج کر دیا ہے۔ مسلمان پہلے ان ہی دو کتابوں پر پورا پورا عمل کر کے دیکھیں کہ ان کو کتنا نفع ہوتا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ عمل تو کرتے نہیں۔ پس شکایت کرتے ہیں کہ علماء ہماری طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ہماری رہبری نہیں کرتے۔"

(ملفوظ نمبر ۳۰ از ملفوظات حصہ ششم)

مسلم لیگ کا دعوت نامہ

۲۳ تا ۲۶ اپریل ۱۹۴۳ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا دہلی میں اجلاس شروع ہونے والا تھا۔ اس تاریخی اجلاس میں شرکت کے لئے ارکان مسلم لیگ نے حضرت تھانوی کی خدمت میں ایک خصوصی دعوت نامہ بھیجا تاکہ آپ آکر ہمیں ہدایات دیں۔ جس کے الفاظ یہ تھے:

"آپ اس موقع پر خود دہلی تشریف لاکر اپنے ارشادات سے مجلس کو ہدایت دیں تو بہتر ہو۔ لیکن اگر حضور تشریف نہ لاسکیں۔ تو اپنے نمائندہ کو بھیج کر مشکور فرماویں اور دعا فرماویں کہ اللہ پاک اس اجتماع کے رعب سے غیر مسلموں کے دلوں کو مسحور کر دے اور ہمارا مطالبہ پاکستان منوادے۔ تاکہ سلطنت اسلامی قائم ہوسکے۔ الخ (خاتمہ السوانح ص ۸۵)

یہ حضرت تھانوی کی وفات سے تین ماہ قبل کا واقعہ ہے۔ جبکہ آپ ضعف اور مرض کی شدت میں مبتلا تھے۔ اس لئے بہ امر مجبوری آپ نے شرکت اجلاس سے معذوری ظاہر کرتے ہوئے ان کو یہ تاریخی خط لکھا:

حضرت تھانوی کا جواب

ازنا کارہ۔ آورہ۔ ننگ انام ۔ اشرف برائے نام
بخدمت ارکان مسلم لیگ نصرہم اللہ و نضر ہم اللہ
"السلام علیکم ۔ لیگ کے عزائم معلوم کرکے اس آیت پر عمل کی توفیق ہوئی۔
قل بفضل اللہ و برحمتہ فبذلک فلیفرحوا
لیکن اس کے ساتھ ہی عذر نہ ہوتا۔ تو اس آیت پر بھی عمل ہوتا۔
انفروا خفافاً و ثقالاً
لیکن عذر کے سبب اس رخصت پر عمل کی اجازت مل گئی۔
لیس علی الضعفاء ولا علی المرضٰی ولا علی الذین لا یجدون ماینفقون حرج اذا نصحوا للہ و رسولہ
لیکن اس کے ساتھ ہی اس آیت کا شرف حاصل ہوگیا۔ کہ اپنی دو کتابوں کا پتہ دیتا ہوں۔ جو انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے پیام عمل ہے۔ ایک حیات المسلمین۔ شخصی اصلاح کیلئے۔ دوسری صیانۃ المسلمین۔ جمہوری نظام کے لئے۔ ان کے مضامین اپنے موضوع میں گو رنگین نہیں مگر سنگین ہیں۔ جن میں وہی فرق ہے جو ذوق و غالب کے اشعار میں اور حکیم محمود خاں۔ حکیم محمد صادق خاں کے نسخوں میں۔ اور نمائندہ وہ کام نہیں کرسکتا۔ جو یہ کتابیں کر سکتی ہیں مگر عمل شرط ہے۔ جیسے اعلیٰ درجہ کاماء اللحم بوتلوں میں بھرا ہوا قیمتی ہے۔ مگر نتیجہ خیز نہیں۔ اس کا نفع اس وقت ظاہر ہوگا۔ جب حلق سے اترے گا۔ ورنہ بدون عمل یہ سب کوششیں اس کا مصداق ہوں گی۔ نشستند و گفتند و برخاستند۔ باقی دعا ہر حال میں خصوص ان تاریخوں میں زیادہ اہتمام سے جاری رکھوں گا۔ بقول کسی شاعر کے

لاخیل عندک تھدیھا ولا مال
فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال

ترجمہ: یعنی تیرے پاس امداد کرنے کے لئے گھوڑے ہیں نہ مال ہے ایسی حالت میں

تیزی زبان (نطق) تو کام دیتی ہے۔
نوٹ : میں دونوں کتابیں اگر یہاں مل گئیں۔ تو ۲۲ اپریل کو ڈاک سے ہدیتہ" روانہ کردوں گا۔ ورنہ دہلی کے کسی کتاب خانہ تجارتی سے تلاش کی جائیں۔ والسلام
بعد تحقیق معلوم ہوا کہ حیاۃ المسلمین یہاں نہیں ہے لہٰذا وہاں تلاش کرائی جائے۔" (احقر اشرف علی تھانہ بھون (بحوالہ صدر)

یہ دونوں کتابیں اسی دعوت کی داعی ہیں جو حضرت تھانوی نے مسلم لیگ کو ۱۹۳۸ء میں اپنے پیغام میں دی تھی کہ:

"جنگ آئینی ہو یا غیر آئینی۔ مسلمانوں کو بجز خدا کے کسی کی امداد کی ضرورت نہیں۔ اور امداد الٰہی کی شرط احکام الٰہی کی پابندی ہے جس کا سینکڑوں برس تک تجربہ کیا جاچکا ہے۔ جب تک مسلمان سچ مچ مذہبی دیوانے بنے رہے۔ دنیا ان کی جوتیوں سے لگی رہی اور جوں جوں اس میں کمی آتی گئی۔ مسلمان ترقی سے محروم ہوتے گئے۔ (آثار رحمت ص ۱۰۹)

وحدت خیال

ارباب مسلم لیگ نے اسلامی سلطنت قائم کرنے کے سلسلہ میں حضرت تھانوی سے جو ہدایات طلب کیں۔ ان کے جواب میں حضرت تھانوی اپنی دو مذکورۃ الصدر کتابیں پیش کرتے ہیں۔ جو

الف ۔ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے پیام عمل ہیں۔ اور
ب ۔ جن میں وہ راہ عمل مذکورہ ہے۔ جس کے متعین کرنے کے لئے علامہ اقبال نے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو اکابر قوم کو سر جوڑ کر بیٹھنے کی دعوت دی تھی۔
ج ۔ جو انہی حالات سے متاثر ہو کر لکھی گئیں۔ جن کا علامہ اقبال نے مذکورہ بالا تاریخ کو لیگ کے تاریخی اجلاس میں اظہار کیا تھا۔ جیسا کہ ان کتابوں کے دیباچوں کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہے۔

حیات المسلمین کے دیباچہ میں آپ لکھتے ہیں:
"اس وقت مسلمانوں پر علم میں عموما" اور کشور ہند میں خصوصا" مصیبتوں پر مصیبتیں اور بلاؤں پر بلائیں نازل ہوتی چلی جارہی ہیں۔= مگر نہ ان کی طرف ان کے

ذہن کو مطلق التفات ہوتا ہے نہ ان کی زبان پر اس کا نام آتا ہے۔ نہ ان کے قلم سے یہ مضمون نکلتا ہے۔ اگر کسی کو علاج و تدبیر کی طرف توجہ ہوتی ہے تو وہ نسخے استعمال کئے جاتے ہیں۔ جن کے متعلق بے تکلف یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ مرض کے خلاف ہوتے ہیں۔ جو مزاج میں بجائے درستی کے نادرستی پیدا کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ان مصائب کی تشخیص میں ان کو نصوص الہیہ و نبویہ (قرآن و حدیث) کی پوری تصدیق نہیں ہوتی۔"

صیانتہ المسلمین کے شروع میں درج ہے کہ۔

"ہمارے بھائیوں میں اجتماعی۔ اتفاق۔ تنظیم قریب قریب مفقود ہے۔ اس لئے ہر مسلمان بجائے خود اپنے کو تنہا دیکھ کر اپنے ضعف سے پریشان ہے۔ ورنہ اہل باطل کے مقابلہ میں اہل حق کی پریشانی کا احتمال ہی نہیں ہو سکتا اور اگر کہیں برائے نام تنظیم ہے تو اس سے محض اغراض دنیویہ مقصود ہیں۔ بلکہ اکثر تودین کو ان اغراض میں مخل سمجھ کر اس سے اعراض کرتے ہیں۔ مسلمانان ہند جن پریشانیوں میں مبتلا ہیں ان میں دو طریق مشروع ہیں۔ ایک ضعفاء کے لئے کہ سکوت محض سے کام لیں۔ نہ حفاظت کا کوئی سامان کریں۔ نہ مدافعت کا اہتمام کریں۔ دوسرا قریاء کے لئے کہ حفاظت و مدافعت کی تدبیر کریں اپنے لئے بھی اور اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے بھی۔"

اسی زمانہ اشاعت صیانتہ المسلمین میں آپ نے فرمایا:

"کانگرس ایک منظم جماعت ہے اور اہل حق کی کوئی منظم جماعت نہیں۔ ہر شخص تنہا ہے اس لئے ہر شخص خوف زدہ ہے۔ ضرورت اسکی ہے کہ اہل حق کے اندر ایک جماعت ایسی منظم ہو جو ان ظالموں (ہندوؤں) کو دفع کر سکے (کیونکہ) ان لوگوں کی اتنی جرات بڑھ گئی ہے کہ بعض مقامات پر مسلمانوں پر یہ لوگ چڑھ آئے ہیں اور حملہ کر دیا۔ حالانکہ مسلمان کا کوئی قصور نہ تھا بیچارے مسلمان حیران و پریشان تھے اور کچھ نہ کر سکے۔ اس لئے مسلمانوں کو ضرور اپنی حفاظت کا سامان کرنا چاہئے۔ ورنہ ان لوگوں کی جرات بڑھ گئی۔ تو پھر مسلمانوں کا جان و مال سب خطرہ میں ہے مگر اب مشکل یہ ہے کہ ایسی منظم جماعت آئے کہاں سے۔" (جمہوری نظام ص ۲۵۔۲۶)

حیاۃ المسلمین اور صیانتہ المسلمین کی ان وجوہ تصنیف کو اگر علامہ اقبال کے ان ارشادات کے آئینہ میں دیکھا جائے جو شروع میں نقل کئے گئے ہیں۔ تو یہ دونوں حکمائے امت تشخیص مرض اور تجویز علاج میں متفق اللسان نظر آتے ہیں۔ فرق صرف

اتنا ہے کہ حضرت تھانوی جن خطوط پر مسلمانوں کی بہبودی اور مستقبل کے متعلق راہ عمل تجویز کر چکے تھے۔ اس کی طرف علامہ اقبال کا ذہن بعد میں کار فرما ہوا۔

اس مرحلہ پر یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ حضرت تھانوی جن خطرات کو جولائی ۱۹۳۰ء میں دیکھ رہے ہیں۔ قوم نے انکا خونین نظارہ پورے سترہ سال بعد اگست ۱۹۴۷ء میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

شرف اولیت

اب صرف یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ حضرت تھانوی نے اپنی جن دو کتابوں کو حصول پاکستان اور بقائے پاکستان کے لئے بطور راہ عمل میں پیش کیا ہے۔ وہ کب منظر عام پر آئیں۔

ملکی اور ملی حالات کے برسوں مشاہدہ اور جائزہ کے بعد حضرت تھانویؒ نے مسلمانوں کی شخصی اصلاح کیلئے وسط ۱۹۲۵ء سے حیاۃ المسلمین لکھنی شروع کی جو اڑھائی سال میں لکھی گئی۔ اور مورخہ ۲۷ نومبر ۱۹۲۷ء کو جیسا کہ اسکے دیباچہ کی تاریخ سے ظاہر ہے) مکمل ہو کر ۱۹۲۸ء کے آغاز میں شائع ہوئی۔ صیانۃ المسلمین جو جمہوری نظام کے متعلق تھی۔ جولائی ۳۰ء میں شائع ہوئی۔ جیسا کہ اس کے اختتامی نوٹ کی تاریخ سے ظاہر ہے۔

یہ تاریخیں صاف بتلا رہی ہیں کہ جن مصائب کا علاج حضرت تھانوی ۱۹۲۸ء یا جولائی ۱۹۳۰ء میں تجویز فرما چکے تھے انہی مصائب کا علاج سوچنے کے لئے علامہ اقبال ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو اکابر قوم کو دعوت دے رہے تھے۔

نظام پاکستان کا خاکہ

اس مرحلہ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت تھانوی بھی ویسا ہی نظام پاکستان چاہتے تھے۔ جس کا نقشہ علامہ اقبال اور قائداعظم نے اپنے خطابات و اعلانات میں پیش کیا تھا اور جس کا قوم آج تک مطالبہ کر رہی ہے۔

اس سوال کا جواب حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کی اس اولین ملاقات کی تفصیل سے ملتا ہے جو انہوں نے جون ۱۹۲۸ء میں حضرت تھانویؒ سے کی اور جس کے ضمن میں انہوں نے لکھا کہ:

"پاکستان کا تخیل خالص اسلامی حکومت کا خیال یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان میں پڑیں۔ حضرت کی گفتگو میں یہ جزو بالکل صاف تھا۔" (نقوش و تاثرات ص ۲۳)

ہماری درخواست پر اس "بالکل صاف جزو" کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا دریا بادی اپنے گرامی نامہ مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۵۵ء میں لکھتے ہیں کہ:

"حضرت کو بعض معاصر علماء کی طرح "جنگ آزادی" "جنگ حقوق" "آزادی وطن" وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ انکے سامنے مسئلہ سیاسی نہیں۔ تمام تر دینی تھا۔ وہ صرف اسلام کی حکومت چاہتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں جب پہلی بار حاضری ہوئی۔ تو اس ملاقات میں حضرت نے دارالاسلام کی اسکیم خاصی تفصیل سے بیان فرمائی تھی۔ کہ جی یوں چاہتا ہے کہ ایک خطہ پر خالص اسلامی حکومت ہو۔ سارے قوانین تعزیرات وغیرہ کا اجراء احکام شریعت کے مطابق ہو بیت المال ہو۔ نظام زکوۃ رائج ہو۔ شرعی عدالتیں قائم ہوں۔ وقس علی ہذا۔ دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے یہ نتائج کہاں حاصل ہوسکتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے تو صرف مسلمانوں ہی کی جماعت ہونی چاہئے۔ اور اسی کو یہ کوشش کرنی چاہئے۔"

گویا دربار اشرفیہ میں حصول و بقا پاکستان کا لائحہ عمل اور نظام پاکستان کا پورا نقشہ اس وقت پیش ہوا۔ جبکہ پاکستان چاہنے والوں کو ابھی اس کا خواب و خیال بھی نہ تھا۔ پھر لطف یہ ہے کہ حضرت تھانوی نے اپنے دارالاسلام کا جو نقشہ پیش کیا تھا۔ قائداعظم

بھی اسی کے مطابق نظام پاکستان بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۱ء میں قائداعظم جب حیدر آباد تشریف لے گئے۔ تو ان سے "اسلامی حکومت" کی وضاحت چاہی گئی۔ انہوں نے اس سوال کے جواب میں نوجوان طلباء کو بتایا کہ:

"اسلامی حکومت کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہئے۔ کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ جس کے لئے تعمیل کا مرکز قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی و پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔" (حیات قائداعظم ۴۲۸)

غرضیکہ

۱۔ انہی اصولوں پر قائداعظم نے پاکستان کی جنگ لڑی۔

۲۔ انہی اصولوں کی حکومت کیلئے قوم نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔ جو جنگ پاکستان کے ہر مرحلہ پر پوچھتی تھی کہ پاکستان کا مطلب کیا؟

تو اسے جواب دیا جاتا تھا۔ لا الہ الا اللہ

۳۔ انہی اصولوں کے مطابق (دربار اشرفیہ کے فیض یافتہ) شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی کوششوں سے "قرار داد مقاصد" پیش ہوئی۔

۴۔ انہی اصولوں پر مجلس دستور ساز نے نظام مملکت کی بنیاد رکھی کہ آئندہ کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جائے گا۔ جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ اور

۵۔ انہی اصولوں کی تعلیم مجلس دستور ساز نے مملکت کے مسلمانوں کے لئے لازمی قرار دی تھی۔ اور

۶۔ انہی اصولوں پر چلنے میں پاکستان کے بقاء کا راز مضمر ہے۔

عملی جدوجہد

حضرت تھانویؒ نے حصول پاکستان کے لئے راہ عمل یہ نظام پاکستان کا خاکہ پیش کرنے پر ہی اکتفا نہ فرمایا تھا۔ بلکہ اس کے لئے عملی جدوجہد بھی اسی زمانہ سے شروع کردی تھی۔

۱۔ سب سے پہلے آپ نے ہی ہندوستان میں اسلامی قوانین رائج کرنے کی مہم شروع کی تھی۔ جس کی تفصیل آپ کو "آئینی سرگرمیوں" کے باب میں ملے گی۔

۲۔ سب سے پہلے کانگرس کے خلاف اور مسلم لیگ کی حمایت میں جماعت علماء میں سے دربار اشرفیہ ہی سے اعلان جاری ہوا۔ جس کی تفصیل آپ کو "سیاسی کشمکش" کے باب میں ملے گی۔

۳۔ سب سے پہلے حضرت تھانوی نے مسلم لیگ کی تطہیر اور قائداعظم میں تدین پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جس کی تفصیل اگلے باب میں ملے گی۔ اور

۴۔ سب سے پہلے حصول پاکستان کے لئے جہاد کی تیاری بھی حضرت تھانوی نے فرمائی جسکی تفصیل درج ذیل ہے۔

جہاد کی تیاری

حضرت مولانا جلیل احمد صاحب علی گڑھی لکھتے ہیں کہ:

"احقر بعونہ تعالیٰ تقریباً" تیرہ چودہ سال مستقل طور پر محی السنت حکیم الامت مجدد الملت مرشدی حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہ کے دربار گھربار میں رہا اس عرصہ میں احقر نے وقتاً" فوقتاً" خود اس کا مشاہدہ کیا کہ جب مسلمانوں پر کفار کے ظلم و ستم کا بیان ہوتا۔ تو حضرت حکیم الامت پر ایک خاص کیفیت کا ورود و مشاہدہ کیا جاتا۔ آنکھیں سرخ نظر آنے لگتیں۔ اور حاضر باش کو بداھتہ" محسوس ہوتا تھا کہ حضرت بے چینی کے ساتھ کسی چیز کے متمنی اور کسی وقت کے منتظر ہیں۔ ایک بار قرب و جوار کے ایک مسلمان نے اپنی کسی مستعدی کا اظہار کیا۔ مسکرا کر فرمایا کہ اچھا اگر ضرورت ہوئی۔ تو تم سے جہاد کا کام لیں گے۔ اسی طرح ایک بار صوبہ سرحد کے ایک والی ریاست نے دوستانہ تعلقات کو وسیع کرنا چاہا۔ تو حضرت نے اس سے عذر فرمایا۔ مگر یہ بھی فرمایا کہ ہاں وقت آئے گا۔ تو آپ سے جہاد کا کام لیا جائیگا۔" (آثار رحمت ص ۱۰۷)

مرکز اور امام کی ضرورت

جہاد خواہ کسی نوع کا ہو۔ اس کے لئے مرکز اور امیر کا ہونا بڑا ضروری ہے۔ جس کے لئے حضرت تھانوی بڑے متفکر تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں جب مسلم لیگ کے نام آپ کے تاریخی پیغام کا مسودہ تیار کیا گیا تو مسودہ تیار کرنے والے مولوی صاحب نے اس میں ایک یہ فقرہ بھی لکھ دیا تھا کہ لوگوں کو جب نماز روزہ کی ترغیب دی جاتی ہے۔ تو یورپ زدہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ خالی نماز روزہ سے کیا ہوتا ہے تو اس فقرہ کی تصحیح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

"جیسے یہ غلط ہے کہ نماز و روزہ کو کامیابی سے کیا دخل ہے۔ اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ خالی نماز روزہ کامیابی کے لئے کافی ہے۔ بلکہ دلائل اس کے شاہد ہیں کہ خالی نماز روزہ سے کبھی کامیابی نہیں ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ بلکہ ایک دوسری چیز کی

بھی ضرورت ہے۔ اور وہ چیز قتال جہاد ہے۔ کیا مکہ میں نماز روزہ نہ تھا۔ بھلا صحابہؓ سے بڑھ کر نماز روزہ کس کا ہوسکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود دیکھ لیجئے کہ مکہ کے اندر مسلمان اتنے دنوں تک رہے۔ لیکن غلبہ نہ ہوا۔ جب ہجرت ہوئی۔ قتال ہوا اس وقت غلبہ حاصل ہوا۔ تمام تاریخ اسلامی اٹھاکر دیکھ لو۔ کہیں اس کی نظیر نہ ملے گی کہ خالی نماز روزہ سے مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا ہو۔ البتہ ضروری نماز روزہ بھی ہے۔ غلبہ کی حیثیت سے نماز روزہ اور قتال میں فرق یہ ہے کہ اگر نماز روزہ تو شرط ہے غلبہ کی۔ اگر نماز روزہ اور اطاعت ہوگی۔ تو غلبہ ہوگا اور جہاد علت ہے غلبہ کی۔ گو نماز روزہ فرض عین ہے۔ اور جہاد فرض کفایہ ہے۔ مگر غلبہ کی علت جہاد ہی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ مسلمانوں کا غلبہ دونوں ہی چیزوں پر موقوف ہے۔ اور یہ میری رائے آج سے نہیں ہمیشہ سے ہے کہ جب تک طاعت کے ساتھ قتال نہ ہو گا۔ اس وقت تک مسلمانوں کو فلاح میسر نہیں ہوسکتی۔ اور جہاد کے لئے مرکز ضروری ہے۔ لہٰذا سخت ضرورت ہے کہ مسلمانوں کا کوئی مرکز قائم ہو۔ دوسری چیز یہ ہے کہ کوئی امیر المومنین ہو اور جس کو امیر المومنین بنایا جائے۔ اس کے اندر تین صفات ہوں۔ ایک تدین یعنی وہ دین دار ہو۔ دوسرے وہ سیاست سے واقف ہو اور تیسرے اس کے اندر ہمت ہو۔ اب مشکل یہ ہے کہ بعض کے اندر تدین تو ہے مگر سیاست سے واقفیت نہیں اور بعض کے اندر ہمت نہیں۔"

(آثار رحمت ص ۱۰۴)

چونکہ قائداعظم کے اندر سیاست بھی تھی اور ہمت بھی۔ اس لئے آپ نے ان میں تدین پیدا کرنے کی طرف فوری توجہ مبذول فرمائی۔ تاکہ وہ ان تمام ضروری صفات سے متصف ہو جائیں جو ایک امیر المومنین کے لئے ضروری ہیں۔

حضرت تھانویؒ کی یہ تمام جدوجہد ۱۹۴۰ء میں لاہور کے تاریخی اجلاس کے اندر قرار داد پاکستان پاس کرنے سے پہلے ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت تھانوی نے نہ صرف سب سے پہلے پاکستان کا تخیل پیش کیا۔ بلکہ اسکے حصول کیلئے عملی جدوجہد کرنے والوں میں بھی آپ کا درجہ السابقون الاولون کا ہے۔

(سیرت اشرف از منشی عبدالرحمٰن خاں)

اصلاح معمار پاکستان

احساس تبلیغ

حضرت تھانویؒ کو جنہوں نے سب سے پہلے نظریہ پاکستان پیش کیا تھا۔ فراستہً معلوم ہوگیا تھا کہ پاکستان ایک نہ ایک دن معرض وجود میں آکر رہے گا۔ جس کے حصول کا سہرا قائداعظم کے سر ہوگا۔ مگر قائداعظم انگریزی ماحول میں تعلیم و تربیت پانے کی وجہ سے دین کی تعلیم سے کما حقہ' واقف نہ تھے اور نہ ہی ان کے رفقاء کار دیندار قسم کے لوگ تھے۔ اس لیے حضرت تھانویؒ نے محسوس کیا کہ جنگ پاکستان لڑنے والوں کو دین کی تبلیغ کی جائے اور انہیں کتاب و سنت کی پیروی کی تلقین کی جائے۔

اس غرض کے لیے آپ نے مئی ۱۹۳۸ء میں مولانا شبیر علی صاحبؒ مہتمم خانقاہ امدادیہ کو بلایا اور ان سے فرمایا کہ:

"میاں شبیر علی ہوا کا رخ بتا رہا ہے کہ لیگ والے کامیاب ہو جاویں گے اور بھائی جو سلطنت ملے گی۔ وہ ان ہی لوگوں کو ملے گی۔ جن کو آج سب فاسق فاجر کہتے ہیں۔ مولویوں کو تو ملنے سے ہی رہی۔ لہٰذا ہم کو یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ لوگ دیندار بن جاویں۔ اور بھائی آج کل کے حالات ایسے ہیں کہ اگر سلطنت مولویوں کو مل بھی جائے تو شاید مولوی چلا بھی نہ سکیں۔ یورپ والوں سے معاملات ساری دنیا سے جوڑ توڑ ہمارے بس کا کام نہیں اور یہ سچ تو یہ ہے کہ سلطنت کرنا دنیاداروں ہی کا کام ہے۔ مولوی کو یہ کرسیاں اور تخت زیب بھی نہیں دیتا اگر تمہاری کوشش سے یہ لوگ دیندار اور دیانتدار بن گئے اور پھر سلطنت ان ہی کے ہاتھ میں رہی۔ تو چشم ماروشن و دل ماشاد۔ کہ ہم خود سلطنت کے طالب ہی نہیں۔ ہم کو تو صرف یہ مقصود ہے کہ جو سلطنت قائم ہو۔ وہ دیندار اور دیانت دار لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔ اور بس تاکہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو۔"

(تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی ص ٦٦)

مولانا شبیر علی صاحب نے یہ سن کر عرض کیا کہ پھر تبلیغ نیچے کے طبقہ یعنی عوام سے شروع ہو۔ یا اوپر کے طبقہ یعنی اخواص سے؟ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ:
"اوپر کے طبقہ سے؟ کیونکہ وقت کم ہے۔ خواص کی تعداد کم ہے اور النّاس علیٰ دین ملوکھم اگر خواص دیندار اور دیانت دار بن گئے۔ تو انشاء اللہ عوام کی بھی اصلاح ہو جائے گی۔"

تبلیغی ہدایات

۴ ۔ جون ۱۹۳۸ء کو بمبئ میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہونے والا تھا۔ جس میں اکابر لیگ نے جمع ہونا تھا۔ اس لیے حضرت تھانویؒ نے وہاں ایک تبلیغی وفد بھیجنے کا فیصلہ فرمایا اور علامہ شبیر احمد عثمانی کو اس کا امیر الوفد مقرر کر کے مولانا شبیر علی صاحب تھانوی اور مولانا عبدالکریم گمتھلویؒ ارکان وفد کو مولانا عثمانی کے نام ایک خط دے کر ان کے پاس دیوبند روانہ کیا۔ تاکہ وہاں سے وہ انہیں ہمراہ لے کر آگے روانہ ہو جائیں۔ آپ نے مولانا شبیر علی صاحب کو قائداعظم سے گفتگو کرنے کے لیے حسب ذیل ہدایات دیں۔

"جناح صاحب سے جو باتیں کرنی ہیں۔ وہ میں نے مولانا شبیر احمد کو خط میں لکھ دی ہیں۔ وہ امیر الوفد بھی ہیں اور گفتگو کا سلیقہ بھی ان کو بہت بہتر آتا ہے۔ لیکن اگر کسی سے گفتگو کا تم کو اتفاق ہو جائے۔ تو گفتگو میں اس کا لحاظ رکھنا کہ گفتگو نرم لہجہ میں ہو اختلافی مسائل درمیان میں بالکل نہ آویں۔ اگر مخاطب اختلافی مسائل درمیان میں لانا چاہے تو بہ لطائف الحیل اس سے گریز کرنا۔ اور دوسری گفتگو شروع کر دینا اگر مخاطب کے کسی عمل کے متعلق کچھ تنقید کرنا ہو۔ تو لہجہ تنقیدی نہ ہو بلکہ ہمدردانہ اور تبلیغی ہو۔ الفاظ بھی نرم ہوں اور کلموا الناس علی قدر عقولھم کو مد نظر رکھتے ہوئے جواب ایسا دینا جس کو مخاطب آسانی سے سمجھ سکے۔ جس کی میں ایک مثال دیتا ہوں۔ کہ میں فتح پور ہسوہ سے الہ آباد جا رہا تھا۔ ریل میں کچھ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوان ہم سفر ہو گئے۔ مجھے وہ پہچانتے نہ تھے۔ مگر صورت سے مولوی سمجھ کر پوچھنے لگے کہ مولانا شریعت نے کتا پالنا کیوں منع کیا ہے۔ حالانکہ اس میں تو بہت سی صفات اچھی ہیں۔ وہ زمانہ تھا جب قومی ہمدردی کا علی گڑھ میں بہت زور تھا۔ میں اگر ان کے

سامنے شرعی مسائل بیان کرتا اور اللہ و رسول کے احکام بیان کرتا تو بحث کا دروازہ کھل جاتا۔ اور وہ مقصد کہ ان کے دل میں کتے کے پالنے کی برائی بیٹھ جائے۔ حاصل نہ ہوتا اس لیے میں نے کہا کہ کتے میں ساری صفات مسلم مگر ایک عیب ایسا ہے کہ سب صفات پر پانی پھیر دیتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مولانا وہ عیب کیا ہے؟ تو میں نے کہا کہ اس میں قومی ہمدردی نہیں۔ اپنی قوم کے کسی فرد کو دیکھتا ہے۔ تو فوراً لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اس پر وہ سب نوجوان بہت خوش ہوئے۔ اور کہنے لگے کہ واقعی یہ جنس پاس رکھنے کے قبل نہیں ہے۔ ورنہ ہم میں بھی یہ اثر آوے گا۔ تو یہاں اس کا لحاظ رہے کہ مقصد ہاتھ سے نہ جائے۔ لیکن مخاطب کے فہم کا ضرور لحاظ رہے۔"
(بحوالہ صدر ص ۷۲۔۷۳)

تبلیغی وفود

جب یہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی خدمت میں پہنچے۔ تو ان کی والدہ صاحبہ سخت بیمار تھیں۔ اس لیے انہوں نے روانگی سے عذر کر دیا۔ اور چونکہ کوئی دوسرا امیر الوفد نہ مل سکا۔ جو قائداعظم سے گفتگو کر سکتا۔ اس لیے یہ وفد روانہ نہ ہوسکا۔

دسمبر ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بمقام پٹنہ ہونا قرار پایا۔ اس اجتماع سے فائدہ اٹھانے کے لیے حضرت تھانوی نے دوسرا وفد تیار کیا۔ جو مولانا شبیر علی صاحب تھانوی۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی۔ مولانا عبدالجبار صاحبؒ ابوہری۔ مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری اور مولانا معظم حسین صاحب امروہوی پر مشتمل تھا جس کے رئیس الوفد مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوریؒ تھے۔ حضرت نے وفد کو اپنے دو رسائل دیئے کہ وہ ممبران لیگ میں تقسیم کیے جاویں اور جو بچ رہیں۔ وہ عوام کو تقسیم کر دیئے جائیں۔ ان میں سے ایک رسالہ میں حضرت تھانوی کا مسلم لیگ کے نام وہ تاریخی پیام تھا۔ جس میں ارباب لیگ کو دینی شعائر اور وضع اسلامی کی پابندی کی تلقین کی گئی تھی۔ جس کی روشنی میں انہوں نے قائداعظم سے گفتگو کرنی تھی۔

وفد نے پٹنہ پہنچنے کے بعد نواب زادہ لیاقت علی خان کی معرفت قائداعظم سے گفتگو کا وقت لیا۔ جو پانچ بجے شام کا مقرر ہوا۔ وقت مقررہ پر ارکان وفد قائداعظم کی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ قائداعظم نے کھڑے ہو کر ارکان وفد سے مصافحہ کیا اور عبدالعزیز

صاحب بیرسٹر پٹنہ نے جن کے قائداعظم مہمان تھے۔ ارکان وفد کا تعارف کرایا۔ اور ایک گھنٹہ تک گفتگو جاری رہی جس میں قائداعظم کو نماز پڑھنے کی تبلیغ کی گئی۔ اور قائداعظم نے فرمایا:۔

"میں گنہگار ہوں۔ خطا دار ہوں۔ آپ کو حق ہے کہ مجھے کہیں۔ میرا فرض ہے کہ اس کو سنوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ نماز پڑھوں گا۔" (بحوالہ صدر)

جس کی تفصیل "مشاہدات و واردات" اور "تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی" میں دیکھی جاسکتی ہے۔ مولانا شبیر علی تھانویؒ اپنی اس پہلی ملاقات کا اثر یوں بیان کرتے ہیں کہ:۔

"میں نے حضرت کی ہدایات کے مطابق ان سے گفتگو کی۔ جناح صاحب نے نہ یہ کہ جوابات تسلی بخش عنایت فرمائے۔ بلکہ ان کے جوابات ایسے تھے کہ ہم سب سے اور خصوصیت سے میں تو بہت متاثر ہوا۔ کیونکہ اگر دوران گفتگو میں ان کے کسی دینی عمل کی کوتاہی کے متعلق عرض کیا گیا۔ تو بغیر کسی تاویل یا حجت کے انہوں نے اپنی کوتاہی کو تسلیم کیا۔ اور آئندہ اس عمل کی اصلاح کا وعدہ کیا اور ہم سے کہا کہ آپ بھی دعا کریں کہ میں اپنی اصلاح کر سکوں۔"

(تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی ص ۷۷)

حضرت تھانوی جب بھی قائداعظم میں کوئی خلاف شریعت بات دیکھتے فوراً ان کے پاس وفد بھیج کر ان کی اصلاح کی کوشش کرتے۔ اس طرح مختلف اوقات پر مختلف وفود ان کے پاس بھیجے۔ دو تین مرتبہ تو مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ بھی مولانا شبیر علی صاحب کے ہمراہ گئے مگر بعد میں مولانا شبیر علی صاحب تھانویؒ اکیلے ہی بطور سفیر دربار اشرفیہ قائداعظم کے پاس حضرت تھانوی کے پیغامات لے جاتے رہے اور اصلاح طلب امور کی طرف ان کی توجہ مبذول کراتے رہے۔ قائداعظم سفیر دربار اشرفیہ سے بڑی عزت و احترام کے ساتھ پیش آتے۔ ان کی باتوں کو بغور سنتے اور ایسی ملاقات کے لیے یوں اشتیاق ظاہر کرتے کہ:

"آپ تو کبھی تشریف لاتے ہیں حضرت تھانوی کی باتیں مجھے سمجھاتے ہیں اور علماء بھی میرے پاس آتے ہیں۔ مگر سب مجھ سے موجودہ سیاست میں بات کرتے ہیں۔ جس سے وہ حضرات ناواقف ہیں اور میں مذہب سے ناواقف ہوں۔ حضرت تھانویؒ نے

آپ کو ایک مرتبہ بھی کسی سیاسی امر میں گفتگو کے لیے نہیں بھیجا۔ مجھے آپ کے ذریعہ خاص مذہبی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ جو اور جگہ نصیب نہیں ہوتیں۔اگر آپ کو کچھ اور کہنا ہو۔ تو بیٹھ جایئے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ میں بڑے شوق سے سنوں گا۔" (ایضاً" ص ۸۵)

تبلیغی خطوط

قائداعظم کے پاس تبلیغی وفود بھیجنے کے علاوہ حضرت تھانوی وقتاً" فوقتاً" انہیں دیگر ارباب لیگ کو تبلیغی خطوط بھی لکھتے رہتے تھے۔ جیسا کہ "اعلام نافع" میں درج ہے کہ:۔

"میں خود اس (مسلم لیگ) کی اصلاح کا برابر سلسلہ جاری رکھتا ہوں۔ چنانچہ عام رسائل بھی اور خاص ذمہ داروں کے نام خطوط بھی بھیجے جاتے ہیں۔ ابھی لیگ کے اجلاس پٹنہ میں اپنے عزیزوں کو اس کام کے لیے دہلی روانہ کیا۔ غرضیکہ جتنا بھی ہوسکتا ہے لیگ کے ذمہ دار حضرات کو برابر دین کی تبلیغ کر رہا ہوں اگر میرے ساتھ سب مسلمان خصوصاً" علماء بھی مل کر ان پر زور دیتے ان کو نماز روزہ وضع اسلامی اور تمام دینی شعائر کی پابندی پر مجبور کرتے تو اب تک مسلم لیگ حقیقی معنوں میں مسلم لیگ ہو جاتی۔"

اسی طرح "افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ" میں درج ہے کہ حضرت تھانوی نے فرمایا:۔

"جس زمانہ میں کانگرس مسلم لیگ سے مفاہمت کی گفتگو کر رہی تھی۔ میں نے ایک خط مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح کو اس مضمون کا لکھا تھا کہ مفاہمت میں چونکہ مسلمانوں کے امور دینیہ کی حفاظت نہایت اہم اور بہت ضروری ہے اس لیے شرعیات میں آپ اپنی رائے کا بالکل دخل نہ دیں۔ بلکہ علماء محققین سے پوچھ کر عمل فرما دیں۔ تو انہوں نے نہایت شرافت و تہذیب سے جواب لکھا اور اطمینان دلایا کہ اس ہدایت کے مطابق عمل کیا جائے گا۔" (ص ۹۶)

حضرت تھانوی کے خطوط اردو میں ہوتے تھے۔ مگر خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب ان کا انگریزی ترجمہ کرکے اصل خط کے ساتھ منسلک کردیتے تھے۔ تاکہ انہیں سمجھنے میں آسانی ہو۔ اور اس تمام خط و کتابت کا ریکارڈ مولانا شبیر علی تھانوی" مہتمم خانقاہ امدادیہ محفوظ رکھتے تھے۔ جو انقلاب ۱۹۴۷ء میں ضائع ہوگئی۔ مگر قائداعظم نے

اس کا جو فائل مجلس دعوۃ الحق بمبئی کے ممبران کو حضرت تھانویؒ کی وفات کے بعد دکھلایا تھا: وہ یقیناً" مس فاطمہ جناح کے پاس ہوگا۔ جس کے متعلق انہوں نے متعدد درخواستوں کے باوجود کوئی جواب نہ دیا۔

عقائد قائداعظم میں تبدیلی

حضرت تھانوی کی تبلیغی مساعی کا یہ نتیجہ نکلا کہ قائداعظم نے شیعہ طریق پر نہیں بلکہ مسنون طریق پر پابندی کے ساتھ پانچ وقت نماز پڑھنی شروع کر دی۔ اتباع سنت میں خود کو شیعہ کہلانا پسند نہیں کیا۔ بلکہ جب انہیں ایک شیعہ وفد نے کوئٹہ میں احساس دلایا کہ آپ ہمارے فرقہ سے ہیں۔ تو انہوں نے بڑی جرائت سے فرمایا No! I am Muslim چنانچہ بعد وفات ان کی تجہیز و تکفین بھی اسی طریق پر ہوئی اور نماز جنازہ بھی مسنون طریقہ پر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے پڑھائی۔ ان پر اکثر خوف خدا طاری رہتا۔ وہ پہلے سیاست و مذہب کو الگ الگ سمجھتے تھے۔ مگر بعد میں مذہب کو سیاست پر ترجیح دینی شروع کر دی۔ ہر وقت انگریزی لباس میں ملبوس رہنے کی عادت ترک کر کے اکثر و بیشتر اسلامی لباس میں منظر عام پر آنے لگے۔ قرآن اور اسلامی لٹریچر کا بغور مطالعہ کیا۔ توکل و تضرع و انکسار و عاجزی اور دنیا سے نفرت کا جذبہ ان میں پیدا ہوگیا۔ جس کی وجہ ان کا خاتمہ بالخیر ہوا۔ جس کی تفصیل ''تعمیر پاکستان اور علماء ربانی' کے باب تدین قائداعظم میں دیکھی جاسکتی ہے۔

تصدیق صدیق

اسی لیے حضرت تھانویؒ کے مرید خاص اور قائداعظم کے یار غار نواب جمشید علی خاں صاحب جن کے پاس اکثر قائداعظم اپنی ہمشیرہ مس فاطمہ جناح کے ہمراہ موسم سرما میں باغپت جاکر رہا کرتے تھے اور جو انہیں حضرت تھانوی کے مواعظ و ملفوظات سنایا کرتے تھے۔ لکھتے ہیں کہ:۔

''یہ بالکل حقیقت ہے کہ قائداعظم کی تمام تر دینی تربیت حضرت تھانوی کا فیضان تھا۔ اور ان کا اسلامی شعور حضرت والا کی بدولت تھا۔ مولوی شبیر علی صاحب تھانویؒ نے قائداعظم کو حضرت والا کے قریب لانے میں بڑا کام کیا۔ قائداعظم باغپت کے دوران قیام میں حضرت والا کا بہت خلوص اور ادب سے تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ یہاں

تک کہ قائداعظم کو تھانہ بھون حاضر ہونے کا انتہائی شوق تھا۔ لیکن افسوس کہ چند درچند وجوہات کی بناء پر ان کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔

قائداعظم پر آخری زمانہ میں جو مذہبی رنگ غالب ہوا۔ اور جس کو ہم سب نے دیکھا وہ حضرت رحمتہ اللہ کی جوتیوں کا صدقہ تھا۔" (تعمیر پاکستان اور علماء ربانی ص ۹۲)

تائید اشرف

حق تعالیٰ (جو اپنے نیک بندوں کی مساعی خیر کی بناء پر ان کی ہر وقت تسلی کے سامان کرتے رہتے ہیں) نے حضرت تھانویؒ کو بھی ان کی تبلیغی جدوجہد کے نتائج کا مشاہدہ ان کی زندگی میں کرا دیا تھا۔ حضرت تھانوی کے خواہرزادہ مولانا ظفر احمد عثمانی کا ارشاد ہے کہ حضرت تھانوی نے فرمایا:۔

"میں خواب بہت کم دیکھتا ہوں۔ مگر آج میں نے عجیب خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا مجمع ہے گویا کہ میدان حشر سا معلوم ہوتا ہے۔ اس مجمع میں اولیاء صلحاء کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح مجمع کے ساتھ عربی لباس پہنے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھے ہیں۔ میرے دل میں خیال گزرا کہ یہ اس مجمع میں کیسے شامل ہوگئے؟ تو مجھ سے کہا گیا کہ محمد علی آج کل اسلام کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ اس واسطے ان کو یہ درجہ دیا گیا ہے۔" (ایضاً" ص ۱۱۱)

گویا جس طرح پاکستان کا تخیل پیش کرنے کا شرف حضرت تھانوی کو حاصل ہے اسی طرح معمار پاکستان کی اصلاح و دینی تربیت کا شرف بھی انہیں ہی حاصل رہا۔

ہندو مسلم اتحاد

تحریک خلافت کے دوران میں ہندو مسلم اتحاد کے عارضی مظاہرے دیکھنے میں آئے تھے۔ چونکہ مولانا تھانویؒ کی ہندوؤں اور گاندھی کے متعلق آخری رائے یہ تھی کہ وہ مسلم قوم کے دوست اور ہمدرد نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا آپ کی طرف سے ہندو مسلم اتحاد کی تائید کا سوال خارج از بحث تھا۔ اس لیے آپ نے نہایت سختی کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کے مفروضے کی مذمت فرمائی۔ مولانا کی رائے میں اگر مسلمان خود اپنی اصلاح کرلیں۔ مذہب کا دامن مضبوطی سے تھام لیں تو پھر ان کو کسی سے امداد یا کسی سے اتحاد کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس کے متعلق ایک مرتبہ ایک مجلس میں فرمایا کہ " مسلمانوں کی شان اس کے بالکل خلاف ہے کہ وہ دوسری قوموں کی روش اختیار کریں۔ یا ان کی تدابیر کو ذریعہ ترقی بنائیں یا اس سے کسی قسم کی مدد کے خواہاں ہوں۔ بڑی غیرت کی بات ہے ان کو تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔ مشروع تدابیر کو اختیار کرنا چاہیئے۔ اپنے سلف کے کارناموں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔" ایک اور مجلس میں فرمایا کہ "کوئی انگریزوں میں گھستا ہے کہ ان کے پاس ہماری فلاح و بہبود کے اسباب ہیں ان کا سا لباس، ان کی سی بول چال ان کی معاشرت اختیار کرلیتا ہے۔ کوئی ہندوؤں کی بغل میں جا گھستا ہے کہ ان کے ساتھ رہنے میں ہماری فلاح و بہبود ہے۔ ان کے ساتھ شریک ہو کر احکام اسلام تک کو پامال کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ ایمان تک کو قربان کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر رہے کورے کے کورے نہ ہندوؤں نے کچھ دیا نہ انگریزوں نے کچھ دیا۔

مولانا تھانویؒ کے نزدیک ہندو مسلم اتحاد صرف اسی صورت میں قائم ہوسکتا تھا کہ دونوں قومیں تعداد میں مساوی اور برابر ہوں۔ ایک مولوی صاحب نے اس مسئلے پر آپ سے ایک سوال کیا کہ اگر ہندو مسلم باہم حاکم و محکوم نہ ہوں بلکہ باہمی مساوات ہو تو کیا اس وقت ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام چلا سکتے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ قواعد سے گنجائش تو معلوم ہوتی ہے مگر اس وقت تجربے کی بنیاد پر دیکھا جائے گا کہ اس اشتراک میں کس کا نفع ہے اور کس کا نقصان ہے۔ اگر مسلمانوں اور ہندوؤں کے

ہاتھوں میں حکومت آبھی جائے اور تیسری قوم بے دخل ہو جائے تو کامیابی تب بھی ہندوؤں کی ہوگی۔ مسلمانوں کی نہ ہوگی۔ ایک تو ترکیب کے لحاظ سے اور دوسرے ان کی اکثریت کی بناء پر تیسرے ان کے طبائع حالات پر نظر کرکے۔ اور عقلی طور پر مقصود حکومت عادلہ کا ہے۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ احتمال ہے ہی نہیں کہ عدل ہو۔ جیسا کہ ہندوؤں کی کارگزاری سے اس وقت تک ظاہر ہے کہ وہ مسلمانوں کو ہندوستان سے مٹانا چاہتے ہیں۔ یہ اپنے دلی مذاق سے باز نہ آئیں گے۔ اس کا نتیجہ خوں ریزی اور فساد ہے۔

تحریک خلافت کے دوران مسلمان جس انداز میں گاندھی کی پیری کر رہے تھے مولانا کے نزدیک وہ ہندوؤں کا تابع بننا تھا نہ کہ یہ ہندو مسلم اتحاد کی کوئی صورت تھی چنانچہ ایک مجلس میں ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا "متعصب ہندوؤں نے مسلمانوں کو قریب قریب عضو معطل بنا رکھا ہے۔ مسلمان چاہتے ہیں کہ اتحاد ہو یہ تابع بننا ہے۔ اتحاد تو اس وقت ہوتا ہے جب دونوں قومیں مساوی ہوں۔ خدا معلوم مسلمان ہندوؤں کے اس قدر گرویدہ کیوں ہوگئے ہیں۔ جن کی نظروں میں گذشتہ واقعات ہیں وہ کبھی اس قوم پر اعتماد نہیں کر سکتے' مگر آج کل کے نوجوان اس قوم کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ ان کی دوستی کا نتیجہ مسلمانوں کے لیے خطرناک ہوگا۔

کانگرس کی مخالفت کی وجہ

اگرچہ ہندوستان کے بڑے بڑے علماء کانگرس کے ساتھ تھے مگر ان کی نظر وقتی اور ذاتی مصالح پر تھی۔ اس کے نتائج پر نہ تھی۔ بخلاف ان کے حضرت کی نظر حق تعالیٰ کے اس فیصلہ پر تھی کہ:

ولا یزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا

کفار تو ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ اگر قابو پاویں۔ تو تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں۔

جس کی روشنی میں آپ پر کانگرس کے عزائم واضح ہو چکے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے آپ سے سوال کیا کہ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی جو ۱۸۵۷ء میں لڑی گئی کیوں ناکام رہی۔ جبکہ اس کی کمان حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ایسے نفوس قدسیہ کے ہاتھ میں تھی۔ تو آپ نے فرمایا کہ:

"۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اس لئے ناکامی ہوئی کہ اس تحریک میں ہندو شامل تھے۔ دونوں شانہ بشانہ لڑ رہے تھے۔ مگر ہندوؤں نے وقت پر دغا دی۔ اب بھی ان سے وفا کی امید نہیں ہے۔ یہ وقت پر دھوکہ دیں گے۔ مسلمان اپنے ہی پاؤں پر کھڑا ہو کر کامیاب ہو سکتا ہے۔ دوسروں کے سہارے کبھی نہیں۔"

اس لئے آپ وفاق ہند کے مخالف تھے۔ اور چاہتے تھے کہ مسلم لیگ شرعی حدود کے اندر رہ کر اکیلے جنگ پاکستان لڑے۔ تاکہ کامیابی یقینی ہو۔ چنانچہ جب تک مسلم لیگ کانگرس کی ہم نوا رہی۔ آپ اس سے بالکل الگ رہے۔ اور جب اس نے دوسروں کا سہارا چھوڑ کر اپنا پلیٹ فارم الگ بنایا۔ تب آپ نے اس کی حمایت شروع کر دی۔

آپ کانگرس کے مخالف اس لئے نہ تھے کہ اس سے آپ کو کوئی ذاتی فائدہ تھا۔ بلکہ آپ اس کی مخالفت کے لئے اس لئے مجبور تھے کہ وہ آزادی ہند کے بعد ہندوستان سے اسلام کو مٹانا چاہتی تھی۔ چنانچہ جونہی زمام اقتدار اس کے ہاتھ میں آئی۔ مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹنے شروع ہو گئے۔ ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے گئے۔

سجدوں کو مندروں میں بدلا جانے لگا۔ اور ہر اس روایت کو حرف غلط کی طرح مٹانے کے درپے ہوگئی۔ جس کی صرف نسبت مسلمانوں سے تھی۔ یعنی حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے جو باتیں ۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۸ء میں ان کے عزائم کے متعلق بھری مجلس میں فرمائی تھیں۔ ۱۹۴۸ء کے بعد کے حالات نے ان کی حرف بہ حرف تصدیق کردی۔ اور کانگرس کی اس مسلم کش پالیسی کے خلاف بالاخر انہی حضرات کو ہندوستان کی پارلیمان میں احتجاج کرنا پڑا۔ جو تحریک آزادی کے زمانہ حضرت کے مسلک کی مخالفت کرنے والوں کی صف اول میں نظر آتے تھے۔ مگر کسی نے اس وقت اس پر غور نہ کیا کہ قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔ جس کی وجہ سے انہیں یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوا۔

مخالفت میں احتیاط

اس سیاسی کشمکش کے دوران میں آپ نے ہمیشہ انتہائی احتیاط سے کام لیا۔ مثلاً"

۱۔ جن معاملات میں علماء کا اختلاف ہوتا۔ ان میں بدوں کسی مکمل تحقیق و تفتیش کے کوئی فتویٰ یا اعلان شائع نہ فرماتے۔

۲۔ مقدور بھر تحقیق کے بعد اگر اعلان کی ضرورت بھی ثابت ہوتی۔ تو اس وقت بھی دوسری جانب کی پوری رعایت رکھ کر اعلان فرماتے۔ جس سے اختلاف کی خلیج وسیع ہونے اور عوام کو علماء کے خلاف برسرپیکار آنے کا موقع نہ ملتا۔

۳۔ اعلان کے بعد تحقیق حال اور مفاہمت باہمی کا سلسلہ برابر جاری رکھتے۔ اور قابل قبول چیزوں کے قبول کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے۔

مسلک کی ندرت

سیاسی کشمکش کے دوران میں علمائے امت اور لیڈران قوم ہر مسئلہ پر مختلف الرائے رہے۔ ہر جماعت نے اپنے علم یا تحقیق یا غرض کی ماتحت واقعات کو قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ واقعات بھی بسرعت تمام بدلتے رہے۔ جس کی وجہ سے شرعی نقطہ نظر سے کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی تھی۔ ان حالات میں حضرت کا جماعتی مسلک ان کے اپنے ارشاد کے مطابق ہمیشہ یہ رہا کہ۔

"نہ اعلان حق میں کبھی دریغ کیا۔ نہ عمل میں کبھی نمائش اور ہنگامہ آرائی کو دخل دیا۔ میری جماعت جس طرح شورش پسند نہیں۔ اسی طرح کسی اثر سے متاثر ہو کر کتمان حق کرنے والی بھی نہیں۔"

(معاملات المسلمین فی مجادلتہ غیرالمسلمین)

سیاسی تحریکات میں عدم شرکت

حضرت چونکہ درویش طبع تھے۔ اس لئے وہ سیاسی تحریکات میں حصہ نہ لیتے تھے۔ مگر سیاسی تحریکات کے متعلق جب آپ کے پاس استفسارات آتے تھے۔ تو اس وقت بحیثیت مجدد الملت اور حکیم الامت آپ کو مسئلہ کی شرعی حیثیت واضع کرنی پڑتی تھی۔ بس آپ کا سیاسیات میں صرف اسی قدر حصہ تھا۔ اگرچہ آپ کو سیاست کے عملی میدان میں لانے کے لئے کانگرس اور اس کی حلیف جماعتوں نے بہت کوشش کی۔ مگر آپ ہمیشہ ان سے الگ تھلگ رہے کیونکہ آپ فرماتے تھے۔

میرے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت کی جماعت وابستہ ہے۔ جب تک مجھ کو شرح صدر نہ ہو جاے۔ میں شریک ہو کر اتنے سارے مسلمانوں کی ذمہ داری کس طرح اپنے سر لے لوں۔ کیا قیامت کے دن میری گردن نہ ناپی جائے گی۔ میں تو ان تحریکات کو مسلمانوں کے لئے سراسر مضر اور اس سلسلہ میں اکثر عوام میں جو طریق عمل اختیار کئے جارہے ہیں۔ انکو ناجائز سمجھتا ہوں۔ نیز میرے نزدیک ان کا نتیجہ سوائے ضرر کے اور کچھ نہیں۔"

(اشرف السوانح جلد ۳ ص ۱۶۰)

یہاں تک کہ آپ نے مسلم لیگ میں بھی شرکت نہ فرمائی جس کو آپ کی تائید و حمیت حاصل تھی۔

بے نظیر استقلال و استقامت

غرضیکہ ان سیاسی طوفانوں نے بڑے بڑے ارباب استقامت کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ مگر اس کو استقلال کے پہاڑ کو اپنے مقام سے نہ ہٹا سکے۔ چنانچہ حضرت بطور تحدث بالنعمتہ فرمایا کرتے تھے کہ:

"سب کو کچھ نہ کچھ اپنے مرکز سے ہٹنا پڑا۔ لیکن الحمد للہ میں جس مرکز پر اول ہونا تھا۔ اس مرکز پر آج تک بدستور قائم ہوں۔ مجھ کو بفضلہٖ تعالیٰ اپنی رائے سے ایک انچ بھی نہیں ہٹنا پڑا۔ بلکہ تجربوں نے تو اور بھی مجھ کو اپنی رائے پر مستحکم کر دیا ہے۔"

(اشرف السوانح جلد ۳ ص ۱۶۱)

قاتلانہ حملہ

صاحب حیات اشرف لکھتے ہیں کہ:

"عین اس طوفانی دور میں آپ نے اپنی جان و عزت کی فکر کئے بغیر جو کچھ حق سمجھتے تھے۔ اس کو برملا پیش کیا۔ اس کے صلہ میں الزامات ملے۔ کسی نے انگریز کا پٹھو کہا۔ کسی نے کہا کہ یہ تو مسلمانوں کے جذبہ جہاد کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب اس کے باوجود اپنے مسلک میں حضرت کو مستحکم پایا۔ تو "آزادی" کا نعرہ بلند کرنے والوں نے اشرار کی جماعت تھانہ بھون میں بھیجی۔ تاکہ اس زبان ہی کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا جائے۔ جس سے یہ خلاف مرضی باتیں نکل رہی تھیں۔

یہ ٹکڑی آئی۔ اور لاٹھیوں سے مسلح راستہ کے کنارے چھپ گئی۔ تاکہ صبح جب حکیم الامت مسجد جا رہے ہوں تو ان کا کام تمام کر دیا جائے۔ مولانا تھانویؒ کو اس کی اطلاع ملی۔ آپ مراقب ہوئے۔ میلان قلبی یہی رہا کہ مسجد جایا جائے حسب معمول ایک ہاتھ میں قندیل اور ایک ہاتھ میں عصا لیئے ہوئے صبح صادق سے پہلے ہی گھر سے چل پڑے۔ جب اس مقام پر پہنچے جہاں غنڈے چھپ رہے تھے۔ تو ان پر اس درجہ ہیبت طاری ہوئی کہ سب کے سب بے تحاشہ وہاں سے بھاگ پڑے۔ اور پہلی ٹرین کے ذریعہ تھانہ بھون سے چلے گئے۔ اور پھر کسی نے ایسی جرات نہ کی۔

ہیبت حق است ایں از خلق نیست
ہیبت ایں مرد صاحب دلق نیست

ندامت و خجالت

یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن جو اعتدال اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ گو آپ بحیثیت مجتہد اپنی رائے میں بہت مستحکم تھے مگر چونکہ یہ مسئلہ بالکل اجتہادی تھا۔ اس لئے خود اپنے حلقہ ارادت کے علماء کو بھی اختلاف رائے کی پوری پوری آزادی دے رکھی تھی۔ البتہ جب بعض علماء نے حدود سے تجاوز کیا۔ اور خود آپ کو اپنی قائم کردہ رائے کے سامنے غلط ٹھہرانی کی سعی کی۔ اور جادہ اعتدال سے

ہٹ گئے۔ تو حکیم الامتؒ نے ان کو اپنے زمرہ سے نکال دیا۔ ۰ بعد کو جب خلافت کی تحریک کی آندھی ختم ہوئی اور حکیم الامتؒ کے محسوس کردہ خدشات حقائق بن کر سامنے آگئے تو پھر ان حضرات کو ندامت و خجالت بیان سے باہر رہی لیکن اس نقصان کی تلافی نہ ہو سکی۔" (حیات اشرف ص ۲۳۵۔۲۳۷)

اعلان مسلک

حضرت مسلم لیگ کے جواب کی روشنی میں حالات حاضرہ کا ابھی جائزہ ہی لے رہے تھے کہ ۵ فروری ۱۹۳۸ء کو مولوی منفعت علی صاحب وکیل و ممبر مسلم لیگ سہارن پور کی طرف سے حضرت کو ایک خط موصول ہوا۔ جس میں تمام حالات پر روشنی ڈالنے کے بعد درخواست کی گئی کہ:

"حضرت اقدس کے نزدیک دونوں جماعتوں یعنی لیگ اور کانگرس میں سے مسلمانوں کو کس جماعت میں شرکت کرنی چاہئے۔"

(مسائل سیاسیہ ص ۷۰)

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ کے بیان کے مطابق اس خط کے موصول ہونے کے بعد ۱۰ فروری ۱۹۳۸ء کو حضرت تھانوی ایک مضمون لکھ کر خانقاہ میں تشریف لائے۔ صبح کی مجلس میں مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی اور مولانا شبیر علی تھانویؒ و دیگر علماء خانقاہ کو بلا کر فرمایا کہ:

"حضرت اقدس کے نزدیک دونوں جماعتوں یعنی لیگ اور کانگرس میں سے مسلمانوں کو کس جماعت میں شرکت کرنی چاہئے۔"

(مسائل سیاسیہ ص ۷۰)

"رات میں نے سونا چاہا۔ مگر نیند نہیں آئی۔ بار بار قلب یہ تقاضا کرتا تھا کہ جواب لکھو۔ جب شدید تقاضا ہوا تو میں لکھنے بیٹھ گیا۔ اور یہ مضمون قلمبند ہوا۔ جسے "تنظیم المسلمین" کا نام دیا گیا۔"

اس کا خلاصہ حضرت تھانوی کے الفاظ میں یہ تھا کہ:

"از خود نہ کسی سے آویزش کی ضرورت ہے۔ نہ آمیزش کی ضرورت۔ رضائے حق کو مطمع نظر رکھ کر اپنے کام میں لگے رہیں۔ اور اس رضا کی شرط یہ ہے کہ ہر کام میں اس کا پورا لحاظ رکھیں کہ کوئی امر خلاف شرع نہ ہونے پائے۔ یہی عبدیت کی روح اور حیات مسلم کی اصل الاصول ہے۔"

(افادات اشرفیہ و مسائل سیاسیہ ص ۷۵)

وضاحت مسلک

اپنے مذکور الصدر اعلان کی وضاحت میں آپ نے آگاہی عوام کے لئے "تنظیم المسلمین" کا ضمیمہ بعنوان "عرض ضروری باطلاع معذوری" حسب ذیل تحریر فرمایا:

"بعد الحمد و الصلوۃ حضرات ناظرین۔ السلام علیکم و رحمتہ اللہ۔ سیاسیات حاضر کے متعلق ایک فتویٰ مسمی بہ "تنظیم المسلمین" زمانہ قریب میں میری جانب سے شائع ہو چکا ہے۔ اور اس سے میرا مسلک واضح ہوگیا ہے۔ مگر پھر بھی روزانہ ڈاک میں اس کے متعلق برابر خطوط آتے رہتے ہیں۔ جن میں مختلف عنوانات سے سوالات ہوتے ہیں۔ چونکہ میں بوجہ ضعف ہر جزئی کا مفصل جواب دینے سے قاصر ہوں۔ اور بغیر تفصیل کے غلط فہمی کا اندیشہ ہے۔ جیسا کہ روز مرہ کا مشاہدہ ہے۔ نیز اس فتویٰ میں نہایت احتیاط کے ساتھ اس قدر قیود و حدود کی رعایت کی گئی ہے کہ ان میں غور کرنے سے یا کسی عالم کے مطالعہ میں شریک کرنے سے تقریباً" تمام ضروری سوالات کا جواب اس سے حاصل ہو جاتا ہے۔ مثلاً"

۱۔ ہر تنظیم کا حسب قدرت شرع کے موافق ہونا ضروری ہے۔

۲۔ جس جماعت میں داخل ہوں۔ اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔ اس میں منکر پر نکیر کرنا بھی آگیا۔

۳۔ جو شخص اسلام کو حق جانتا ہو۔ اس کی اصلاح بہ نسبت غیر مسلم کے سہل ہے۔

۴۔ اصلاح اس تفصیل سے کی جاوے کہ اہل قوت اپنی قوت اور غیر اہل قوت ان اہل قوت کو آمادہ کرنے سے اور علماء سے علمی و عملی امداد حاصل کرنے سے کام لیں۔

۵۔ تمام علماء احکام کی تبلیغ میں مشغول رہیں کہ تقسیم خدمات کے قاعدہ سے یہ ان کا اصلی فرض ہے۔ اہل سیاست سے اسکی توقع فضول ہے۔ جیسا اس کا عکس۔ البتہ اہل سیاست تدابیر سیاست کے جواز و عدم جواز کے حکم میں علماء کے محتاط ہیں۔

۶۔ غیر اسلامی جماعت کے ساتھ اصول شرعیہ کے موافق صلح کا مضائقہ نہیں۔ لیکن ان میں مدغم نہ ہوں۔

۷۔ اگر کوئی دوسری اسلامی جماعت پیدا ہو جائے۔ اس کے ساتھ اتحاد رکھیں۔

۸۔ اگر ایسی سیاسی جماعت متقی نہ ہو مگر اسلام کی حفاظت اور مخالفین اسلام کی مدافعت اس کا مقصود مشترک ہو۔ جیسا کہ اس وقت زیادہ غرض تنظیم سے یہی ہے کہ جو

متعصّبین آزادی ہند کے بعد ہندوستان سے اسلام کو مٹانا چاہتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں اس کی حمایت کریں تاکہ اسلام اپنے اصول و شعائر کے ساتھ ہندوستان میں باقی رہے۔ گو اس جماعت کے اتحاد میں اختلاف مذاہب بھی ہو۔ اور اس وقت کی فضاء پر نظر کرکے بظاہر اسباب اس کی ضرورت ہے کہ اس مقصود کے حاصل کرنے کے لئے باہمی اختلاف کو بجائے خود رکھ کر سب کلمہ گو جمع ہو جاویں۔ تو متقی نہ ہونا ایسی حالت میں اختلاف میں مانع تعاون نہیں۔ البتہ اس میں شرط ضروری ہے کہ اس تعاون میں جو اختلاط ہو۔ وہ مضردین نہ ہو۔ اور اس کی اسلم صورت یہ ہے کہ عوام الناس ایسے لوگوں سے مذہبی گفتگو نہ کریں۔ نہ سنیں۔ یہ کام علماء پر چھوڑ دیں۔ البتہ اپنے عقیدہ کی علمی و عملی اصلاح خاص ملاقاتوں میں لطف و اخلاق سے کرتے رہنا بلا خطر مناسب بلکہ واجب ہے۔ تاکہ وہ بھی تقویٰ کے ساتھ موصوف ہو جاویں۔ حاصل اس تقسیم خدمات کا یہ ہے کہ زعماء کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو من حیث القوم مٹنے نہ دیں اور علماء کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو من حیث المذہب بگڑنے نہ دیں۔ تو ایک جماعت میں جن خاص اوصاف کی کمی اسکے فرض میں مخل ہے۔ اس کمی کو دوسری جماعت میں دیکھ کر خود اس جماعت کو بیکار سمجھنا محض ناحقیقت شناسی اور نا تجربہ کاری ہے۔

ہر کے بہر کارے ساختند

۹۔ ہر حال اور ہر عمل میں اصل مطمح نظر رضائے حق کو رکھیں کہ حقیقی کامیابی اسی پر موقوف ہے۔

۱۰۔ فتویٰ ۱۳۵۶ھ کے ختم اور ۱۹۳۸ء کے آغاز کا لکھا ہوا ہے اور اس وقت کی حالت کی بناء پر ہے۔ اگر حالات بدل گئے تو حکم بھی بدل جائے گا۔"

یہ وہ اعلان تھا جس کے ذریعہ آپ نے مسلمانوں کو چند شرائط کے ساتھ مسلم لیگ میں شامل ہونے کا فتویٰ دیا۔

مجلس دعوۃ الحق

حضرت تھانوی کی اصل سیاست یہ تھی کہ جس طرح بھی بن سکے۔ مسلمانوں کو سچا مسلمان بنا دیا جائے۔ اس لئے آپ کی حمایت لیگ سیاسی اغراض کیلئے نہ تھا۔ بلکہ اس غرض کے لئے تھی۔ کہ مسلمان لیگ کے اندر داخل ہو کر اپنی تنظیم اور لیگ کی اصلاح کی فکر کریں۔ تاکہ یہ کانگرس کا مقابلہ کرسکے اور متعصّبین اسلام کو ہندوستان

سے نہ مٹا سکیں اور اسلام اپنے اصول و شعائر کے ساتھ ہندوستان میں باقی رہے مسلم لیگ چونکہ نہ علماء کی جماعت تھی اور نہ بالکل دینداروں کی۔ اس لئے حضرت تھانوی کو اس کی قیادت سے کچھ دینی مضرتوں کا احتمال تھا۔= جس کی وجہ سے آپ نے ایک ایسی تبلیغی جماعت بنانے کی ضرورت محسوس کی۔ جو تبلیغ دین کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی سیاسی جماعت مسلم لیگ کی بھی نگرانی کرتی رہے۔ تاکہ وہ مسلمانوں کے حقوق کا گورنمنٹ سے مطالبہ کرتے وقت شریعت کے خلاف عمل نہ کر بیٹھے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے حضرت کے ایماء پر "مجلس دعوۃ الحق" قائم ہوئی جس کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے۔

الف ۔ حضرت تھانوی کے رسائل "تنظیم المسلمین و تعلیم المسلمین" میں جو عوام و خواص کو تنظیم و تبلیغ کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس کے لئے ایک مرکز قائم کرنا اور تنظیم و تبلیغ کو وسیع پیانہ پر ہندوستان میں پھیلانا۔

ب ۔ مسلم لیگ کے لیڈروں کو دینداری کی طرف متوجہ کرنا۔ کیونکہ مسلم لیگ کو اس وقت مسلمانوں میں بڑی حد تک مرکزی شان حاصل ہے۔ اس کے لیڈروں کی اصلاح سے بہت کچھ عوام کی اصلاح متوقع ہے۔

ج ۔ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے ارکان کے پاس ان کے جلسوں میں یا خاص اوقات میں چند مخلصین کا وفد بھیجتے رہنا۔ جو یہ بات ان کے ذہن نشین کرائے کہ مسلمانوں کو ہمیشہ اتباع احکام الٰہیہ سے ہی کامیابی اور ترقی ہوئی ہے۔ محض اسباب ظاہرہ یا دیگر اقوام جیسا مظاہرہ مسلمانوں کے لئے ہرگز کافی نہیں ہوتا۔

د ۔ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کو شعائر اسلامی کی پابندی کی تبلیغ کرانا اور ان سے درخواست کرنا کہ مسلم لیگ کے ہر ممبر پر قانونی طور سے شعائر اسلامیہ کی پابندی کو لازم کیا جائے کہ اس پر کامیابی موقوف ہے اور قلوب اہل اسلام کا انجذاب بھی اسی سے ہوگا۔ جو تنظیم کی بنیاد ہے۔

چنانچہ اس تبلیغی پروگرام پر نومبر ۱۹۳۸ء سے عملدرآمد شروع ہوگیا۔ اور اس کی ابتداء قائداعظم کی تبلیغ سے ہوئی۔

تطہیرو تکفیر کی مساعی

ایک طرف تو حضرت تھانوی اور ان کے مخلصین کی جماعت اللہ کے دین کا بول بالا

کرنے اور مسلمانوں کی دینی و دنیوی فلاح کی غرض سے مسلم لیگ والوں کو صحیح معنوں میں مسلمان بنانے میں مصروف تھی۔ اور دوسری طرف خود حضرت تھانوی کو کافر قرار دینے والا بریلیویوں کا فتویٰ لوگوں میں تقسیم کیا جا رہا تھا۔ اور مسلم لیگ والوں کو بے دین ثابت کیا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ قائد اعظم تک کو کافر کہا جا رہا تھا۔ تاکہ کسی طرح لوگ مسلم لیگ میں شامل نہ ہوں۔ اس پر حضرت نے ایک دوسرا اعلان بعنوان " الطریق الامم فی شرائط الامم" جاری کیا۔ اور اس میں لکھا کہ :

"بعض حضرات کانگرس کے مفاسد کے جواب میں اکثر اہل مسلم لیگ کے بعض اعمال دینیہ کی کوتاہیاں پیش کر کے بطور الزام ان کوتاہیوں کو اس کے ساتھ اتحاد کرنے کے جواز سے مانع قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ کہاں اصل ایمان کا فقدان کہاں فروغ اعمال کا نقصان۔ تو ایک کا قیاس دوسرے پر محض فاسد اور قیاس مع الفارق ہے۔ خصوص جبکہ اس دوسرے نقصان کی اصلاح کی توقع بھی قریب ہو جس کی کوشش شروع بھی ہو گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ اہل مسلم لیگ کی کوتاہیاں خوارج کی بددینی کے درجہ تک تو نہیں پھر جب کفار کے مقابلہ کے لئے خوارج کے ساتھ اشتراک عمل جائز ہے۔ تو مسلم لیگ کے ساتھ بدرجہ اولیٰ جائز ہو گا۔ پس اس تحریر سے کانگرس اور مسلم لیگ کی حقیقت اور حکم میں صاف فرق ظاہر ہو گیا۔ اس پر بھی اگر کوئی شخص اپنے قیاس فاسد پر اصرار کرے تو کیا علاج۔"

جمعیت العلمائے ہند کی دعوت

جب کانگرس نے دیکھا کہ حضرت تھانوی مسلم لیگ کی پشت پناہی سے باز نہیں آ رہے۔ تو اس کی حلیف جماعت جمعیتہ العلماء کے ناظم مولانا احمد سعید صاحب کی طرف سے مورخہ ۲۶ فروری ۱۹۳۹ء کو حضرت تھانوی کی خدمت میں اس مضمون کا ایک دعوت نامہ پہنچا کہ

"جمعیتہ العلماء ہند کا جو اجلاس دہلی میں ہو رہا ہے اس میں شرکت کے لئے بہ نفس نفیس تشریف لادیں۔ اگر سفر کا تحمل نہ ہو تو کسی کو بطور نمائندہ روانہ فرمادیں۔ معاملات کی اہمیت حضور کے پیش نظر ہے۔"

حضرت تھانوی کا جواب

جمعیتہ العلماء ہند کے دعوت نامہ کا حضرت تھانوی کی طرف سے مندرجہ ذیل جواب لکھا گیا۔

"السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ آپ کا دعوت نامہ آیا۔ میرا عذر سفر تو آپ کو معلوم ہی ہے اس لئے خود تو حاضری سے قاصر ہوں۔ اگر دعوت نامہ کچھ پہلے آتا تو ممکن تھا کہ اس کے متعلق کچھ خط و کتابت کر کے کسی کو بھیجنے کا انتظام کرتا اب عین وقت پر اس کا انتظام بھی مشکل ہے۔ اس لئے شرعی حیثیت سے صرف اپنی ایک رائے کا اظہار کرتا ہوں۔ جس کے متعلق مولانا محمد کفایت اللہ صاحب سے زبانی گفتگو بھی ہو چکی ہے۔ اور اب تو واقعات نے مجھ کو اس رائے پر بہت ہی پختہ کر دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا خصوصاً" حضرات علماء کا کانگرس میں شریک ہونا میرے نزدیک مذہباً" مہلک ہے بلکہ کانگرس سے بیزاری کا اعلان کر دینا نہایت ضروری ہے۔ علماء کو خود مسلمانوں کی تنظیم کرنا چاہئے تاکہ ان کی تنظیم خالص دینی اصول پر ہو۔ اور مسلمانوں کو کانگرس میں داخل ہونا اور داخل کرنا میرے نزدیک ان کی دینی موت کے مترادف ہے۔ والسلام اشرف علی۔" (افادات اشرفیہ)

مگر عین وقت پر اس کی روانگی روک لی گئی اور یہ جواب نہ بھیجا گیا۔ اس جواب

کے نہ بھیجنے کی مصلحت اس وقت معلوم ہوئی جب جمیعتہ العلماء ہند کے مذکورہ بالا اجلاس میں ہونے والی تقریر کے رد عمل کے طور پر اجلاس کے اختتام کے قریب ہی مولوی مظہر الدین مالک اخبار الامان دہلی کو قتل کر دیا گیا اگر یہ جواب چلا جاتا۔ تو یہی خیال کیا جاتا کہ حضرت کے جواب سے برافروختہ ہو کر جلسہ والوں نے ایسی تقاریر کیں جو مسلم لیگ کے ترجمان کے قتل پر منتج ہوئیں۔ چونکہ حضرت پر اس واقعہ کا ہونا منکشف ہو چکا تھا۔ اس لئے آپ نے جواب نہ بھیجنے دیا۔

قتل کی دھمکی

حضرت کے خط نے کانگرسیوں کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ کانگرسی حکومتوں کی مسلم کش پالیسی اور ہندوؤں کے جبرواستبداد نے پاکستان کے لئے راہ صاف کرنی شروع کر دی جمیعتہ العلماء احرار۔ سرخ پوش۔ نیشلسٹ اور مومن کانفرنس والے سب مل کر بھی تھانہ بھون کے مرد درویش کی آواز پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ اور مسلمان حضرت تھانوی کے اعلانات پر جوق در جوق مسلم لیگ میں شامل ہو کر جنگ پاکستان لڑنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ غرضیکہ کانگرسیوں کے تمام ناجائز حربوں کے وجود حضرت تھانوی مسلم لیگ کی حمایت سے باز نہ آئے۔

خلقے بد منت یک طرف آں شوخ تنہا یک طرف

سیاسی معاملات میں حضرت تھانوی کے اس استقلال و استقامت کو دیکھ کر محقق اسلام مولانا مناظر حسن گیلانی نے مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کو لکھا کہ

"اللہ تعالیٰ ان (حضرت تھانوی) کے سایہ کو ملت اسلامیہ کے سر پر دیر تک صحت و سلامتی کے ساتھ قائم رکھے۔ اور اس وقت کے طوفان کے اکیلے ملاح کو اتنا تو وقفہ دے کہ کم از کم یہ طوفان سر سے ٹل جائے۔ علماء میں افسوس ہے کہ سب ادھر ہی چلے گئے۔ جدھر رسول اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں۔ ایک حضرت ہی ہیں۔ جن سے اس جماعت کی آبرو باقی ہے۔" (حکیم الامت ص ۵۳۶)

اہل نظر حضرت کی درازی عمر کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے۔ اور اہل غرض انہیں اپنے راستہ سے ہمیشہ کیلئے ہٹانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ جمیعتہ العلماء ہند کو ٹکا سا جواب ملنے کے "قریبا" ڈیڑھ ماہ بعد حضرت تھانوی کو ۱۵ اپریل ۱۹۳۹ء کی ڈاک میں ایک خط موصول ہوا جس کے لفافہ پر مٹھوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ کے ڈاک خانہ

کی ۱۳ اپریل ۱۹۳۹ء کی مہر تھی خط میں کاتب کا نام اور پتہ درج نہ تھا۔ یہ لکھا تھا کہ:

"یہ بات بہت تشویش اور ہمارے لئے شرم کی ہے کہ کانگرس جمیعتہ العلماء۔ احرار اور مومن کانفرنس کی تمام کوششوں کے باوجود مسلم لیگ کا فتنہ ملک میں پھیلتا جاتا ہے اور آپ نے علماؤں کے خلاف مسلم لیگ کے موافق فتوی دیا ہے۔ جس سے بہت اثر ہے۔ لیکن اب ہماری پارٹی مسلم لیگ کے مولویوں اور بددین لیڈروں کو مزا چکھانے کے لئے تیار ہو کر میدان میں آ گئی ہے۔ اس لئے آپ کو بھی تاکیدی نوٹس دی جاتا ہے کہ ایک مہینہ کے اندر اندر مسلم لیگ سے اپنا فتوی واپس لے لو۔ اور حضرت امیر الہند مولانا حسین احمد صاحب مدنی کا مسلک قبول کر لو۔ اور کانگرس کی حمایت کرو۔ ورنہ یقین اور پورا یقین رکھو کہ مظہر الدین الامان والا کی طرح تم کو بھی تمہاری خانقاہ میں چھرے سے ذبح کر دیا جائے گا۔ یہ قسمیہ اور ایمانا" اطلاع بھیجی جاتی ہے۔ ایک مہینہ کی مدت غنیمت جاننا۔ ایک مہینہ تمہارے بیان کا انتظار کر کے ہمارا آدمی روانہ ہو جائے گا۔ جو پستول یا چھرے سے تم کو ختم کر دے گا۔ پھر مردود جناح (قائد اعظم) کی باری ہو گی۔ اور بدعتی مولوی حامد بدایوانی کی۔ یہ چٹھی کوئی دھمکی نہیں ہے۔ فقط کانگرس زندہ باد اور جمیعتہ العلماء زندہ باد۔ (اعلام نافع ص ۲)

دھمکی کا جواب

حضرت تھانوی نے قتل کی اس دھمکی کے جواب میں حسب ذیل اعلان "النور" ماہ صفر ۱۳۵۷ھ میں شائع فرمایا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ کاتب خط نے میرے اس فتوی میں جو مسلم لیگ کے متعلق ہے اور جس کا لقب تنظیم المسلمین ہے۔ غور نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے بلا دلیل اس کو مسلم لیگ کی حمایت مطلقہ سمجھ لیا۔ حالانکہ اس میں ذیل کی قیود کی تصریح کی ہے۔

۱۔ اس کو اس جماعت پر ترجیح دی ہے۔ جس میں غالب عنصر غیر مسلمین کا ہے۔

۲۔ اسلامی منظم و صاحب قوت و صاحب اثر جماعتوں پر اگر موجود ہوں۔ ترجیح نہیں دی بلکہ یہ لکھ دیا ہے کہ اگر مسلم لیگ کی اصلاح کے قبل یا بعد اور کوئی جماعت مسلمہ منظمہ۔ صاحب قوت و صاحب اثر تیار ہو جائے تو اس صورت میں مسلم لیگ اور وہ جماعت دونوں اتحاد و اشتراک کے ساتھ کام کریں۔ تاکہ مسلمانوں میں افتراق و شکست نہ ہو۔

۳۔ اس میں مسلم لیگ کے نقائص کو تسلیم کر کے اس کی اصلاح کا سب کو خصوص علماء کو مشورہ دیا ہے۔

۴۔ پھر اس میں جو اہل قوت و اہل اثر ہیں۔ ان کو اپنی قوت و اثر سے اس کی اصلاح کی تاکید کی گئی ہے۔

۵۔ خود بھی اس کی اصلاح کا برابر سلسلہ رکھتا ہوں۔ چنانچہ عام رسائل بھی اور خاص ذمہ داروں کے نام خطوط بھی جاتے رہتے ہیں۔

۶۔ ابھی لیگ کے اجلاس پٹنہ میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کا ایک مختصر وفد اس کام کے لئے بھیجا۔ پھر ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو چند عزیزوں کو اس کام کیلئے دہلی روانہ کیا۔

غرض جتنا بھی ہو سکتا ہے۔ لیگ کے ذمہ دار حضرات کو برابر دین کی تبلیغ کر رہا ہوں۔ اگر میرے ساتھ سب مسلمان خصوص علماء بھی مل کر ان حضرات پر زور دیتے۔ اور ان کو نماز روزہ اور وضع اسلامی کی اور تمام دینی شعائر کی پابندی پر مجبور کرتے تو اب تک مسلم لیگ حقیقی معنوں میں مسلم لیگ ہو جاتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے ان خطرات سے آویزش کو مناسب نہیں سمجھا۔ کہ جلسے کرتا اور ان کے مقابلہ میں ان کوتاہیوں کو برملا بیان کرواتا۔ کہ اس کو میں مضر سمجھتا ہوں۔ اس طریقہ سے دوسرے کو ضد ہو جاتی ہے۔ جو طریقہ میں نے اختیار کیا ہے۔ وہ دیر طلب ضرور ہے۔ مگر اس کا اثر انشاء اللہ دیرپا ہو گا۔ پھر ان احتیاطوں کے ساتھ میں نے وہ فتویٰ قبل اشاعت اپنی دیو بندی جماعت کے علماء کو بھی دکھلا لیا تھا۔ جس کی پسندیدگی پر سب نے اتفاق کیا تھا۔ مگر میں نے اس وقت ان حضرات کے نام ظاہر نہیں کئے کہ شاید وہ اپنی مصلحت کے خلاف سمجھیں۔

فیما بینی و بین اللہ

ان سے اپنا اطمینان کر لیا تھا۔ جیسا کہ ان کی تصدیقات سے ظاہر ہے۔

میں اب بھی اس پر آمادہ ہوں کہ اگر علماء سے اس کارروائی کے خلاف شرع ہونے کا فتویٰ حاصل کر کے مجھ کو اطلاع کر دی جائے۔ میں اس میں انصاف اور تدین سے غور کر کے شرح صدر کے بعد اپنے فتویٰ سے رجوع کر لوں گا۔ جیسا کہ میرا ہمیشہ سے معمول رہا ہے۔ رسالہ ترجیح الراجح کا سلسلہ اس کی دلیل ہے اور یہی کلام ہے کانگرس کی حمایت میں۔ جس کو اب تک میں بحالت موجودہ اسلام اور اہل اسلام کے

لئے سخت مضر سمجھتا ہوں۔ لیکن اگر دلیل شرعی سے اس کے خلاف واضح ہو جائے۔ تو میں اپنی رائے بدلنے کو تیار ہوں۔ اور کسی کی غلطی پر مطلع کرنے کا یہی طریقہ ہے۔
باقی اگر تخویف سے کسی نے اپنی ضمیر کے خلاف کوئی رائے بھی ظاہر کر دی۔ یہ عقلاً" مفید نہیں ہو سکتا ہے۔ ہر شخص یہی سمجھے گا کہ یہ رائے دل سے نہیں دی۔ تو اس سے مقصود حاصل نہ ہو گا۔ اس لئے یہ طریقہ محض عبث اور عقل و شرح دونوں کے خلاف ہے۔ یہ سب تنقیح اس وقت ہے جب حقیقت کو سمجھنا اور حق کا اتباع کرنا مقصود ہو۔ اور اگر یہ نہیں تو پھر بجز قیامت کے دن کے اس کے فیصلہ کی کوئی صورت نہیں۔ باقی میں اس پر قادر نہیں کہ محض مخلوق کے راضی کرنے کے لئے حق تعالیٰ کو ناراض کر دوں۔ اور دنیا کی متاع قلیل کے لئے آخرت کے نفع و ضرر کو نظر انداز کر دوں۔

میرا ہی کیا ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ مقدرات بدلا نہیں کرتے۔ لہٰذا جو ہونے والا ہے ہو کر رہے گا۔ اور نہ ہونے والا نہ ہو گا۔ اس لئے اس خط کا بحمد اللہ مجھ پر کوئی معتد بہ اثر نہیں ہوا۔ اور نہ اس سے بچنے کیلئے مجھے کسی رسالہ کے شائع کرنے کی ضرورت تھی۔ مگر اس سے مجھے یہ شبہ ہو گیا کہ بعض لوگوں کو مسلم لیگ کے متعلق میرے مسلک کی نسبت کچھ غلط فہمی ہو رہی ہے۔ اگر اس خط میں کاتب کا نام و نشان ہوتا۔ تو خصوصیت کے ساتھ تفہیم ممکن تھی۔ اب عام عنوان سے جواب دے دیا ہے۔ والسلام۔

قائداعظم کا خراج تحسین

قائداعظم کے دل میں حضرت تھانوی کی کتنی عزت و عظمت تھی حقیقت یہ ہے کہ قائداعظم کی نظر میں حضرت تھانوی کے بعد کوئی عالم جچتا ہی نہ تھا' جیسا کہ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی اپنی روئیداد میں لکھتے ہیں کہ :۔

''حضرتؒ کی وفات کے بعد کا واقعہ ہے کہ بمبئی میں جمعتہ علماء اسلام کی کانفرنس ہوئی جس میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی میں اور مولانا محمد طاہر مرحوم وغیرہ شریک ہوئے تو بمبئی کے چند تاجر جن کو حضرت سے تعلق تھا ہم سے ملے اور بیان کیا کہ قائداعظم کی مجلس میں ایک دفعہ یہ گفتگو آئی کہ کانگرس میں علماء زیادہ ہیں اور مسلم لیگ میں علماء کوئی نہیں۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کو مسلم لیگ سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے یہ سن کر قائداعظم نے جوش کے لہجہ میں فرمایا کہ تم کن کو علماء سمجھتے ہو؟ انہوں نے مولانا حسین احمد صاحب مدنی' مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کا نام لیا۔ قائداعظم نے فرمایا کہ مولانا حسین احمد عالم ہیں' مگر ان کی سیاست ایک ہی ہے کہ انگریزوں کے دشمن ہیں اس دشمنی میں وہ مسلمانوں کے مفاد کی بھی رعایت نہیں کرتے۔ مولانا کفایت اللہ صاحب واقعی مفتی ہیں اور کچھ سیاست دان بھی لیکن ابوالکلام نہ عالم ہے' نہ سیاستدان ہے مسلم لیگ کے ساتھ ایک بہت بڑا عالم ہے جس کا علم و تقدس و تقویٰ اگر ایک پلڑا میں رکھا جائے اور تمام علماء کا علم و تقدس و تقویٰ دوسرے پلڑے میں رکھا جائے' تو اس کا پلڑا بھاری ہوگا وہ مولانا اشرف علی تھانوی ہیں جو چھوٹے سے قصبہ میں رہتے ہیں۔ مسلم لیگ کو ان کی حمایت کافی ہے اور کوئی موافقت کرے یا نہ کرے ہمیں پرواہ نہیں۔''

ہیبت حق است ایں از خلق نیست
ہیبت ایں مرد صاحب دلق نیست

حضرت مولانا مفتی جمیلؒ احمد صاحب تھانوی روایت فرماتے ہیں۔
اخر عمر میں بیماری کے زمانہ میں احقر خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ حضرت کو جب

چلنے پھرنے سے معذوری ہوگئی تو بڑی اماں صاحبہ (بڑی پیرانی) کی اجازت سے چھوٹی اماں صاحبہ رحم (پیرانی) کے یہاں ہی حضرت کا قیام رہتا تھا' اور مجھے چھوٹی اماں صاحبہ مد ظلہا کا داماد ہونے کی وجہ سے حاضری میسر تھی۔ ایک دن چھوٹے گھر کے ملازم حاجی سلیمان مرحوم نے مجھے آواز دی' دروازہ پر گیا تو تین صاحبان کھڑے ہیں۔ تینوں بمبئی کے سیٹھ معلوم ہوتے تھے۔ باتیں کرنے پر مجھے یہ اندازہ ہوا کہ یہ مسلمان نہیں آتش پرست ہیں انہوں نے حضرتؒ سے تنہائی میں ملنا چاہا۔ میں نے عذر کیا کہ حضرتؒ بیمار ہیں۔ گھر میں پردہ رہتا ہے جو کچھ کہنا ہو آپ لکھ کر دے دیجئے' میں پیش کردوں گا۔ جواب وہ خود لکھیں گے وہ آپ کو لاکر دے دوں گا' اور میں بالقسم کہتا ہوں کہ نہ آپ کی تحریر کو دیکھوں گا نہ جواب کو' اور دل میں خطرہ یہ تھا کہ چونکہ اسوقت ہندو مسلم خلفشار چل رہا ہے۔ ایسا نہ ہو یہ کچھ حرکت کر بیٹھیں حضرت بیمار ہیں اور پھر تنہا اور یہ تین' میری ہمت نہ ہوئی کہ جانے دوں مگر انہوں نے خوشامد کی' ادھر حضرت کا ارشاد تھا کہ:

"مجھے اطلاع تو کر دیا کرو۔"

خیر میں نے جاکر عرض کیا کہ ایسے ایسے تین شخص ہیں غیر مسلم معلوم ہوتے ہیں تنہائی میں ملنا چاہتے ہیں میں نے عذر بھی کیا مگر وہ نہیں مانے فرمایا:

"بلالو۔"

مگر میری ہمت پھر بھی نہ ہوئی چھوٹی اماں صاحبہ مد ظلہا سے کہا کہ یہ واقعہ ہے اور کوئی اطمینان نہیں اور حضرت فرما رہے ہیں کہ بلالو' وہ حضرت کے پاس گئیں۔ اور آکر یہی کہا کہ حضرت فرماتے ہیں کہ بلالو۔ بڑا دروازہ مشرق جانب تھا' اور ایک چھوٹا دروازہ جنوبی جانب تھا۔۔۔ درمیان میں پردہ کی قنات ہوتی تھی' میں نے ملازم سے کہا چھوٹے دروازے سے لے آؤ' مگر تم کو آڑ کے پیچھے کان لگائے رہنا' میری آواز پر فوراً" تیر کی طرح آجانا اور میں قنات کے پیچھے ہوں دیکھنے کی کوشش کروں گا' وہ لوگ آئے اور دو منٹ بعد بڑے دروازے سے واپس آگئے' پھر ملازم نے کھٹ کھٹ کی' میں حضرت کے پاس گیا تو ان میں سے ایک صاحب نے بتایا کہ ان صاحب نے منت مانی تھی۔ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو اللہ کے کسی ولی کی خدمت میں ایک لاکھ روپیہ پیش کروں گا' اور جب تک پیش نہ کردوں گا کسی سے بات نہ کروں گا۔ ہم سارے ہندوستان میں ڈھونڈ

کر یہاں آئے ہیں۔ تم کسی طرح منظور کروا دو' میں نے کہا کہ وہ اصول کے خلاف نہیں کرتے۔ ناواقف سے نہیں لیتے گھر میں آکر پوچھا کہ حضرت سے ان کی بابت خطرہ کو کہا تھا یا نہیں بتایا کہا تھا فرمایا:

"میرے دل میں کوئی کھٹک نہیں ہوئی' بلالو۔"

یہ تھا حضرت کے توکل کا عالم اسے کہتے ہیں اسلامی توکل۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ حرص و آز تو پاس بھی نہ تھی۔ اول تو اس وقت کا ایک لاکھ آج کے ایک کروڑ کے برابر ہے۔ پھر خود حضرتؒ کی نظر میں ایک لاکھ اور بھی عظیم تھا۔ ایک بار فرمایا:

"اگر میرے پاس ایک لاکھ روپیہ ہو تو سارے تھانہ بھون کو خرید کر وقف کر دوں۔"

میں دل میں سوچتا تھا کہ اللہ اللہ حضرت کے نزدیک ایک لاکھ اتنی رقم ہے کہ سارا قصبہ لیا جاسکے گا۔ پھر یہ رقم جودہ صاحبان لائے تھے حرام نہ تھی' گناہ نہ تھی' ہدیہ تھا وہ بھی اشرف نفس (دل کے انتظار) سے نہ تھا کہ خلاف سنت ہوتا' گو کافر کا تھا' مگر اصول حقہ جو مقرر کر رکھے تھے ان کے خلاف ہونے سے دین کے اصول پر زد نہ پہنچے' ذرہ برابر اس کا خیال نہیں آیا۔

ندامت و خجالت

یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن جو اعتدال اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ گو آپ بحیثیت مجتہد اپنی رائے میں بہت مستحکم تھے مگر چونکہ یہ مسئلہ بالکل اجتہادی تھا۔ اس لئے خود اپنے حلقہ ارادت کے علماء کو بھی اختلاف رائے کی پوری پوری آزادی دے رکھی تھی۔ البتہ جب بعض علماء نے حدود سے تجاوز کیا۔ اور خود آپ کو اپنی قائم کردہ رائے کے سامنے غلط ٹھہرانے کی سعی کی۔ اور جادہ اعتدال سے ہٹ گئے۔ تو حکیم الامت نے ان کو اپنے زمرہ سے نکال دیا۔ بعد کو جب خلافت کی تحریک کی آندھی ختم ہوئی اور حکیم الامت کے محسوس کردہ خدشات حقائق بن کر سامنے آگئے تو پھر ان حضرت کو ندامت و خجالت بیان سے باہر رہی لیکن اس نقصان کی تلافی نہ ہو سکی۔ (حیات اشرف ص ۲۳۵۔۲۳۷)

جانباز مرزا کاروان احرار" جلد ششم میں تحریر فرماتے ہیں کہ سیاسی معاملات میں کبھی کوئی آواز تھانہ بھون سے برسر اقتدار حکومت کے خلاف نہیں اٹھی۔ خواہ یہ حکومت اپنی ہو یا پرائی نہ ہی یہ لوگ انگریز کے خلاف کسی تحریک میں شریک ہوئے۔ تحریک ریشمی رومال ہو یا کہ تحریک خلافت کشمیر کی آزادی کی جنگ ہو یا آزادی وطن کی تحریک تھانہ بھون کے علماء ان تحریکوں سے ہمیشہ بیزار رہے (ص نمبر ۲۹۰)

جانباز مرزا صاحب پہلے فلمی دنیا میں کام کرتے رہے۔ پھر کسی ریڈیو اسٹیشن سے منسلک ہوگئے۔ پھر مجلس احرار میں علماء کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔ مجلس احرار کے بعد مجلس تحفظ ختم نبوت میں مولانا محمد علی صاحب جالندھریؒ کے ساتھ کام کیا۔ اسی دوران لاہور سے ماہ نامہ "تبصرہ" بھی جاری کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جانباز مرزا صاحب کو کبھی تھانہ بھون جانے کا شرف نہ حاصل ہوسکا۔ اور نہ ہی حضرت حکیم الامت تھانویؒ کا کوئی وعظ یا تصنیف پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ اگر ایسا ہوتا تو کبھی بھی دل میں مندرجہ بالا شعبہ پیدا نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ آپ پر سیاسی مخالفین کی طرف سے یہ بہتان لگا گئے۔

ا۔ آپ تحریک خلافت کے مخالفت تھے۔
۲۔ سلطنت اسلامیہ کے مٹنے سے خوش تھے۔
۳۔ مولانا محمود الحسن قدس سرہ کے مخالف تھے۔
۴۔ آپ کے بعض خدام ان کو برا کہتے تھے۔ اور آپ انہیں نہ روکتے تھے۔
۵۔ آپ حکومت انگریزی سے تنخواہ پاتے تھے۔

غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ جو جس کے جی میں آتا۔ کہتا رہتا۔ اور عوام میں آپ کے خلاف بدگمانیاں پھیلاتا رہتا۔ اس پر بعض حضرات نے آپ سے ان امور کی تردید کے متعلق بھی کوئی تحریر شائع کرنیکی درخواست کی اور اسکی مصلحت یہ پیش آئی کہ ایسی افترا پردازیوں سے آپ کی ذات کو نقصان نہ پہنچے گا۔ لیکن بدگمانیاں پھیلانے والوں کا دین و ایمان خراب ہوگا۔ اس پر آپ نے فرمایا۔

جواب باصواب

یہ تو اللہ کو معلوم ہے کہ یہ سب باتیں غلط ہیں۔ نہ میں نعوذ باللہ خلافت کامخالف ہوں۔ کیونکہ مسئلہ خلافت ایک اجتماعی مسئلہ ہے۔ نہ میں سلطنت اسلام کے ضعف و

زوال سے نعوذ باللہ خوش ہوں بلکہ اللہ کو خبر ہے۔ یہ سب باتیں غلط ہیں۔ اور میری یہ حالت ہے کہ جب مجھے مسلمانوں کی دینی و دنیوی تباہی کا خیال آ جاتا ہے۔ جس میں زیادہ حصہ خود مسلمانوں کی نا عاقبت اندیشی کا ہے۔ تو رگ رگ میں غم عظیم پھیل جاتا ہے۔ اور اگر کھانا کھانے میں خیال آ جاتا ہے۔ تو کھانا تلخ ہو جاتا ہے۔ اور نہ میں حضرت مولانا (محمود الحسن) کا نعوذ باللہ مخالف ہوں۔ بلکہ جس قدر محبت و عظمت حضرت قدس سرہ کی میرے دل میں ہے۔ اس کو خدا ہی خوب جانتا ہے۔ رہا کسی مسئلہ میں رائے کا اختلاف! سو ایسا اختلاف مجھ کو حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ بلکہ اپنے مرشد حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ سے بھی رہا ہے۔ اور اس اختلاف کی ان حضرات کو اطلاع بھی تھی۔ مگر کبھی ان کو تکدر نہیں ہوا۔ اس کو مخالفت کہنا غلو فی الدین ہے۔ امام ابوحنیفہ سے امام ابو یوسف و امام محمد نے باوجود شاگرد ہونے کے بہت سے مسائل میں اختلاف کیا ہے۔ تو کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ نعوذ باللہ صاحبین امام صاحب کے مخالف و معاند تھے۔ استغفراللہ تو پھر میں نہیں سمجھتا کہ محض بعض امور میں اختلاف رائے کی بناء پر جس کا درجہ میرے اعلان ملقب بہ عنوان .احقر اشرف علی کے مسلک کی شرح" میں بتلا دیا گیا ہے مجھے حضرت مولانا کا مخالف کیوں سمجھا جاتا ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ میرا یہ اختلاف حضرت مولانا کے ساتھ آج سے نہیں پیدا ہوا۔ بلکہ بہت زمانہ پیشتر کا ہے۔ پس اگر یہ اختلاف دینی حیثیت سے مضر تھا۔ تو خود حضرت مولانا نے مجھے اپنی اتباع پر کیوں نہ مجبور کیا۔ یا اس اختلاف کو مذموم کیوں نہیں فرمایا۔ اور اگر یہ اختلاف مخالفت تھا۔ تو حضرت قدس سرہ نے اخیر تک مجھ سے وہی بزرگانہ شفقت کا برتاؤ کیوں رکھا۔ یہ واقعات خود بتلاتے ہیں کہ یہ اختلاف نہ دینی حیثیت سے مضر تھا۔ اور نہ اس کو مخالفت کہا جاسکتا ہے۔

رہا یہ الزام کہ میرے بعض متعلقین حضرت قدس سرہ کے مخالف ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ میرے کسی متعلق نے حضرت کی شان میں نہ تقریراً" کوئی گستاخی کی اور نہ تحریراً" اور اگر کوئی ایسا کرتا۔ تو میں عمر بھر کے لئے اس سے قطع تعلق کر لیتا۔ بعض لوگوں نے یہ تہمت بیچارے (مولانا) مولوی ظفر احمد و (مولانا) مولوی حبیب احمد کی تحریرات پر رکھی ہے۔ مگر ان کی عبارتیں حضرت اقدس کے ساتھ شدت عقیدت و غایت احترام کو ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً" آخری پیام میں وہ دونوں لکھتے کہ "ہم نے اپنی متعدد تحریروں میں اس امر کو صاف کر دیا ہے کہ نہ ہم کو حضرت مولانا محمود الحسن

صاحب قدس سرہ سے کبھی مخالفت ہوئی اور نہ اب ہے بلکہ ہم ان کے ساتھ حسن عقیدت کو اپنے لئے ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔" نیز یہ بھی غلط ہے کہ میں گورنمنٹ سے تنخواہ پاتا ہوں اگر کسی کے پاس اس کا کوئی ثبوت ہو تو میں عام طور پر ہر شخص کو اجازت دیتا ہوں کہ وہ پیش کرے۔ اور اگر وہ پیش نہ کر سکے اور یقیناً" نہیں کرسکتا تو اس کو چاہئے کہ توبہ کرے۔ اگر کوئی مجھ سے ان امور میں مباہلہ کرنا چاہے۔ تو میں مباہلہ کر سکتا ہوں۔ مگر میں اپنی طرف سے کسی ایسے اعلان کی ضرورت اس لئے نہیں سمجھتا کہ لوگوں کو میرا معتقد ہونا یا معتقد رہنا دین میں ضروری نہیں۔ اہل حق میں سے جس کے بھی متبع ہو جائیں۔ ان کے لئے کافی ہے۔" (النور ماہ جمادی الاخر ۱۳۳۹ھ)

دراصل آپ کو گورنمنٹ برطانیہ کا ایجنٹ مشہور کرنے کی وجہ یہ تھی کہ۔

الف ۔ حضرت تھانوی ہی پاکستان بننے کے سب سے زیادہ اور اولین خواہاں تھے۔

ب ۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے واجب الاحترام لیڈروں کی موافقت کے باوجود آپ مسلمانوں کے کانگرس میں شامل ہونے کے سخت مخالف تھے۔

ج ۔ آپ قائداعظم کی دینی تربیت فرما رہے تھے اور مسلم لیگ کی حمایت کرکے قائداعظم کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ جس کا قائداعظم نے بعض موقعوں پر فخریہ اظہار فرمایا تھا۔ بلکہ وائسرائے تک سے بھی ذکر کیا تھا۔ تاکہ قائداعظم کے نیک مقاصد کو نقصان پہنچایا جائے جس کی تفصیل اگلے ابواب میں آرہی ہے۔

دینی ضیاع

حضرت تھانوی کے متذکرہ بالاجواب باصواب پر جس کی نظیر مشاہیر کی تاریخ و کردار میں ملنی مشکل ہے۔ مخلصین نے عرض کیا کہ آپ نے جو کچھ فرمایا وہ صحیح ہے لیکن لوگوں کا دین بدگمانیوں۔ افترا پردازیوں۔ سب و شتم سے برباد ہو رہا ہے۔ جواب شائع ہونے سے اس کا تدارک ہو جائے گا۔ "تو آپ نے فرمایا:۔

ازالہ ضیاع

"جب لوگ خود ہی اپنا دین برباد کریں۔ تو میں کیا کرسکتا ہوں۔ کیا وہ یہ نہیں سمجھتے کہ کسی بے گناہ پر تہمت لگانا گناہ ہے؟ ضرور جانتے ہیں۔ پھر کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ یہ تمام باتیں جو میری طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ ایسی ہیں جن کا کوئی ثبوت ان

کے پاس نہیں۔ ضرور جانتے ہیں۔ تو پھر جب باوجود ان باتوں کے جاننے کے وہ ایسی باتیں میری طرف منسوب کرتے ہیں تو گویا وہ قصداً" گناہ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ تو ایسی حالت میں میں کیا کرسکتا ہوں اگر میں ایسا کروں بھی۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگو! میں اچھا ہوں۔ تم مجھے برا نہ کہو۔ سو مجھ کو اس سے غیرت آتی ہے۔ اور اگر بادل ناخواستہ میں گوارا بھی کرلوں۔ تو اس پر شبہ ہوسکتا ہے۔ کہ اپنی غرض سے ایسا کرتا ہے۔ اس شبہ کو کیونکر رفع کیا جائے۔ دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ دنیا میں سب ہی نادان نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں سمجھدار حضرات بھی ہیں۔ جو میری حالت سے بخوبی واقف ہیں۔ اور یقیناً" جانتے ہیں کہ یہ تمام باتیں جو میری طرف عوام منسوب کرتے ہیں۔ غلط ہیں اور لوگ ناحق بدگمانیاں کرکے معاصی میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ پس اگر عوام کے دین کی حفاظت کی ضرورت تھی۔ تو اس کی تدبیر یہ تھی کہ واقف حضرات خود بدگمانیوں کو رفع کرتے اور لوگوں کو نفع پہنچاتے۔ اور ان کا ایسا کرنا مفید بھی ہوتا۔ کیونکہ وہ بے لوث تھے۔ اور مجھ پر غرض کا شبہ بھی ہوسکتا ہے۔ جس کو میں دور نہیں کرسکتا۔ میرا مقصود یہ نہیں کہ میں ایسا چاہتا ہوں۔ میں نے معاملہ خدا کے سپرد کر رکھا ہے۔ مقصود صرف اس سوال کے جواب میں اس طریق سے اطلاع کر دینا ہے۔ ان وجوہ سے جو تدارک میرے اختیار میں تھا۔ وہ صرف یہ تھا کہ میں ان تمام لوگوں کو جو ناحق بدگمانی افترا۔ سب و شتم کرکے گناہ میں مبتلا ہوئے ہیں معاف کردوں۔ سو میں نے دل سے انکو معاف کر دیا ہے۔ اس سے آگے میرے قبضہ سے باہر ہے۔" (بحوالہ صدر)

شرافت نفس

انہی بہتان طرازیوں کے سلسلہ میں حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی نے بھی مورخہ ۱۰ جون ۱۹۳۲ء کو حضرت تھانوی کو حسب ذیل اطلاع بھیجی کہ:

"پچھلے دنوں جناب والا سے متعلق عجب عجب اتہامات سننے میں آئے۔ ایک صاحب نے ایک مشہور مولوی صاحب کے حوالہ سے بیان کیا کہ جناب نے یہ فتویٰ دے رکھا ہے کہ جب تک جسم پر ولایتی کپڑے کا کوئی جزو نہ ہوگا۔ نماز درست نہ ہوگی۔ معاذ اللہ! ایک دوسرے صاحب نے بیان کیا کہ آپ نے "بیان القرآن" سورۃ المائدہ کی آیت

ولتجدن اشد الناس عدواۃ

کے تحت میں گورنمنٹ انگریزی کے ساتھ موالات و مودت فرض قرار دی ہے۔ پہلے افترا کی تو زبانی تردید کرکے خاموش رہا۔ اس دوسرے افتراء کی تردید اصل تفسیر سے اقتباس دے کر اب کی ہفتہ کے پرچہ "سچ" میں کر رہا ہوں۔"

(حکیم الامت ص ۲۲۴) آپ نے انہیں لکھا کہ:

"یہ آپ کی محبت ہے۔ مگر مجھ کو تو طبعاً" اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ اس اتہام میں نہ ان کا ضرر نہ میرا۔ بلکہ جواب دینے میں ان کا یہ ضرر ہے کہ اب تو وہ اتہام میں معذور ہیں اور جب وہ جواب پر مطلع ہو کر قبول نہ کریں گے تو عاصی ہوں گے۔ تو ایک مسلمان کو عاصی بنانا کیا فائدہ۔"

ایسے حالات میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ۔

ہیں مطابق فہم انسانی کے سب اس کے اصول
علم و حکمت کے قریب اور عقل و دانش کے قریں

اور خسرو دربار اشرفیہ یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ

کہیں نہ دیکھا کہیں نہ پایا جمال ایسا کمال ایسا
دکھائے کوئی اگر ہو دعویٰ جمال ایسا کمال ایسا

اختلاف والتفات

بہترین لوگ

حضور نبی کریم صی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"تم میں بہترین لوگ وہ ہیں۔ جن کی صورت دیکھ کر اللہ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ جن کی بات سے علم میں ترقی ہوئی ہو اور جن کے عمل کو دیکھ کر آخرت کی رغبت پیدا ہوتی ہو؟"

(جامع الصغیر)

یہ ایک حقیقت نفس الامری ہے کہ اگر تعصب کی عینک اتار کر۔ خالی الذہن ہو کر۔ رنج اور غصہ کے جذبات سے علیحدہ ہو کر دیکھا جائے۔ تو یہ تینوں خصوصیات مندرجہ ذیل بزرگوں میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ جن کا نہ صرف مشاہدہ بلکہ اعتراف خلق کثیرہ کو ہے۔

۱۔ حضرت شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیو بندی رحمۃ اللہ علیہ

۲۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

۳۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ

اعلان جنگ

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ اللہ جل شانہ' فرماتے ہیں کہ:

"جو شخص میرے کسی ولی سے دشمنی رکھے۔ میری طرف سے اس کو اعلان جنگ ہے۔" (مشکوٰۃ و بخاری)

ایک اور حدیث میں ہے کہ:

"جو میرے کسی ولی کی اہانت کرتا ہے۔ وہ میرے ساتھ مقابلہ کے لئے سامنے آتا ہے۔" (فتح الباری)

صاحب مظاہر حق نے لکھا ہے کہ:

"اللہ سے بندہ کی لڑائی دلالت کرتی ہے۔ اس کے خاتمہ بد ہونے پر۔"

حق تعالیٰ نے سود کھانے والوں اور اپنے بہترین لوگوں یعنی اولیاء اللہ کو ستانے والوں کے سوا اور کسی کے خلاف اعلان جنگ نہیں فرمایا۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کو ستانا یا انکو برا بھلا کہنا کتنا گناہ عظیم ہے۔

نتیجہ جنگ

اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مذکور الصدر حضرات کے خلاف زبان لعن و طعن دراز کرنے والے اہل علم ہیں جو بوجہ بغض و حسدان کے اجتہادی اختلافات کو دانستہ اہمیت دے کر لوگوں کو ان بزرگوں سے بدگمان کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں آگاہ فرمایا:

"ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے دریافت فرمایا کہ تم لوگ مفلس کس کو کہتے ہو؟ صحابہؓ نے عرض کیا۔ جس کے پاس مال نہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ مفلس نہیں ہے بلکہ حقیقتاً" مفلس وہ شخص ہے کہ جو قیامت کے دن بہت سی نیکیاں لے کر حاضر دربار ہوگا۔ مگر اس نے دنیا میں کسی پر ظلم کیا تھا۔ کسی کو گالیاں دی تھیں۔ کسی کا مال چھینا تھا۔ قیامت میں روپیہ پیسہ تو ہے ہی نہیں۔ وہاں تو سارے حساب نیکیوں اور گناہوں سے پورے کیئے جاتے ہیں۔ اس لئے ان مظالم کے بدلے میں اس شخص کی نیکیاں ان لوگوں کو دلائی جائیں گی جن پر ظلم کیا تھا اور انکو برا بھلا کہا تھا۔ اور جب اس شخص کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی۔ تو بہرحال ان کے تو حقوق کو پورا کرنا ہی ہے۔ اس لئے بقدر ان حقوق کے جس قدر گناہ ان لوگوں کے وزن میں آئیں گے۔ وہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے تو اصل مفلس یہ ہے۔ جو بہت کچھ کمائی (نماز۔ روزہ اور دینی کاموں کی) لے کر گیا تھا اور ملا یہ کہ دوسروں کے گناہ بھی سر پڑ گئے۔"

گویا سوء خاتمہ کے امکان کے ساتھ حبط اعمال کی سزا کا بھی امکان ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کوئی صاحب ایمان نہ اللہ تعالیٰ سے جنگ مول لے سکتا ہے اور نہ عاقبت کا یہ خسارہ برداشت کر سکتا ہے۔ اس لئے لازمی طور پر یہ لوگ وہی ہوسکتے ہیں جن کو شیاطین الجن والانس کہا گیا ہے اور حضرت تھانوی کا ایسے لوگوں کو بامید عفو حق معاف

کر دینا انہیں یوم حساب کے عذاب سے بچانے سے سعی بلیغ کرنا ہے۔ جو آپ کے بہترین لوگوں کے زمرہ سے ہونے کی بے نظیر مثال ہے۔

پروپاگنڈا کا نتیجہ

متذکرہ بالا ہر سہ بزرگوں کے خلاف اشرار کی پھیلائی ہوئی افترا پردازیوں' کذب بیانیوں اور بدگمانیوں سے جن کی تفصیل پچھلے باب میں گزر چکی ہے۔ جہاں عوام دھوکہ کھا بیٹھے تھے۔ وہاں اہل علم بھی پریشان ہو کر اپنے اکابر سے ان کی وضاحت چاہنے لگے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں۔

ا ۔ حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ مدیر الفرقان نے حضرت تھانویؒ سے ان سوالات کا جواب چاہا:

الف: حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ و مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب (رحمتہ اللہ علیہ) کو حضرت والا کیسا سمجھتے ہیں۔ اور کیا اپنے مخصوص و معلوم سیاسی معتقدات کے باوجود یہ حضرات لائق احترام ہیں۔

ب: جو افراد یا اخبارات ان حضرات کی شان میں بے باکانہ کلمات استعمال کرتے ہیں مثلاً" شیخ الاصنام۔ شیخ الہنود۔ اجودھیا باشی اور لالہ مہاشہ وغیرہ ان کو حضرت کیسا سمجھتے ہیں۔ اور وہ شرعی مجرم ہیں۔ یا نہیں۔

ج: حضرت والا ان حضرات کو سیاسیات میں اختلاف رائے کے باوجود نیک نیت اور دیانت دار سمجھتے ہیں یا بد دیانت اور خائن۔ اور ان حضرات کی سیاسی جدوجہد کیا حضرت کے نزدیک اخلاص اور ملت کی خیر طلبی پر مبنی ہے۔ یا کسی خودغرضی اور خود مطلبی پر (بوادر النوادر ص ۹۶۳)

۲ ۔ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمتہ اللہ علیہ شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور سے ان کے ایک مرید نے بھی استفسار کیا کہ:

الف: حضرت تھانوی اور حضرت مدنی میں باوجود دونوں کے مخلص اور اہل اللہ ہونے کے اتنا شدید اختلاف کیوں ہے۔ کیا مخلصوں اور دینداروں میں بھی ایسا اختلاف ہو سکتا ہے۔

ب : آپ کے نزدیک کون حق پر ہے۔ اور ان مسائل میں آپ کی کیا رائے ہے۔

ج : علماء کا وقار عمداً" گرایا جارہا ہے۔ بے تکلف سب و شتم کیا جاتا ہے۔

د: علماء کے اختلاف سے بہت نقصان رہا ہے۔ مسلمان تباہ ہو رہے ہیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ وغیرہ (الاعتدال فی مراتب الرجال)

یہ سوالات چونکہ اہل علم کی طرف سے تھے۔ اس لئے دونوں حضرات نے ان کے جواب بھی علمی دیئے۔ جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ حضرت تھانوی کے جوابات رسالہ "دشق الغین عن حق علی و حسین" (جو بو اور النوادر ص ۹۶۳ پر موجود ہے) اور مولانا محمد زکریا صاحب کے جوابات رسالہ "الاعتدال فی مراتب الرجال" میں ملاحظہ فرمائے جاسکتے ہیں۔

اشرار کی طرف سے چونکہ ان بزرگوں کے خلاف اب تک پروپاگنڈا جاری ہے۔ اور انکو ایک دوسرے کا مخالف ظاہر کرکے عوام میں تفریق کا بیج بویا جارہا ہے۔ اس لئے ان حضرات کی باہمی تعلقات اور اختلافات پر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ تاکہ ایک بہت بڑے تاریخی فریب کا پردہ چاک کیا جائے۔

نوعیت مسائل

جن مسائل کو وجہ اختلاف بنا کر اکابر کے خلاف شدو مد سے پروپاگنڈا کیا جاتا رہا اور کیا جارہا ہے۔ انکی نوعیت حضرت تھانوی کے الفاظ میں اس سے زیادہ نہیں کہ:

"بعض مسائل قطعی ہوتے ہیں۔ ان میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی۔ بعضے اجتہادی و ظنی ہوتے ہیں۔ ان میں سلف سے خلف تک شاگرد نے استاد کے ساتھ۔ مرید نے پیر کے ساتھ قلیل جماعت نے کثیر جماعت کے ساتھ واحد نے متعدد کے ساتھ اختلاف کیا ہے۔ اور علمائے امت نے اس پر نکیر نہیں کی۔ اور نہ ایک دوسرے کو ضال اور عاصی کہا ہے نہ کسی نے دوسرے کو اپنے ساتھ متفق ہونے پر مجبور کیا۔ نہ اختلاف کے ہوتے ہوئے باہم بغض و عداوت ہوا نہ مناظرہ پر اصرار کیا گیا۔ چنانچہ مشاجرات میں صحابہ کا اختلاف اور علیحدہ رہنے والوں کی علیحدگی کا سب کا جائز رکھنا معلوم ہے۔

ایسے مسائل اجتہادی ظنیہ میں اختلاف دو طرح سے ہوا ہے۔ ایک دلائل کے اختلاف سے جیسے حنفی شافعی میں قرات خلف امام کے مسئلہ میں دوسرے واقعات یا عوارض کے اختلاف سے جیسے امام صاحب اور صاحبین میں نکاح صابیات کے مسئلہ میں کہ جن کو تحقیق ہوا۔ کہ وہ اہل کتاب میں سے ہیں۔ انہوں نے اس نکاح کو جائز

رکھا۔ اور جن کو تحقیق ہوا کہ وہ اہل کتاب میں سے نہیں۔ انہوں نے اس نکاح کو ناجائز رکھا۔ مگر اس واقعہ کی تحقیق میں اختلاف ہوگیا۔ کہ آیا وہ کتابی ہیں یا غیر کتابی۔ اس لئے فتویٰ میں اختلاف ہوا۔ یا حنفی شافعی میں تعین سورۃ فی الصلواۃ کے مسئلہ میں کہ شافعی نے نفس عمل کو منقول عن الشارع دیکھ کر اس کو جائز کیا۔ اور امام صاحب نے عارض اعتقاد یا ابہام اعتقاد و وجوب حالا" یا مالا" پر نظر رکھ کر اس کو مکروہ فرمایا۔"

شیخ الہند سے اختلاف

بعینہ یہی حالت متذکرہ صدر ہرسہ بزرگان دین کے اختلافات کی تھی۔ جس کی وضاحت خود حضرت تھانوی نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے "ذکر محمود" میں یوں فرمائی:

"حضرت مولانا رحمتہ اللہ علیہ جب مالٹا سے تشریف لائے۔ تو بعض خاص اسباب سے بعض خاص معاملات میں بعض خاص خیالات ظاہر فرمائے۔ اور اعلانا" و عملاً" ان میں حصہ لیا۔ جس کا مبنی محض خلوص کے ساتھ اسلام اور اہل اسلام کی خدمت تھی۔ چونکہ وہ مسائل اجتہادی تھے۔ جن میں شرعا" گنجائش اختلاف کی ہوتی ہے۔ اور ان میں بعضے پہلو دینوی و دینی خطرات بھی رکھتے تھے۔ جو شرعا" واجب التحرز تھے۔ بعض اہل علم نے ان خطرات و مضرات پر نظر کر کے ان تحریکات میں رایا" و عملاً" شرکت نہیں کی۔ اور احقر کا خیال بھی ان ہی علیحدگی رکھنے والوں کے موافق تھا اور اس علیحدگی کو اکثر اہل محبت مفرط نعوذ باللہ حضرت کی مخالفت سمجھتے تھے۔"

حضرت تھانوی نے مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے حضرت شیخ الہند کی یوں وکالت فرمائی کہ:

"حامیاں کانگرس میں سے بعض حضرات کانگرس کے اشتراک کو استاذی مولانا دیوبندی" کا اتباع سمجھتے ہیں۔ اور بعض اصحاب اس اختلاف کو مثل اختلاف حنفی و شافعی کے خیال کرتے ہیں۔ سو میرے نزدیک یہ دونوں خیال محض غلط ہیں۔ حضرت مولانا کا اشتراک مصالحت تھا۔ نہ کہ متابعت۔ یعنی اس وقت تحریک خلافت نہایت قوت پر تھی۔ جس سے حضرت مولانا کو قوی امید تھی کہ حکم اسلام کا غالب ہوگا۔ اور ہم لوگوں کا خیال قرائن اور وجدان سے اس کا عکس تھا۔ سو یہ اختلاف محض رائے کا اختلاف تھا۔ اور مثل اختلاف حنفی و شافعی کے اجتہادی تھا۔ اس اشتراک میں متابعت کے شائبہ

کا وہم بھی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وقت کسی شعار اسلامی کے ضعف یا کسی شعار کفر کی قوت کا ذرا شبہ بھی ہوتا تھا۔ اس پر نکیر شدید فرماتے۔ چنانچہ مشاہدہ متواترہ اس کا شاہد ہے۔ بخلاف اس وقت کی حالت کے کہ اب کانگریس کی قوت سے کفرو شرک کا حکم غالب ہے۔ اس کی ہر تجویز سے موافقت و مداہنت کی جاتی ہے۔ اس وقت کا اشتراک بصورت ادغام بالکل متابعت ہے۔ جو کہ ناجائز ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو اپنی تقویت اور تنظیم مستقل لازم ہے تاکہ اس کے بعد جو اشتراک ہو۔ وہ مصالحت ہو۔ متابعت نہ ہو۔ خلاصہ یہ کہ اشتراک ایک لفظ مشترک ہے۔ مگر اس کے دو فردوں کا یعنی مصالحت و متابعت کا حکم جدا جدا ہے۔ پس حقیقی امتیاز کے بعد محض لفظی اشتراک سے اشتباہ نہ ہو جائے۔" (بوادرالنوادر ص ۹۶۹)

شیخ الہند کی عنایات

انہی اختلافات کے زمانہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت تھانویؒ سے استفسار فرمایا کہ ان مسائل میں جب اختلاف ہے مجھ کو کیا کرنا چاہئے۔ آپ نے جواب دیا کہ "حضرت (شیخ الہند) ہم سب کے بڑے ہیں۔ مجھ پر ان کو ترجیح دینا چاہئے۔ باقی میرا معاملہ جدا ہے۔

اور جب حضرت شیخ الہند کی توجہ حضرت تھانوی کے اختلاف کی طرف دلائی گئی تو انہوں نے آپ کی طرف نکیر نہیں فرمائی بلکہ فرمایا کہ:

الف : "میں جو کچھ کر رہا ہوں۔ کیا مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے۔ میری ایک رائے ہے سو اس کی (یعنی) حضرت تھانوی کی بھی ایک رائے ہے۔ اس میں اعتراض و شکایات کی کیا بات ہے۔"

ب : "اختلاف تو ٹھیک نہیں۔ میرے جی میں یہ آتا ہے کہ میں ہی اپنی رائے سے کچھ ہٹ جاؤں۔"

ج : یہاں تک کہ ان سے حضرت کی مخالفت سنی بھی نہ جاتی تھی۔ چنانچہ ایک اور موقع پر ایک صاحب نے بیرونی پروپیگنڈا سے متاثر ہو کر حضرت تھانوی کو حضرت شیخ الہند کا مخالف سمجھتے ہوئے ان سے گفتگو کے دوران میں آپ کی شان کے خلاف کوئی کلمہ کہہ دیا۔ اس پر انہوں نے اسے تنبیہہ فرمائی کہ:

"تمہیں یہ کس طرح معلوم ہوا کہ جو میرا خیال ہے۔ وہی صحیح ہے۔ اور حق

ہے۔ اور مولانا تھانویؒ کا جو خیال ہے۔ وہ سراسر غلط ہے۔ تم نے جس جس جگہ مولانا تھانوی کی نسبت کچھ کہا ہے۔ وہاں مولانا تھانوی کی مدح و تعریف کرو۔ تاکہ اس کا تدارک ہو جائے۔"

د: ایک اور موقع پر بعض نادان دوستوں نے حضرت شیخ الہند کو تحریکات کی تقویت کے لئے تھانہ بھون لیجانا چاہا۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ:

"وہاں مولوی اشرف علی صاحب موجود ہے۔ میرے جانے سے اس کو تنگی ہو گی۔ کیونکہ موافقت تو اس کی رائے کے خلاف ہوگی۔ اور عدم موافقت سے شرمائے گا اس لئے وہاں نہیں جاتا۔"

ر: اسی طرح ایک اور موقع پر فرمایا:

"تم کیوں بار بار اس پر اعتراض کرتے ہو۔ وہ بھی دین کا ایک کام کر رہا ہے۔"

شیخ الاسلام کا رجوع

"شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی حضرت تھانویؒ کے خلیفہ خاص تھے۔ مگر تحریک خلافت وغیرہ کے دوران میں ہر دو بزرگوں کے درمیان بھی شدید اختلاف ہوگیا۔ حضرت تھانوی کی تحریک خلافت سے علیحدگی کے سلسلہ میں لوگوں نے جوش میں آپ کو مطعون کرنا شروع کر دیا۔ تو اس وقت کی مسائل حاضرہ پر علماء دیوبند نے ایک فتویٰ دیا۔ جس میں تحریر تھا کہ:

"مسائل حاضرہ میں ہمارا مسلک تو بالکل وہی مسلک ہے جو حضرت استاد مولانا مولوی محمود الحسن صاحب رحمتہ اللہ علیہ مقرر فرما گئے ہیں۔ لیکن بہ نسبت مولانا اشرف علی صاحب کے بسبب حسن ظن کے ہمیشہ تاویل کی ہے۔ کبھی تفسیق نہیں کی اور نہ کسی کو اجازت دی۔"

اس فتویٰ پر دیوبند کے دیگر بزرگوں کے علاوہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے بھی دستخط تھے۔ جس پر انہوں نے اپنی طرف سے یہ الفاظ بھی بڑھا دیئے تھے کہ
اما منا فمولانا التھانوی یسئل عنی ولا اسأل عنہ
کہ میرا یہ رتبہ نہیں کہ مجھ سے مولانا تھانوی کے متعلق پوچھا جائے۔ بلکہ اگر ان سے میری نسبت پوچھا جائے تو زیبا ہے اور جو کسی کی سمجھ میں کچھ اور آوے۔ تو خود صاحب عبارت سے پوچھ لیا جاوے۔

جب یہ جوش کا زمانہ گزر گیا۔ اور آہستہ آہستہ سب کو ہوش آنے لگا تو حضرت شیخ الاسلام نے بھی فورا" اپنے شیخ کی طرف رجوع کرلیا۔ جس کی اطلاع حضرت تھانوی نے ان الفاظ میں مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کے استفسار پر دی کہ:

"مولوی شبیر احمد صاحب نے ہمت کی کہ اعلان تجویز شدہ کو خود لطیف بنا کر مجھ سے موافقت حاصل کرکے شائع کرادیا۔ خود بھی آئے تھے۔ مگر اعلان کے قبل بھی ملنے آئے تھے۔

میں اکرام و احترام سے ملا۔ باتیں بھی کیں۔" (حکیم الامت ص ۴۳۸)

مولانا عثمانی کے رجوع سے حضرت کو اتنی مسرت ہوئی کہ انکی مریدانہ حیثیت کو مساوی بنا دیا۔ اور اس کے متعلق آپ نے مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کو لکھا کہ:

"جب اعلان آیا۔ وہ موجود نہ تھے۔ ورنہ بلا کر خود ملتا۔ اب آئیں گے تو بشاشت بھی ہوگی۔ البتہ یہ کہہ دوں گا کہ اب ملنا پہلی حیثیت سے نہیں۔ اس لئے اب میرے ساتھ تعظیم یا استفادہ کا برتاؤ نہ کیا جاوے۔ مساویانہ یارانہ برتاؤ رکھا جائے۔ اور انکو بھی چاہئے کہ اسکو قبول کرلیں۔" (بحوالہ صدر)

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ صاحب اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

مولانا محمود الحسن اور مولانا تھانوی کا آپس میں استاد شاگرد کا رشتہ تھا۔ مولانا تھانوی نے اپنے استاد گرامی حضرات شیخ الہند کی سوانح ذکر محمود جس عقیدت سے لکھی اس سے دونوں کے تعلقات کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اگرچہ دونوں مذہبی راہنما ایک ہی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے لیکن تحریک خلافت کے متعلق دونوں کا مسلک مختلف تھا۔ ایک مرتبہ خود مولانا تھانوی نے فرمایا "سبحان اللہ حضرت دیوبندی (حضرت محمود الحسن) کی عالی حوصلگی قابل دید ہے میرا مسلک تو حضرت کے مسلک سے ظاہرا" مختلف تھا ڈھکا چھپا نہ تھا مگر حضرت ذرا بھی دلگیر نہ ہوئے۔(۱)

لیکن ان اختلافات نے دونوں کے باہمی تعلقات اور ایک دوسرے کے احترام میں ذرہ برابر بھی کمی نہ ہونے دی۔ اس کا اندازہ مولانا تھانوی کے ملفوظات پر ایک نظر ڈالنے سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ تحریک خلافت کے دوران بعض لوگوں نے یہ مشہور کر دیا کہ مولانا تھانوی اپنے استاد مولانا محمود الحسن کے مخالف ہوگئے۔ مولانا تھانوی کو جب اس افواہ کا علم ہوا تو آپ نے اس کی پر زور تردید کرتے ہوئے اپنے رسالہ النور میں لکھا "اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ یہ تمام باتیں غلط ہیں۔ نہ حضرت اقدس سے مجھے یا میرے کسی متعلق کو مخالفت ہے۔ نہ میں حضرت کا نعوذ باللہ مخالف ہوں۔ بلکہ جس قدر محبت۔ عظمت حضرت اقدس کی میرے دل میں ہے اس کو خدا بہتر جانتا ہے۔ مجھ پر حضرت کی مخالفت کا الزام سراسر بہتان ہے۔

مولانا محمود الحسن عام طور پر شیخ الہند کے لقب سے پہچانے جاتے تھے لیکن مولانا تھانوی آپ کو ہمیشہ شیخ العالم اور شیخ الاسلام کے القاب سے یاد فرماتے تھے۔ ایک مجلس میں فرمایا "تم بڑے فخر سے) کہتے ہو۔ اسیر مالٹا تھے ہم کہتے ہیں کہ امیر مالٹا تھے۔ تم کہتے ہو کہ شیخ الہند تھے ہم کہتے ہیں کہ شیخ العالم تھے۔ اب بتاؤ مولانا کا زیادہ معتقد کون ہے۔"

مولانا تھانوی کے نزدیک شیخ الاسلام کو شیخ الہند کہنا مولانا کی تنقیص کے برابر تھا۔ ایک مجلس میں اس سلسلے میں فرمایا کہ "جب کوئی حضرت مولانا محمود الحسن کو شیخ الہند

کہتا ہے تو میرے دل پر پتھر سا لگتا ہے کیونکہ شیخ الاسلام کو شیخ الہند کہتے ہیں۔ بہت برا معلوم ہوتا ہے اس میں حضرت کی تنقیص معلوم ہوتی ہے۔ ان مدعیان محبت نے ہمارے حضرت کی شان کو پہچانا نہیں۔ ہند کوئی اسلامی سلطنت ہے کہ جس کی وجہ سے شیخ الہند کہنے پر فخر ہے۔ ایک اور مجلس میں فرمایا "اکثر لوگ حضرت دیو بندی کو فخراً" شیخ الہند لکھتے ہیں۔ مجھ کو اس قدر ناگوار ہوتا ہے کہ شیخ العالم کو شیخ الہند کہتے ہیں۔ بس افسوس ہے ان کی سمجھ پر۔ ان کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کوئی وائسرائے کو کانسٹیبل کہے۔ یہ اہانت نہیں ہے؟ یہ تعریف ہے؟ جس کو مولانا رومی کہتے ہیں۔

شاہ را گوید کسے جولاہا نیست
ایں نہ مدح است او مگر آگاہ نیست

اگر ایسا ہی تھا تو شیخ العرب کہنا چاہئے تھا۔ نسبت بھی کی تو کفر کے ملک سے۔ یہ کون سے فخر کی بات ہے۔ ایک اور مجلس میں فرمایا "حضرت مولانا کی ذات بڑی عجیب ہے مدعیان محبت نے تو ان کو پہچانا ہی نہیں۔ ہمارے اعتقاد میں تو وہ شیخ الہند و السندو العرب و العجم ہیں۔

مولانا تھانوی اکثر مولانا محمود الحسن کی تواضع حسن' اخلاق اور محبت کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ .حضرت استاذی مولانا محمود الحسن مجسم اخلاق تھے۔" ایک مجلس میں مولانا دیو بندی کے تذکرہ پر فرمایا "میں جب کبھی دیو بند گیا تو بہت کم ایسا ہوا کہ میں حاضری میں سبقت کر سکا ہوں۔ ورنہ حضرت خود تشریف لاتے تھے۔

ایک سال مولانا محمود الحسن حج کے لیے تشریف لے گئے تو مولانا تھانوی کے متعلق یہ مشہور کیا گیا کہ آپ نے حدیث کا دورہ شروع کرایا ہے۔ اس واقعہ سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ مولانا تھانوی کو اس بات کا انتظار تھا کہ مولانا محمود الحسن ہندوستان سے جائیں اور ہماری دکان چمکے۔ اس بے بنیاد تہمت تراشی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے مولانا تھانوی نے فرمایا کہ "اگر میں مولانا کے سامنے ہی شروع کر دیتا تو کون سا گناہ تھا بلکہ حضرت مولانا ہی سب سے زیادہ خوش ہوتے"۔

تحریک خلافت کے دوران مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے مولانا تھانوی کو ایک خط لکھا کہ "حضرت بڑی مشکل میں ہوں کیا کروں' بڑوں کے درمیان ہوں۔" اس پر مولانا تھانوی نے آپ کو لکھا کہ "مولانا (محمود الحسن) سب کے بڑے ہیں۔ مولانا ہی کے فرمانے پر عمل کرنا چاہئے۔ اگر میں تنہا ہوتا تو خود بھی حضرت کا ساتھ دیتا"۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ "

اگر مولانا (محمود الحسن) مجھ کو تحریک (خلافت) میں شریک ہونے کا حکم فرماتے تو چونکہ میں چھوٹا تھا اس لیے مجبور ہو جاتا مگر حضرت کو کبھی اس کا خطرہ بھی نہیں ہوا بلکہ خیال آیا تو یہ کہ اپنے ایک خاص خادم پانی پتی سے فرمایا کہ بھائی یہ اختلاف تو اچھا معلوم نہیں ہوتا لاؤ میں ہی اپنی رائے سے رجوع کرلوں۔"

اگرچہ مولانا محمود الحسن تحریک خلافت کے روح رواں تھے مگر آپ نے ہمیشہ خلاف شرعی امور اختیار کرنے پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ مولانا تھانوی اپنے استاد کے اس انداز فکر کی بہت تعریف فرماتے۔ اسی طرز عمل کے متعلق ایک مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ "حضرت محمود الحسن کے متعلق فلاں راوی ہیں۔ انہوں نے اپنے کانوں سے سنی اور آنکھوں سے دیکھی ہے کہ جس وقت حضرت مالٹا سے تشریف لائے تو بمبئی کی بندرگاہ پر استقبالی گروہ بہت زیادہ تعداد میں موجود تھا۔ حضرت مولانا اور وہ مولوی صاحب ایک موٹر میں تھے اور بعض دوسرے لیڈر بھی موجود تھے۔ جس وقت موٹر چلا تو ایک دم اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوا اور اس کے بعد گاندھی کی جے، محمد علی اور شوکت علی کی جے اور مولانا محمود الحسن کی جے کے نعرے بلند ہوئے۔ حضرت نے شوکت علی کا دامن پکڑ کر کہا کہ یہ کیا۔ اس پر شوکت علی نے کچھ خیال نہ کیا تو حضرت نے دوبارہ سختی سے فرمایا کہ اس کو بند کرو۔ اس پر شوکت علی نے کہا کہ حضرت جے کے معنی فتح کے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو رام رام کہا کرو اور جو کچھ بھی ہو یہ شعائر کفر ہے۔ اور اسی طرح حضرت نے دیوبند اور اس کے قرب و جوار میں اپنے اہتمام سے قربانیاں بھی کروائیں"۔

مولانا تھانوی اپنے استاد مولانا محمود الحسن کی تواضع، حق پرستی اور بے نفسی کے بیحد مداح تھے اور اکثر اپنی مجالس میں آپ ان صفات کا ذکر اور تعریف فرماتے۔ ایک مجلس میں فرمایا کہ "اپنے حضرات کی جو شان، ان کی حق پرستی اور بے نفسی دیکھی ایسا کسی کو بھی نہ دیکھا حضرت مولانا محمود الحسن رحمتہ اللہ علیہ جب مالٹا سے تشریف لائے تو میں بھی بغرض زیارت دیوبند حاضر ہوا تھا۔ حضرت نے بڑی شفقت فرمائی۔ وہ باتیں اس وقت یاد آتی ہیں تو ان حضرات کو آنکھیں ڈھونڈتی ہیں۔"

مندرجہ بالا واقعات اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ مولانا تھانوی اپنے استاد مولانا محمود الحسن کا کس قدر احترام و عزت کیا کرتے تھے۔ اب شاگرد کے متعلق استاد کی رائے بھی ملاحظہ ہو تاکہ دونوں کے باہمی تعلقات محبت اور ایک دوسرے کے لیے

جذبات و احساسات کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ کچھ لوگوں نے مولانا محمود الحسن سے مولانا تھانوی کی تحریک خلافت میں عدم شمولیت کی شکایت کی تو اس پر آپ نے فرمایا کہ "ہم کو اس پر بھی فکر ہے کہ ایسی ہمت کا آدمی بھی ہم میں سے ہے کہ جس نے تمام دنیا کی پرواہ نہ کی۔ جو اس کی رائے میں حق ہے اس پر استقلال سے قائم ہے۔ کسی کے دباؤ یا اثر کو ذرہ برابر حق کے اتنا اہم نہیں۔" مولانا تھانوی نے اس جواب کے متعلق فرمایا کہ اصل جواب وہی تھا جو مولانا محمود حسن نے دیا۔ مولانا خلیل احمد کا جواب تواضع کا جواب تھا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ

مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا حسین احمد مدنیؒ دو مختلف سیاسی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے اور دونوں بزرگان دین کے سیاسی رجحانات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اس امر کے متعلق اعتراف کرتے ہوئے ایک اور خط میں تحریر فرمایا کہ "حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے ہمارا سیاسی اختلاف ہے اور بہت زیادہ اختلاف۔"

مولانا تھانوی تحریک خلافت سے علیحدہ رہے جبکہ مولانا مدنی نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مولانا مدنی مسلمانوں کا ہندوؤں سے اتحاد اور تعاون نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دیتے تھے۔ اسی بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے آپ نے ایک خط میں تحریر فرمایا کہ "ہندوستان کی آزادی کے بارے میں دیگر مسلم جماعتوں سے اشتراک نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ ایک اور مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا" آج موقع ہے کہ بڑے دشمن (انگریز) سے ترک موالات کیجئے۔ اس کو زک دینے کے لیے غیروں (ہندوؤں) کو ساتھ لیجئے۔ اگرچہ انگریز معاملہ چھوت چھات کا نہیں کرتے مگر اسلام کے بدترین دشمن ہیں۔ بخلاف ہندو کے کہ یہ ہمارے پڑوسی ہیں اگرچہ کافر ہیں پڑوسی حق رکھتا ہے۔

اس کے برعکس مولانا تھانوی ہندو مسلم اتحاد کو بے معنی، سطحی اور پر فریب مفروضہ سمجھتے تھے مولانا کی یہ پختہ رائے تھی کہ ہندو انگریزوں سے زیادہ مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ اسی لیے آپ اس بات کے خواہش مند تھے کہ ہندو اور انگریز دونوں کے ساتھ عدم تعاون کیا جائے کیونکہ دونوں ہی اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ مولانا تھانوی ہندو مسلم اتحاد کے دل فریب اور کھوکھلے نعرے میں بالکل یقین نہیں رکھتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں آپ کا کہنا تھا کہ "اگر حکومت ہندو اور مسلمانوں کے ہاتھ میں آجائے اور تیسری قوم بے دخل بھی ہو جائیں کامیابی تب بھی ہندوؤں کی

ہوگی۔ ایک تو ترکیب کے لحاظ سے دوسری ان کی اکثریت کی بناء پر تیسرے ان کے طبائع کی حالت پر نظر کرکے۔ اور عقلی طور پر مقصود حکومت عادلہ ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک میں یہ احتمال ہی نہیں کہ عدل ہو جیسا کہ ہندوؤں کی کارگزاری سے ظاہر ہے کہ وہ مسلمانوں کو ہندوستان سے مٹانا چاہتے ہیں۔ یہ اپنے دلی مذاق سے باز نہ آئیں گے۔"

کیا طلبہ بالخصوص دینی مدارس کے طلبہ کو سیاست میں حصہ لینا چاہئے۔ یہ مسئلہ بھی دونوں زعماء کے درمیان اختلاف کا سبب بنا۔ ایک طرف تو مولانا تھانوی نہ صرف طلباء بلکہ اساتذہ کے بھی سیاست میں حصہ لینے کے سخت خلاف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب دارالعلوم دیو بند کے طلبہ اور اساتذہ نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا تو مولانا تھانویؒ نے درالعلوم دیو بند کی سرپرستی سے استعفیٰ دے دیا۔ مولانا تھانویؒ فرماتے تھے کہ "طالب علمی کے زمانے میں کسی اور شغل میں مشغول ہونا، تعلیم کو برباد کر دیتا ہے۔ طالب علم کے لیے یکسوئی اور جمعیت قلب بہت ضروری ہے۔ اس کے برباد ہونے سے تعلیم برباد ہو جاتی ہے۔ میں نے زمانہ طالبہ علمی میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت ہونے کی درخواست کی تھی تو اس پر حضرت نے فرمایا تھا کہ جب تک کتابیں ختم نہ ہو جائیں اس خیال کو شیطانی سمجھنا۔ مولانا تھانوی کی خیال میں اگر طلباء سیاست میں ملوث ہوں گے تو اپنے اصل مقصد تعلیمی سے دور ہٹ جائیں گے۔

ادھر مولانا حسین احمد مدنیؒ طلباء کے سیاست میں حصہ لینے کے حامی تھے۔ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں "نوجوان طلباء کو اپنی تعلیمات کو پورا کرنا چاہئے اور ایام طالب علمی میں کسی ملکی سیاست میں حصہ نہ لینا چاہئے ہاں فارغ اوقات میں حصہ لینا صحیح ہے ایک اور خط میں تحریر فرمایا کہ "طلباء نے جلسے کیئے بے شک جلوس کیئے ادارہ اہتمام نے روکا تو نہیں اس سے زیادہ اور کیا جرم تھا"۔

کانگرس کے بارے میں بھی دونون زعماء متضاد رائے رکھتے تھے۔ جہاں ایک طرف مولانا تھانوی کانگرس میں مسلمانوں کی شرکت کو ان کی دینی موت قرار دیتے تھے وہاں دوسری جانب مولانا حسین احمد مدنی کھلم کھلا اپنے آپ کو کانگرس کا حامی ہونے کا اعلان فرماتے اور کانگرس کو ملک کی "مشترکہ جماعت" قرار دیتے تھے"

کانگرسی رہنما گاندھی کے بارے میں بھی دونوں کی ایک رائے نہیں تھی بلکہ مولانا مدنی تو گاندھی کو مہاتما گاندھی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اور مولانا تھانوی اسی گاندھی

کو دجال، طاغوت، شیطان، عدو اسلام، بد فہم، بددین، چالاک، مکار کے خطابات سے یاد کرتے ہیں۔

لیکن ان تمام نظریاتی اختلاف نے دونوں زعماء کے ذاتی تعلقات میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ دونوں نے اختلاف کے باوجود شائستگی اور وقار کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اس کا اندازہ دونوں کے خطوط اور ملفوظات پڑھکر بخوبی ہوسکتا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی ۱۹۲۸ء میں مولانا حسین احمد مدنی کے ہمراہ تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ مولانا دریا آبادی کے اپنے الفاظ میں "مولانا اشرف علی تھانوی نے مولانا حسین احمد کا استقبال تپاک اور التفات سے کہا۔ مولانا دریا آبادی اپنی باطنی اور روحانی اصلاح کیلئے ایک مرشد کی تلاش میں تھے اور اس سلسلے میں ان کی نگہ انتخاب مولانا تھانوی اور مولانا بدنیؒ پر پڑی۔

بالاخر صلاح و مشورہ کے بعد مولانا دریا آبادی نے مولانا حسین احمد مدنی کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ بیعت کے بعد مولانا مدنی نے مولانا دریا آبادی کو ایک خط لکھا جو ظاہر کرتا ہے کہ سیاسی اختلافات کے باوجود دونوں حضرات ایک دوسرے کا کس قدر احترام کیا کرتے تھے۔ مولانا مدنی نے لکھا "آپ تو خانقاہ (اشرفیہ) پہنچ گئے ہوں گے۔ خداوند وہاں کی حاضری کو باعث غیر مشابہہ کرے۔ میں نے حسب ارشاد حضرت مولانا تھانوی دامت برکاتہم اور آپ حضرات کے ارشاد پر اس وقت بیعت کرلی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی بدحالی روسیاہی اور ناکامی پر بہت زیادہ گریاں ہوں اور سخت شرمندہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مولانا دامت برکاتہم کے دربار میں پہنچا دیا ہے۔ مولانا کو آپ سے اور آپ کو مولانا سے انس پیدا ہوگیا ہے۔ اب ضروری اور مناسب ہے کہ آپ مولانا (تھانوی) سے بیعت کرلیں۔"

مولانا مدنی کے مکتوبات پر ایک نظرڈالیے جس جگہ بھی مولانا تھانوی کا ذکر آیا ہے وہاں آپ کو دامت برکاتہم یا رحمتہ اللہ علیہ کے الفاظ ملیں گے۔ مولانا مدنی ایک صاحب کو لکھتے ہیں حضرت مولانا دامت برکاتہم کی خدمت اقدس میں جس قدر بیٹھنا میسر ہو غنیمت جانئیں۔ ایک 'ور صاحب کو مشورہ دیا کہ "حضرت تھانوی کے مواعظ خرید لیجئے بہت مفید ہیں۔ ان کا مطالعہ ضرور رکھیں۔" ایک اور خط میں تحریر فرمایا کہ "موجودہ مشائخ میں حضرت مولانا خلیل احمد، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عزیز الرحمٰن اور مولانا شبیر احمد عثانی یہ جملہ حضرات ہر قسم کے کمالات کے حاوی ہیں اور بعض مسائل میں

بعض حضرات کا اختلاف ہونا دوسری بات ہے۔ اس لیے ان بزرگوں سے استخارہ مسنونہ مکرر کر لینے کے بعد تعلق پیدا کرنا ضروری اور مفید ہے۔" ایک صاحب نے مولانا حسین احمد سے بذریعہ خط دریافت کیا کہ "کیا یہ درست ہے کہ مولانا تھانوی نے شیخ الہند (مولانا محمود حسن) کو قید کروایا تھا اور کیا مولانا گورنمنٹ کی مخبری کرتے تھے اور مشرکانہ عقائد رکھتے تھے۔" مولانا مدنی نے ان تمام لغو اور بے بنیاد الزامات کی تردید کرتے ہوئے واضح الفاظ میں لکھا کہ "یہ بالکل غلط ہے کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ نے حضرت شیخ الہند کو مالٹا میں نظر بند کروایا تھا۔ وہ حضرت شیخ الہند کے شاگرد اور محبین میں سے تھے البتہ تحریک آزادی میں ان کی رائے خلاف تھی نہ انہوں نے مخبری کی اور نہ ان کو انگریزوں سے اس قسم کے تعلقات رکھنے کی نوبت آئی۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ معاذ اللہ ہرگز مشرکانہ عقائد نہیں رکھتے تھے۔ بہت توحید پرست اور خدا پرست تھے۔ تصوف میں ان کا قدم بہت راسخ تھا۔ پیری مریدی بھی حضرت قطب عالم حاجی صاحب اور حضرت گنگوہی کے حکم پر انکی اجازت سے کرتے تھے۔ علم ظاہر میں بھی ان کا قدم بہت راسخ تھا۔ حضرت تھانوی کے نہ صرف صحیح مسلمان ہونے کا معتقد ہوں بلکہ ان کو بہت بڑا عالم اور صوفی کامل مانتا ہوں۔ ہاں سیاست میں ان کی رائے کو غلط سمجھتا ہوں۔ اس بارے میں میرا کامل یقین ہے کہ میرے اور حضرت تھانوی کے استاد حضرت شیخ الہند کی رائے نہایت صحیح اور واجب الاتباع تھی۔ یہ حضرت تھانوی کی اجتہادی غلطی تھی جس کی وجہ سے حضرت تھانوی کی شان میں نہ خود گستاخی کرتا ہوں نہ کسی کی گستاخی کو روا رکھتا ہوں۔ مولانا تھانوی سے شدید سیاسی اختلاف رکھنے کے باوجود فرمایا کہ "جزئیات اور فروع اور اسلامک لاء جس کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں انمیں انکا (مولانا تھانوی) قول قابل اعتماد ہوگا۔ مولانا موصوف کا اسلامی تفقہ اور علوم و فنون میں تمام عمر مصروف رہنا' ان کی تعلیم دینا' ان میں اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنا' ان میں بے شمار مفید اور کار آمد تصانیف تالیف کرکے عالم اسلام اور خلائق کو فیضیاب بنانا آفتاب کی طرح دنیا میں روشن ہوچکا ہے"

مولانا تھانوی کی نسبت ایک خط میں مولانا دریا آبادی کو لکھا "آنجناب کی توضیحات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ یہ ناکارہ حضرت دامت برکاتہم کا نہایت معتقد اور ان کی تعظیم و احترام کو نہایت ضروری سمجھتا ہے۔ ان کی قابلیت اور کمال کے

سامنے اتنی بھی نسبت نہیں رکھتا جتنی طفل دبستان کو افلاطون سے ہو سکتی ہے۔"

یہ تو تھی مولانا تھانوی کے متعلق مولانا مدنی کی رائے۔ مولانا تھانوی کی جانب سے بھی مولانا مدنی کے لیے اسی نوعیت کے جذبات کا اظہار کیا جاتا تھا مولانا تھانوی نے اپنی ایک مجلس میں فرمایا کہ "ہم انقلاب چاہنے والوں کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ نعم البدل ہو بئس البدل نہ ہو۔ افسوس ان حالات کے مشاہدہ کے بعد بھی بعض علماء ان لیڈروں کا ساتھ دیتے ہیں اور وہ لیڈران کو منہ بھی نہیں لگاتے حتیٰ کہ جو نرے لیڈر ہیں ان کے نام اور کارنامے اخباروں میں چھپتے ہیں اور مولوی صاحب دہلوی (احمد سعید) و مدنی صاحب اس قدر کام کرتے ہیں ان کا کہیں نام تک نہیں"

مولانا خیر محمد جالندھری نے مولانا مدنی کے متعلق فرمایا کہ "ہمارے اکابر دیوبند میں بفضل تعالیٰ، کچھ نہ کچھ خصوصیات ہوتی ہیں۔ چنانچہ شیخ مدنی کے دو خداداد کمالات میں جو ان میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ایک تو مجاہدہ جو کسی دوسرے میں اتنا نہیں دوسرے تواضع چنانچہ سب کچھ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتے" مولانا تھانوی نے اپنی ایک مجلس میں مولانا حسین احمد مدنی کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ "مولوی حسین احمد صاحب بہت شریف طبیعت کے انسان ہیں۔ باوجود سیاسی مسائل میں اختلاف رکھنے کے کوئی کلمہ خلاف حدود شرع ان سے نہیں سنا گیا۔"

دونوں زعماء کے تعلقات کے ضمن میں مولانا سید محمد میاں نے راقم کو لکھا کہ غالباً" ۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی گرفتار ہوئے۔ گرفتاری کی خبر جب حضرت تھانوی کو پہنچی تو آپ بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مولوی حسین احمد سے مجھے اتنا قلبی تعلق ہے انکی گرفتاری سے میرے دل پر چوٹ لگی۔ اسی سلسلے میں یہ بھی فرمایا کہ کھانا نہیں کھایا گیا مولانا تھانوی نے فرمایا کہ "مجھ کو اپنی موت پر بھی فکر تھا کہ میرے بعد باطنی خدمت کرنے والا کون ہوگا مگر مولوی حسین احمد کو دیکھ کر تسلی ہوئی کہ دنیا ان سے زندہ رہے گی۔" ایک اور موقعہ پر مولانا مدنی کے متعلق فرمایا کہ "میں حسین احمد کو ان کے سیاسی کاموں میں مخلص اور بہترین جانتا ہوں ان سے حجت کے ساتھ اختلاف ہے اگر وہ حجت رفع ہو جائے تو میں ان کے ساتھ ایک ادنیٰ سپاہی بن کے کام کرنے کو تیار ہوں"۔

مندرجہ بالا خطوط اور ملفوظات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مولانا تھانوی اور مولانا مدنی سیاسی معاملات میں ایک دوسرے سے اختلاف رائے رکھنے کے باوجود ایک دوسرے کا

کس قدر احترام و عزت کیا کرتے تھے۔ مندرجہ بالا امثال اس بات کو بھی ثابت کرتی ہیں کہ مولانا تھانوی کا تحریک خلافت سے اختلاف اصولوں پر مبنی تھا اور اس سلسلے میں شخصی رجحانات و نظریات اس کا سبب نہیں بنے۔

"جب محمد علی جناح یعنی قائداعظم کی وفات ہوئی تھی تو مولانا مدنیؒ نے ان کی ہمشیرہ محترمہ مس فاطمہ جناح اور مسٹر لیاقت علی خان کے نام تار دیا تھا' اور مرحوم قائداعظم کی تعزیت کی تھی' اور حضرت مدنیؒ نے یہ کہا تھا کہ مجھے مسٹر محمد علی جناح کے فوت ہونے پر بڑا افسوس ہے اور میں ان کے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی بخشش اور مغفرت فرمائے۔"

قائداعظمؒ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی نظر میں

تحریک پاکستان کے دوران میں علماء حضرات کی ایک کثیر تعداد پاکستان کے مخالف کیمپ میں جا بیٹھی تھی اس کیمپ میں جہاں کچھ عالم ایسے تھے جن کا مؤقف خلوص پر مبنی تھا وہاں کچھ نام نہاد علماء ایسے بھی تھے جو دینی علم میں صفر اور سیاست کی ابجد سے نا آشنا لیکن مسلم لیگ کی قیادت پر شرعی اعتراض کرنے میں پیش پیش تھے اور قائداعظم کو کافر اعظم تک کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ علماء کی ایک جماعت نہ صرف تحریک پاکستان کی دل و جان سے حامی بلکہ قائداعظم کے بارے میں نہایت اعلیٰ خیالات رکھتی تھی۔ مولانا تھانوی اس جماعت کی قیادت کر رہے تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح اور مولانا تھانوی کے درمیان باقاعدہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا جیسا کہ مولانا تھانوی کے مندرجہ ذیل ملفوظ سے ظاہر ہے۔ اس ملفوظ سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ مولانا تھانوی قائداعظم کے بارے میں نہایت عمدہ رائے رکھتے تھے۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۸ء کو مولانا تھانوی نے ایک مجلس میں دوران گفتگو فرمایا "جس زمانہ میں مسلم لیگ اور کانگرس میں مفاہمت کی گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے ایک خط مسلم لیگ کے صدر جناح صاحب کو اس مضمون کا لکھا کہ مفاہمت میں چونکہ مسلمانوں کے امور دینہ کی حفاظت نہایت اہم اور ضروری ہے آپ شرعی مسائل میں اپنی رائے کو داخل نہ کریں بلکہ محققین سے پوچھ لیا کیجئے۔ اس پر انہوں نے نہایت شرافت سے جواب دیا اور اطمینان دلایا کہ آپ کی ہدایت کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

ایک خط قائداعظم کی طرف سے لکھا گیا جس میں آپ نے تحریر فرمایا کہ "مجھ کو مظہرالدین نیز نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب سے گفتگو کرنے کا موقع ملا اور میں یہ معلوم کرکے بہت خوش ہوا ہوں کہ آپ کو آل انڈیا مسلم لیگ کے مقصد اور پروگرام سے پوری ہمدردی ہے مجھ کو آپ کا خط ملا لیکن موجودہ متعدد مشاغل اور عدم حاضری بمبئی کے سبب آپ کو اس سے قبل جواب نہ دے سکا۔ چند نکات جو میرے سامنے

پیش کیے گئے ہیں میں نے ان کو بغور تحریر کر لیا ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ان کے متعلق آپ سے ضرور مشورہ کروں گا۔ جب وقت آئے گا۔ آپ کی مہربانی۔"

خوش قسمتی سے اسلام آباد میں محفوظ قائداعظم کے کاغذات میں مولانا تھانوی کا ایک اور خط بنام قائداعظم دستیاب ہوا ہے۔ یہ خط ۱۹۳۸ء میں لکھا گیا۔ مولانا تھانوی کے دل میں قائداعظم محمد علی جناح کے لیے جس قدر عزت اور احترام موجود تھا۔ اس خط کا ایک ایک لفظ اور سطر اس کی نشاندہی کر رہا ہے کہ ہندوستان کا ایک جید عالم دین قائداعظم کے "الطاف نامہ" آنے کو فخر سمجھ رہا ہے۔ خطِ کا متن ملاحظہ ہو۔

مکرمی و محترمی دام مجد کم السلام علیکم و رحمتہ اللہ۔ الطاف نامہ نے مسرور و ممنون اور غایت درجہ مطمئن فرمایا۔ دل سے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دین اسلام کی قوت کا ذریعہ بنا دیں۔ میں بکثرت دعا میں مشغول رہتا ہوں اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ واقعی جیسا کہ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ آپ کی بہت سے مشاغل ہیں اور بہت اہم ہیں اور میں ایک منٹ کے لیے بھی گوارا نہیں کرتا کہ ان میں کسی درجے کا بھی حرج ہو۔ اس بناء پر بلا تکلف عرض کرتا ہوں کہ میری معروضات کے جوابات دینے کا اہتمام نہ فرمایا جائے۔ میں انتظار نہ کروں گا صرف اس کی اجازت دینا کافی ہوگا کہ کسی وقت کوئی مفید بات میرے ذہن میں آوے تو اس کو عرض کر دیا کروں اور وہ آپ کے پیش نظر رہے۔ البتہ اگر میرے لائق کوئی خدمت یا مشورہ کی غرض سے کوئی استفسار ابتدا میں ذہن عالی میں آوے تو الطاف نامہ آنے کو فخر سمجھوں گا"۔

مولانا تھانوی نے ایک مرتبہ مجلس میں فرمایا "میں خواب بہت کم دیکھتا ہوں مگر جب دیکھتا ہوں تو اکثر صحیح ہوتا ہے۔ میں نے خواب دیکھا گویا میدان حشر قائم ہے۔ اور کچھ حضرات کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ یہ علماء و صلحاء کا گروہ تھا۔ میں نے دیکھا تو مسٹر جناح بھی ایک عبا پہنے اس گروہ میں کرسی پر بیٹھے ہیں۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ مسٹر جناح اس گروہ میں کس طرح شامل ہوگئے ہیں تو معاً" ایک بزرگ نے جواب دیا کہ مسٹر جناح آج کل مسلمانوں اور اسلام کی بہت خدمت کر رہے ہیں اس لیے ان کو یہ اعزاز بخشا گیا ہے۔" یہ خواب کلکتہ کے اخبار عصر جدید میں بھی شائع ہوا تھا۔

مولانا تھانوی قائداعظم محمد علی جناح کو پکا راسخ مسلمان اور اسلام کا خادم سمجھتے تھے

اس کی تائید مولانا ظفر علی خان نے اپنی ایک نظم بڑا مولوی میں مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے۔ اس نظم میں ان علماء پر طنز کی گئی جو متحدہ قومیت کے حامی تھے اور قائداعظم کے مذہبی رجحانات کے بارے میں غلط فہمی کا شکار تھے۔

وطن جس کی رو سے ہے بنیاد ملت
میں اس کی شرع کی کر رہا پیروی ہوں
سکھاتا ہے جو ناچنا اور گانا
میں اس مدرسہ کا بڑا مولوی ہوں
مجھے لیگ سے اس لیے دشمنی ہے
وہ عبدالنصاریٰ میں عبدالقوی ہوں
سمجھ لوں میں جینا کو کیونکر مسلماں
کوئی میں بھی اشرف علی تھانوی ہوں

علیحدہ مملکت کا تصور اور آرزو

مولانا تھانوی مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کے قیام کے خواہش مند تھے اور اسی لیے بارہا اپنے ملفوظات میں اپنی اس خواہش کا اظہار فرماتے رہے۔ آپ کے ملفوظات کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آپ کے نزدیک مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کا قیام ان کے تمدن، مذہب اور رسوم و رواج کے تحفظ کے لیے کس قدر ضروری تھا۔ اس کے لیے آپ نے بار بار مسلمانوں کا مرکز کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے خیال میں علیحدہ مملکت کا تصور سب سے پہلے حضرت تھانوی کے یہاں ہی سنا گیا۔ آپ نے اس سلسلے میں تحریر فرمایا کہ "یاد کر لیجیے کہ ۱۹۲۸ء کا زمانہ تھا اور ایک مخاطب روزنامہ ہمدرد کا ڈائریکٹر تھا۔ صبح اور دوپہر کی طویل صحبت میں سیاسی پہلوؤں پر گفتگو آجانا ناگزیر سا تھا۔ گفتگو ہوئی حضرت نے اتنی معقولیت سے گفتگو کی کہ ساری بدگمانیاں دور ہوگئیں۔ پاکستان کا تخیل، خالص اور اسلامی ریاست کا خیال یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں۔ پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہی کانوں میں پڑی تھیں۔

مولانا تھانوی نے اپنی ایک مجلس میں دوران گفتگو فرمایا "جو اصل چیز ہے کہ مسلمانوں میں دین پیدا ہو۔ ان کی قوت ایک مرکز پر جمع ہو ان کا کوئی امیر ہو اس کا

toobaa-elibrary.blogspot.com

کہیں نام و نشان نہیں۔ میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر مسلمان مضبوطی کے ساتھ اپنے دین کے پابند ہو جائیں اور اپنی قوت کو ایک مرکز پر جمع کرلیں اور جس کو اپنا خیر خواہ سمجھیں اس کو اپنا امیر بنالیں اور اس کے مشورہ پر عمل کریں تو پھر ان کو کسی کی شرکت کی ضرورت نہ ہو نہ ان کو کسی سے خوف کی کوئی ضرورت ہوگی۔"

۱۹۳۸ء میں ایک انتخاب کے سلسلے میں مسلم لیگ نے تھانہ بھون میں جلسہ منعقد کیا۔ اس جلسے کے انعقاد کی اجازت خود مولانا تھانوی نے مرحمت فرمائی تھی۔ اسی جلسہ میں مولانا کے ایک خادم خاص حافظ جلیل احمد شروانی نے بھی شرکت کی۔ جلسہ کے اختتام پر حافظ صاحب نے مولانا تھانوی کو جلسہ کی کارروائی سے آگاہ کیا۔ حافظ جلیل احمد نے لکھا "پس احقر مبارک بیان سن کر اور کثیر الاجتماع جلسہ سے فارغ ہو کر خانقاہ میں حاضر ہوا تو دوپہر کا وقت تھا۔ دیکھا کہ حضرت مرشدی حکیم الامت سہ دری میں رونق افروز ہیں۔ احقر نے اس جلسہ کا حال بیان کیا اور اس دوران مجھ پر گریہ طاری ہوگیا۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت دیکھ کر حضرت نے ایک تقریر فرمائی۔ اس تقریر کے دوران میں حضرت نے یہ بھی فرمایا کہ فلاں صاحب اس زمانے میں میرے پاس وہ مضمون لکھ کرلائے جو اس جلسہ میں میری طرف سے پڑھا گیا تو اس مضمون کے اندر لکھا کہ جب لوگوں کو نماز کی ترغیب دی جاتی ہے تو وہ جواب میں یوں کہتے ہیں کہ خالی نماز روزے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ لوگ یورپ کے ملاحدہ کے مقلد ہیں۔ مسلمانوں کا غلبہ دونوں ہی چیزوں پر موقوف ہے۔ میری یہ رائے آج سے نہیں بلکہ ہمیشہ سے ہے۔

اس کے بعد مجھ سے دریافت کیا کہ مسلمانوں کو قتال کی اجازت ہجرت کے بعد ہوئی اس کی کیا وجہ ہے۔ قتال کی اس قدر ضرورت تھی مگر جب تک ہجرت نہ ہوئی اس وقت تک اجازت نہ ملی تھی۔ احقر نے بیان کیا کہ مسلمانوں کے پاس ہتھیار نہ تھا اور سامان نہ تھا ارشاد فرمایا "اجی ہتھیار تو خود مقابل سے لے جاتے ہیں۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کا مکہ میں مرکز نہ تھا اور جہاد کے لیے مرکز ضروری ہے۔ ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کو مرکز حاصل ہوگیا تب اس کی اجازت ہوئی۔ اب اس وقت بھی مسلمانوں کے لیے دشواری یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی مرکز نہیں لہٰذا سخت ضرورت ہے کہ مسلمانوں کا کوئی مرکز قائم ہو۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ان کے اندر کوئی امیر المومنین ہو جو تین صفات رکھتا ہو' ایک تو دین دوسری سیاست تیسرے ان کے اندر ہمت بھی ہو۔"

۱۵ ستمبر ۱۹۳۸ء کو ایک مجلس میں فرمایا "معلوم نہیں ان تحریکات کا انجام کیا ہوگا مگر مجھ کو ابھی امید ہے کہ انشاء اللہ خیر عظیم کا ظہور ہونے والا ہے۔ میں ابھی تک مایوس نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جنات کا اس وقت کا مقولہ جب کہ وہ اور شیاطین آسمان پر جاتے تھے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے تھے۔ نقل فرماتے ہیں وانا لانلدری اشر اریدبمن فی الارض ام اراد بھم ربھم رشدا یعنی ہم نہیں جانتے کہ اس نئے نظام سے کیا ظہور پذیر ہوگا۔ اس سے اہل زمین کو ضرر پہنچے گا یا اللہ تعالیٰ ان کو نفع پہنچانا چاہتے ہیں بالکل اسی طرح ان تحریکات میں دونوں احتمالات ہیں گو جنات کا یہ مقولہ محل خیر میں تردد کا تھا اور میرا محل شر میں تردد کا تھا مگر میرا خیال وہی ہے جو میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں۔ میری دلی تمنا اور دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حکومت عادلہ مسلمہ قائم فرمادے اور میں اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔

مسلم لیگ کے دعوتی خط کا جواب

ناکارہ، آوارہ، ننگ انام اشرف برائے نام بخدمت ارکان مسلم لیگ نصرہم اللہ و نصر ہم اللہ السلام علیکم لیگ کے عزائم معلوم کرکے اس آیت پر عمل کی توفیق ہوئی قل بفضل اللہ و برحمتہ فبذلک فلیفرحوا لیکن اگر اس کے ساتھ ہی عذر نہ ہوتا تو اس آیت پر بھی عمل ہوتا انفروا خفافا وثقالا" لیکن عذر کے سبب اس رخصت پر عمل کی اجازت ملگئی لیس علی الضعفاء ولا علی المرضٰی ولا علی الذین لایجدون ماینفقون حرج اذا نصحو للہ و رسول لیکن اس کے ساتھ ہی اس آیت کا شرف حاصل ہوگیا کہ اپنی دو کتابوں کا پتہ دیتا ہوں جو انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک آنیوالی نسلوں کے لئے پیام عمل ہے۔ ایک حیات المسلمین شخص اصلاح کے لئے دوسری صیانتہ المسلمین جمہوری نظام کے لئے۔ ان کے مضامین اپنے موضوع میں گو رنگین نہیں۔ مگر سنگین ہیں جس میں وہی فرق ہے جو ذوق و غالب کی اشعار میں اور حکیم محمود خاں، حکیم محمد صادق خاں کے نسخوں میں اور نمائندہ وہ کام نہ کرسکتا جو یہ کتابیں کر سکتی ہیں مگر عمل شرط ہے۔ جیسے اعلیٰ درجہ کاماء اللحم بوتلوں میں بھرا ہوا قیمتی مگر نتیجہ خیز نہیں یہ نفع اس کا اس وقت ظاہر ہوگا جب حلق سے اترے گا، ورنہ بدون عمل یہ سب کوشش اسکا مصداق ہوں گی، نشستند، و گفتند و برخاستند۔ باقی دعا ہر حال میں خصوص ان تاریخوں میں زیادہ

اہتمام سے جاری رکھوں گا بقول کسی شاعر کے لاخیل عندک تھدیھا ولا مال + فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال

(نوٹ) میں دونوں کتابیں اگر یہاں مل گئیں تو ۲۲ اپریل کو ڈاک سے ہدیتہ" روانہ کرونگا ورنہ دہلی میں کسی کتبخانہ تجارتی سے تلاش کی جائیں۔ والسلام

بعد تحقیق معلوم ہوا کہ حیاۃ المسلمین بلا قیمت جاسکتی ہے سو اس کا نسخہ روانہ کر رہا ہوں، نیز یہ معلوم ہوا کہ صیانتہ المسلمین یہاں نہیں ہے، لہٰذا وہاں تلاش کرالی جائے۔

ناظرین نے دیکھا کہ کس عنوان سے اور کس اہتمام سے اور کس دلسوزی سے پیغام حق پہنچا دیا، عمل کرنا نہ کرنا دوسروں کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے۔ غرض اپنی ساری عمر اسی طرح اسلام کی خدمت اور مسلمانوں کی فکر سعی، بہبود و فلاح ہی میں گذار دی۔ جزاہ اللہ عن جمیع المسلمین احسن الجزاء

یہ تو سیاسی خدمت تھی جسکو اسی حد تک انجام دیا جو تحت قدرت تھی۔ اور اہل تبلیغ کے شایان شان تھی۔ اور خدمت دینی میں تو اپنی ساری زندگی ہی گذاری جیسا کہ حالات وفات کے ضمن میں بہ تفصیل عرض کیا گیا۔ افادہ و افاضہ دینی کا تو اتنا شوق تھا کہ کسی حال میں بغیر اس کے چین ہی نہ آتا تھا جیسا کہ بعض حالات متذکرہ بالا سے ناظرین نے اندازہ فرما لیا ہوگا۔ اس کے متعلق اتفاق سے میری سابقہ مکتوبات حسن العزیز کی کاپی میں جو اس وقت میرے سامنے ہے اہل علم و فضل کے دو مختصر خواب مع حضرت اقدس رحمتہ اللہ علیہ کی دی ہوئی تعبیروں کے نظر سے گذرے جنکا اس مقام پر نقل کر دینا اچھا معلوم ہوا اور بیساختہ جی چاہا کہ محض تائیدا" و تقویتہ" و تفریحا" ہدیہ ناظرین کردوں

(پہلا خواب) دیکھتا ہوں کہ آپ کا سینہ مبارک دودھ سے بہت بھر گیا جس سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے اس تکلیف کو کم کرنے کے لئے میں نے بائیں جانب پر منہ لگایا اور دودھ نکالتا ہوں کچھ نگلتا ہوں اور کچھ کچھ گراتا جاتا ہوں

(تعبیر) مجھکو تعبیر سے کوئی خاص مناسبت نہیں لیکن غالبا" آپ اس عذر کو تکلیف سمجھیں گے اس لئے۔ زصاف دور و پیش آرانچہ داری + پر عمل کرتاہوں، خواب کے رائی کوئی خورد و مرئی لہ، کوئی بزرگ ہوتے تو میں درجہ ظن میں یہ تعبیر دیتا تجویز کرتا

کہ مرئی لا کو اللہ تعالیٰ نے ایسے نافع علوم عطا فرمائے ہیں جن کے افادہ کا ان پر تقاضا ہے اور عدم استفادہ سے ناگواری ہے' رائی نے ان کو اخذ کیا (حالاً" یا استقبالاً) کچھ کرنا اس طرف اشارہ ہے

اگر شراب خوری جرعہ فشاں برخاک

(دوسرا خواب) تابعدار نے ایک خواب دیکھا ہے کہ میں حضور کے ہمراہ سفر میں ہوں۔ حضور نے فرمایا کہ میں نے ایک چارپائی بنی ہے۔

(تعبیر) شاید سلاسل اربعہ مراد ہوں کہ میں نے جو طریق کی خدمت کی ہے اس سے سب سلاسل کی اصلاح ہوگئی۔ آخر وقت تک ضرورت میں سخت سخت تعب برداشت کرکے بھی خدمت دینی بجا لاتے رہے چنانچہ ایک طالب کو تحریر فرمایا "جو حالات و معمولات کی تفصیل لکھی ہے ضعف و اضمحلال کی حالت میں گو اس کا پڑھنا موجب تعب ہوا مگر پھر بھی احتیاطاً" پڑھا معلوم ہوا کہ ضروری اور غیر ضروری اور اختیاری اور غیر اختیاری مضامین میں خلط ہوگیا ہے۔ اس لئے کوئی منضبط جواب کلی ذہن میں نہ آسکا اور ہر جزو کا جواب دینے کی ہمت نہ ہوئی۔ کیونکہ ہر جزء کا بقیہ دوسرے جزء میں مخلوط تھا۔ لہٰذا آپ کی رعایت سے تطویل مضمون کو تو منع نہیں کرتا کیونکہ طبائع کو بدون اس کے تسلی نہیں ہوتی لیکن اس کی ترتیب اور ہیئت عرض کرتا ہوں کہ اگر متعدد مضامین لکھنا ہوں تو ہر جز پر نمبر ڈالا جائے اور ختم پر اس میں جو میرے کرنے کا کام ہو اس کی تصریح فرمائی جائے اس میں یہ فائدہ ہوگا کہ کئی جلسوں میں جواب لکھا جائیگا اور ایک جزء کے جواب لکھے ہیں دوسرے جز کا استحضار جزئی نہ ہوگا جیسا خلط میں ہوا یہ معیار پیش نظر رہے تو پھر طویل اور اختصار کا اختیار ہے۔

سبحان اللہ کیا کیا رعاتیں ہیں' کیا کیا تدبیریں ہیں اور کیا کیا سہولتیں ہیں تاکہ دوسرے کو اس حالت غایت ضعف و اضمحلال میں بھی نفع دینی پہنچ سکے فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔ حضرت اقدس نے ہمیشہ اپنے کو سارے مسلمانوں کا یکساں خادم فرمایا اور خدمت دین کرنے میں کبھی مرید اور غیر مرید میں فرق نہیں سمجھا اور عملاً" بھی دکھلا دیا غرض جس نے اپنی ساری عمر اس طرح خدمت خلق میں گذار دی اور گویا اپنی جان کھپا دی اور تج دی۔ اس کے لئے اگر آج دنیا ماتم کر رہی ہے' کیا موافق' کیا مخالف تو کیا تعجب کی بات ہے' اس پر حضرت اقدس کا ارشاد یاد آتا ہے کہ اب تو لوگ قدر نہیں

کرتے بلکہ بعضے مخالف ہیں لیکن بعد کو سب سر پکڑ کر روئیں گے اس وقت قدر ہو گی۔
سو واقعی یہی ہوا یاد آئے گی انہیں میری وفا میرے بعد+ اللہ تعالیٰ سب کو توفیق دے
کہ حضرت اقدس کی تصانیف کو باقاعدہ مطالعہ اور عمل میں رکھیں کیونکہ انہیں دین
اپنی اصلی اور مکمل صورت میں انشاء اللہ تعالیٰ انہیں تصانیف کے اندر نظر آئیگا' خدا
کری اہل خیر کو اس طرف خاص توجہ ہو جاوے اور جا بجا کتب خانے اشرفی سب کے
مطالعہ کے لئے کھل جائیں' جو صاحب حضرت کی تصانیف کا باقاعدہ مطالعہ فرمائیں گے
وہ انشاء اللہ تعالیٰ کھلی آنکھوں دیکھیں گے کہ علوم و معارف کے کیسے کیسے نادر بے بہا
جواہرات ان میں بھرے پڑے ہیں۔ بلکہ میں تو اس مطالعہ کو ہر مسلمان کے لئے
ضروری سمجھتا ہوں جو پڑھے لکھے نہیں ہیں ان کو پڑھے لکھے صاحبان سہل سہل کتابیں
یا مشکل مقامات کو سہل کرکرکے بوقت فراغ سنا دیا کریں' تو خود بھی فائدہ اٹھائیں اور
دوسروں کو بھی متنفع فرمائیں' نیز جو حضرات اہل علم ہیں وہ خود تصانیف کی اس طرح
خدمت بجا لائیں کہ کوئی تصوف کے مضامین کا انتخاب کر رہا ہے' کوئی نکات قرآن و
حدیث کو جمع کر رہا ہے' کوئی مواعظ کا خلاصہ یا تسہیل کر رہا ہے' کوئی مختلف زبانوں میں
ترجمہ کر رہا ہے' کوئی منتخب مضامین کی تشریح بطرز جدید کر رہا ہے' کوئی نو تعلیمافتوں
کے اشکالات کے جوابات کو یکجا کرکے ان کی بطریق نو تقریر کر رہا ہے' کوئی مضامین دقیقہ
کی توضیح کر رہا ہے' کوئی فتاویٰ کی تبویب کر رہا ہے وغیرہ وغیرہ جو صورت جس کے ذہن
میں اشاعت عام اور نفع تام کی آئے۔ واللہ الموفق

تحریک خلافت

تحریک خلافت کے متعلق تحریک کے مجاہد مولانا عبدالماجد دریا آبادی تحریر فرماتے ہیں۔

تحریک خلافت کا زمانہ بھی ہندوستان کی تاریخ میں ایک یادگار دور گزرا ہے۔ جس نے اسے دیکھا نہیں اس کے سامنے اس دور کا نقشہ کھینچنا بھی دشوار ہے۔ ایک بے پناہ ہیجان تھا' جوش میں آکر بھائی بھائی سے جدا ہو رہے تھے' باپ بیٹوں سے بیٹے باپ سے "اللہ اکبر" کے نعرے اور "محمد علی شوکت علی کی جے" کی آوازیں گھر گھر سے بلند ہو رہی تھیں۔ علماء حق کی اکثریت کا فتویٰ حکومت سے ترک موالات اور تحریک خلافت کی تائید میں تھا۔ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کا مسلک اس سے مختلف تھا۔ مسلک اجتہاد میں اختلاف تو اسلام کی تاریخ میں شروع ہی سے داخل رہا ہے۔ خلفاء راشدین کا دور بھی اس سے مستثنیٰ نہ رہا اور اگر اختلاف کی بنیاد محض حق اخلاص ہے تو یہ ذرہ بھر بھی عیب نہیں بلکہ عین رحمت ہے۔

اس وقت نوبت یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ مسلمانوں کے بڑے بڑے ذمہ دار لیڈر جن میں عالم بھی شامل تھے یہ کہتے پھرتے تھے کہ:

1۔ زبانی جے پکارنے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ اگر تم ہندو بھائیوں کو راضی کرو گے۔ بھائیو خدا کی رسی مضبوط پکڑو گے۔ اگر ہم اس رسی کو مضبوط پکڑلیں گے تو چاہے دین ہمارے ہاتھ سے جاتا رہے مگر دنیا ہمیں ضرور ملے گی۔ (مدینہ بجنور 21 فروری 1920ء)

2۔ اے اللہ ہم سے ایک نیک کام ہو گیا ہے کہ میں اور مہاتما گاندھی یقینی بھائی ہو گئے ہیں۔ (فتح دہلی 24 نومبر 20ء)

3۔ خدا نے ان (گاندھی) کو ہمارے واسطے مذکر بنا کر بھیجا ہے۔ قدرت نے ان کو سبق پڑھانے والا مدبر بنا کر بھیجا ہے۔ (بحوالہ صدر)

علاوہ ازیں مشرکین کو مساجد میں لے جا کر واعظ مسلمین بنانا' ان کے قدم کو شہر کی خاک پاک کرنے والا کہنا' ان کے جائے قدور کو قصور بہشتی پر طعنہ زن کہنا' ان کو مسیحا

کہنا' ان کو رحمت دار کہنا' ان کی ثناء میں یہ کہنا کہ خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست۔ گائے کی قربانی کا بند کرنے کا اہتمام کرنا' قشقے لگوانا' مشرک کی ارتھی اپنے کندھوں پر اٹھا کر اس کی لے بولتے ہوئے مرگھٹ لے جانا' ڈولہ سجا کر قرآن مجید کو رامائن کے ساتھ رکھنا' یہ کہنا کہ ہم ایسا مذہب بنانا چاہتے ہیں جو ہندو مسلمان کا امتیاز اٹھا دے گا۔ اگر کوئی ان نتائج کے سبب یا شرعی مانع کے سبب شرکت نہ کرے۔ اس کو کافر یا فاسق کہنا۔ اس سے عداوت رکھنا' اسے ایذا پہنچانے کی فکر کرنا' معمولات سے ہو گیا تھا۔ اس لئے حضرت تھانوی نے آغاز ربیع الثانی 1339ھ میں ایک اعلان بعنوان "مسائل حاضرہ کے متعلق احقر اشرف علی کا مسلک" شائع کیا۔ اس میں ایک فقرہ یہ تھا کہ "میں ان شورشوں کو ایک فتنہ سمجھتا ہوں۔" جس سے خلافت کے پروانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے ان خرابیوں کو دور کرنے کی بجائے ان خرابیوں کی نشاندہی کرنے والے کو ہی ختم کر دینا مناسب سمجھا۔

تحریک خلافت کے زمانے میں ترکی سلطنت کے متعلق حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہ کا ارشاد

فرمایا۔ ایک منطقی مولوی صاحب جو تحریکات کے بڑے حامی تھے کیرانہ میں ملے میں نے ان سے کہا کہ ترکی سلطنت آج کل جمہوری ہے یا شخصی' کہا جمہوری میں نے پہلے کہا بتلاؤ اس میں عیسائی یہودی وغیر ھم شریک ہیں یا نہیں۔ کہاں ہاں' میں نے کہا بتلاو مرکب کافر اور مسلم کا عقلاء کیا ہوتا ہے اسی طرح کفر و اسلام کا مجموعہ کیا ہو گا۔ کہا کافر اور کفر میں نے کہا اس حالت میں سلطنت ترکی کی اعانت مسلم کی ہے یا غیر مسلم کی۔ بڑے چکر آئے' بجائے جواب کے کہنے لگے کہ ترکوں کی اعانت کو تو آپ بھی واجب کہتے ہیں۔ میں نے کہا بس آپ کو حقیقت تو معلوم ہو گئی۔ اب سنو ہم کیوں اعانت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کفار تو ترکی سلطنت کو اسلامی سلطنت سمجھتے ہیں۔ اس واسطے ترکی کی امداد اس وجہ خاص سے اسلامی امداد ہے۔ چپ رہ گئے اور خوش ہو کر مجھ کو دو روپیہ ہدیہ دیا۔

قاتلانہ حملہ

نام نہاد "آزادی کا نعرہ" بلند کرنے والوں نے اشرار کی جماعت تھانہ بھون بھیجی۔ تاکہ اس زبان ہی کو ہمیشہ کیلئے خاموش کر دیا جائے جس سے یہ خلاف مرضی باتیں نکل رہی

تھیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ بالکل محفوظ و مامون رہے اور مخالفین کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

دوسرا دور

1930ء نے بساط سیاست کے مہرے بدل دیئے۔ مولانا محمد علی جوہر نے بعض تلخ تجربات کی بنا پر کانگرس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ گاندھی جی نے مسلمانوں کی پروا کئے بغیر سول نافرمانی کی مہم شروع کر دی۔ اس انتشار سے جمعیۃ العلماء بھی نہ بچ سکی۔ اس کا ایک بڑا حصہ تو کانگرس کے ساتھ رہا مگر قلیل حصہ اس سے کٹ کر ہمیشہ کیلئے الگ ہو گیا اور اس نے اپنی الگ جمعیت بنالی۔

مسلمانوں نے بھی غیرت کا ثبوت دیا۔ انہوں نے جب اوائل 1930ء میں دیکھا کہ گاندھی جی کو ہماری ضرورت نہیں تو انہوں نے بھی اواخر 1930ء میں گاندھی جی کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے پاکستان کا مہرہ آگے کر دیا کہ اگر تمہیں ہماری ضرورت نہیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ مل کر رہنے کیلئے تیار نہیں۔ آپ اپنے گھر میں خوش رہیں اور ہمیں ہمارا حصہ تقسیم کر کے دے دیں۔ تاکہ دونوں علیحدہ علیحدہ آزادی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔

سیاسی مسلک

سیاسی حالات نے ملک کو تین پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ انگریز کانگرس اور مسلم لیگ۔ انگریز برسر اقتدار تھا۔ کانگرس کی پشت پر ساری ہندو قوم اور اکثر مسلمان سیاسی جماعتیں تھیں۔ مسلم لیگ کے ساتھ سوائے عافیت پسندوں کے اور کوئی نہ تھا۔ مسلمانوں کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ انگریز اور ہندو دونوں ان کی کمزوری کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے اس لئے حضرت تھانوی:

"انگریزی حکومت اور کانگریس کے درمیان رسہ کشی میں مسلمانوں کو بالکل غیر جانب دار اور یکسو دیکھنا چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمان خود اپنے اندر پوری قوت نہیں پیدا کر لیتے ان کا کسی فریق کے ساتھ شامل ہو کر عملی حصہ لینا خودکشی کے مترادف ہوگا اور سارا زور اس پر دیتے تھے کہ مسلمان پہلے اپنے میں قوت و نظم پیدا کریں۔" (حکیم الامت ص 276)

طلباء اور سیاست

اس زمانہ میں حضرت تھانوی دار العلوم دیوبند کے سرپرست تھے۔ جس کے اکابر جمعیۃ العلماء ہند کے ممبر ہونے کی وجہ سے کانگرس کے ساتھ تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی دار العلوم کے طلباء نے بھی سیاست میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا۔ جو حضرت تھانوی کو سخت ناگوار گزرا۔ حضرت تھانوی کی رائے تھی کہ:

"موجودہ سیاسیات کا اشغال خواہ فی نفسہ حق ہو یا باطل۔ مگر دار العلوم کے طلباء و علماء کی اس میں شرکت بہر حال مدرسہ کے مقاصد اصلیہ کو متزلزل کر دینے والی ہے جس کا مشاہدہ و تجربہ بھی عرصہ سے اکثر حضرات کو ہو چکا ہے۔" (خاتمۃ السوانح ص 24)

اس لئے آپ نے مہتمم مدرسہ کی تائید سے ایک اعلان شائع کر دیا کہ آئندہ کیلئے سیاسی سرگرمیوں میں قطعاً حصہ نہ لیں اس سے باب نزاع کھل گیا۔

سرپرستی سے استعفیٰ

حضرت کی یہ عادت تھی کہ اختلاف کے مواقع پر جو بات بھی حق سمجھتے تھے اس کا صاف صاف اظہار اور اعلان فرما دیتے تھے۔ اگر اسے قبول کر لیا جاتا تو بہتر ورنہ خود کو اس سے علیحدہ کر لیتے تھے اور مناظرہ و مناقشہ میں پڑنا پسند نہ فرماتے تھے۔ دار العلوم دیوبند چونکہ حضرت کا علمی گہوارہ تھا اور بزرگوں کا مرکز تھا اس لئے حضرت کو اس سے بہت محبت تھی۔ جس کا کوئی دوسرا اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔ ارباب مدرسہ نے اس معاملہ میں آپ کی رائے سے اختلاف کیا۔ اس لئے آپ نے مدرسہ کے مفاد کی خاطر مدرسہ کی سرپرستی سے استعفیٰ دے دیا لیکن مدرسہ کی ہمدردی اور بہی خواہی کا تعلق برابر قائم رکھا۔

جھانسی الیکشن

کانگرس اور مسلم لیگ کی میدانی جنگ کا آغاز جھانسی کے ایک ضمنی الیکشن سے ہوا۔ جو مسلم لیگ کو 1935ء میں لڑنا پڑا۔ کانگرس مسلم لیگ کے مقابلہ میں بڑے بڑے علماء لے آئی اور لیگ کے کیمپ میں صرف مولانا شوکت علی مدیر "خلافت" اور مولانا مظہر الدین مدیر "الامان" نظر آتے تھے جنہیں صرف "اخباری مولوی" سمجھ کر دیوبند علماء کے مقابلہ میں لوگوں نے کوئی اہمیت نہ دی اور وہ مولانا شوکت علی سے کہنے لگے کہ کانگرس کی حمایت میں تو

بڑے بڑے عالم آئے ہوئے ہیں مگر مسلم لیگ کی حمایت میں کوئی بڑا عالم نظر نہیں آتا۔ جب ہر طرف سے یہی سوال ہونے لگا تو مولانا شوکت علی بہت پریشان ہوئے۔ چاروں طرف نظر دوڑائی۔ آخر ان کی نظر تھانہ بھون کی خانقاہ امدادیہ پر جا کر رکی۔ انہوں نے خیال کیا کہ جھانسی کی پہلی سیاسی جنگ میں حضرت تھانوی کا ایک پیغام ہی نقشہ جنگ بدل سکتا ہے۔ اس تصور سے مولانا سنبھلے اور مستفسرین سے فرمایا کہ آپ کو حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی پر اعتماد ہے؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ تو فرمایا بس انہی سے تار دے کر پوچھ لو۔ ووٹ کس کو دیا جائے۔ چنانچہ اسی وقت حضرت تھانوی کو تار دیا گیا کہ ووٹ مسلم لیگ کے امیدوار کو دیا جائے یا کانگرس کے امیدوار کو۔

تائید اشرف

حضرت تھانوی کانگریسیوں کے عزائم سے بخوبی آگاہ تھے مگر مسلم لیگ والوں سے بھی کچھ مطمئن نہ تھے۔ اس لئے آپ نے اب تک شرح صدر کے ساتھ مسلم لیگ کی حمایت کا کوئی فیصلہ نہ کیا تھا۔ مگر کانگرس کے ضرور مخالف تھے۔ اس لئے تار ملنے پر آپ نے کسی نتیجہ پر پہنچنے کیلئے بغرض مشورہ مولانا شبیر علی صاحب تھانوی اور مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کو بلایا۔ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور و خوض کرنے کے بعد مولانا ظفر احمد صاحب نے یہ مشورہ دیا کہ آپ صرف یہ تار دے دیں کہ کانگرس کو ووٹ نہ دیا جائے۔ حضرت کو یہ رائے بہت پسند آئی اور اس وقت اسی مضمون کا جھانسی تار دے دیا گیا۔ تار کا پہنچنا تھا کہ مولانا شوکت علی کی جان میں جان آئی۔ انہوں نے اپنے استصواب اور حضرت کے جواب کے بڑے بڑے پوسٹر چھپوا کر شہر کے در و دیوار پر چسپاں کرا دیئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیکھتے ہی دیکھتے میدان الیکشن کا نقشہ بدل گیا۔ کانگرسی علماء وہ اثر پیدا نہ کر سکے جو حضرت کے ایک تار سے پیدا ہوا۔ کانگرس کو شکست فاش ہوئی اور میدان مسلم لیگ کے ہاتھ میں رہا۔

کامیابی کا شکریہ

چونکہ حضرت تھانوی کے تار نے مسلم لیگ کی بگڑی بنا دی تھی اس لئے مولانا شوکت علی اور مولانا مظہر الدین دونوں اپنے اس محسن کا شکریہ ادا کرنے کیلئے جنہوں نے آڑے وقت میں ان کی امداد کی تھی تھانہ بھون پہنچے۔ دربار اشرفیہ میں باریابی کے بعد مولانا شوکت

علی صاحب نے حضرت کے تار کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ

"جھانسی کے میدان میں ہمارے پاس کانگرس کے برابر نہ لاریاں تھیں نہ روپیہ پیسہ تھا۔ آپ کے تار نے کچھ ایسا اثر کیا کہ کایا پلٹ دی۔ مسلمانوں میں یکایک مسلم لیگ کی حمایت کا جوش پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے ہم کامیاب ہوئے۔"

تھانہ بھون میں جلسہ

اسی رات ان ہر دو حضرات کی درخواست پر تھانہ بھون میں مسلم لیگ کی طرف سے ایک جلسہ عام ہوا جس میں انہوں نے جھانسی کے الیکشن کے حالات لوگوں کو سنائے کہ کس طرح بے سرو سامانی کے عالم میں انہیں فتح نصیب ہوئی۔ اس جلسہ میں حضرت تھانوی کی اجازت سے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے بھی لیگ کے حق میں پہلی تقریر فرمائی۔

نیا مدو جزر

اس کے کچھ عرصہ بعد کانگرس برسر اقتدار آگئی۔ جن صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی وہاں انہوں نے اپنی حکومت بنائی اور حکومت کے نشہ میں سرشار ہو کر انہوں نے مسلمانوں کو ختم کرنے کی مہم بڑی تیزی سے شروع کر دی۔ پنڈت نہرو نے بھی اس نشہ سے سرشار ہو کر مسلمانوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اعلان کر دیا کہ ملک میں صرف دو پارٹیاں ہیں۔ انگریز اور کانگرس۔ بااین ہمہ ملک کی بڑی بڑی سیاسی جماعتیں کانگرس کے ساتھ رہیں۔ جوں جوں ہندوؤں کا تشدد بڑھتا گیا مسلم لیگ قوت پکڑتی گئی۔ حالات روز بروز بدلتے گئے بلکہ بگڑتے گئے اور نئے نئے سوالات پیدا ہوتے گئے۔ اب لوگ بڑی کشمکش میں مبتلا تھے کہ کس کا ساتھ دیں جس کی وجہ سے روزانہ حالات حاضرہ کے متعلق تھانہ بھون میں بیسویں استفسار آرہے تھے۔

مصالحت کی کوشش

اگرچہ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کا:

"طبعی رنگ درویشانہ یکسوئی کا تھا۔ اس کا مقتضا یہ تھا کہ ان سیاسی تحریکات میں آپ کوئی دخل نہ دیتے۔ لیکن اس طبعی رنگ کے ساتھ حق تعالیٰ نے آپ کو ایک مجددانہ اصلاح و تربیت اور ہمدردی خلق کا وہ جذبہ صادقہ عطا فرمایا تھا جو آپ کو اکثر بے چین کئے رکھتا تھا اور اسی وجہ سے جب ملک میں کوئی ہنگامی تحریک شروع ہوتی اس پر شرعی حیثیت سے اور تجربہ کارانہ بصیرت کے ساتھ نظر ڈال کر اپنے نزدیک اس کے حسن و قبح اور پھر صحیح راہ عمل واضح کر دینے کا معمول رہا۔" (افادات اشرفیہ ص2)

ایک طرف تو کانگرس میں مسلمانوں کے بلاشرط داخلہ کے خطرناک عواقب قریباً سامنے آگئے تھے اور اب اس بات کی ضرورت پیدا ہو چکی تھی کہ مسلمانوں کو قوت کے ساتھ کانگرس میں شمولیت سے روکا جائے اور دوسری طرف رہنمائی کیلئے خطوط پر خطوط آرہے تھے اس لئے آپ نے ملک کی دو مسلمان سیاسی جماعتوں یعنی مسلم لیگ اور جمعیتہ العلماء ہند کے درمیان مصالحت کرانے کی غرض سے متعدد بار اکابر جمعیتہ العلماء سے گفتگو فرمائی۔ پھر یہ اہتمام کیا گیا کہ ایک تاریخ کو ارکان جمعیتہ العلماء اور ارکان مسلم لیگ کو جمع کر کے بالمشافہ دونوں سے بات چیت کی جائے۔ مگر بعض عوارض کی وجہ سے اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس کا بدل یہ کافی سمجھا گیا کہ ان دونوں جماعتوں سے ضروری سوالات کے ذریعے تحقیق حال کی جائے اور ان کے جوابات کی روشنی میں مصالحت کا کوئی ایسا فارمولا تلاش کیا جائے جس سے مسلمان دینی اور سیاسی مضرت سے بچ سکیں۔ چنانچہ کسی حتمی نتیجہ پر پہنچنے کیلئے حضرت تھانوی کی طرف سے دو سوالنامے مرتب کئے گئے۔ ان میں سے ایک جمعیتہ العلمائے ہند کے نام بھیجا گیا اور دوسرا مسلم لیگ کے نام۔ وہ سوالنامے یہ تھے:

سوالنامہ جمعیت العلماء

حامداً مصلیاً و مسلماً۔ ان سوالات میں ابتدائی چند سوالات تو وہ ہیں جو ہماری طرف سے ہیں۔ جن کا مقصد صرف یہ ہے کہ حالت حاضرہ کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے پوری طرح حالات و واقعات کا علم ہو جائے اور بعد کے چند سوالات وہ ہیں جو دوسرے لوگ جمعیۃ علماء ہند کے متعلق کیا کرتے ہیں۔ جن کا واقعی جواب جمعیت علماء ہی دے سکتے ہیں کہ اس کو ان واقعات و حالات کی زیادہ خبر ہے۔

ابتدائی سوالات

الف: جمعیت علماء کے نزدیک مذہبی حیثیت سے کانگرس میں مسلمانوں کی شرکت کیوں ضروری ہے اور کانگرس سے علیحدگی میں کیا ضرر ہے؟

ب: کانگرس میں مسلمانوں کا داخلہ جس صورت سے انفرادی غیر منظم اور غیر مشروط طریقہ پر اس وقت ہو رہا ہے اور مسلمان نشستوں کے لئے کانگرس خود براہ راست امیدوار تجویز کرتی ہے کیا اس سے اسلام اور مسلمانان ہند کو خطرہ نہیں؟ اگر ہے تو اس خطرہ سے بچنے کی کیا صورت ہے؟

ج: مسلم لیگ سے جمعیت علماء کو کیوں اختلاف ہے جبکہ مسلمانوں کو منظم کر رہی ہے اور اس کا مقصد بھی آزادی کامل کا تخیل ہے۔ جیسا کہ اس سال لکھنؤ کے اجلاس میں اس نے اعلان کر دیا ہے۔

د: اگر مسلم لیگ میں کچھ مفاسد اور منکرات شریعہ موجود ہیں تو کیا یہ صورت ممکن نہیں کہ جمعیت علماء مسلم لیگ میں شریک ہو کر اس کو مخلص اور فعال لوگوں سے بھر دے اور مسلمانوں کی تنظیم کو مکمل اور مفاسد و منکرات سے پاک کر دے۔

ہ: کیا مسلم لیگ اور جمعیت علماء کے تصادم سے مسلمانوں میں تشتت و افتراق پیدا نہیں ہوتا اور کیا یہ تشتت مضر نہیں ہے۔ اگر ہے تو جمعیت علماء نے اس ضرر کے انسداد کیلئے کوئی صورت اختیار کی ہے یا نہیں۔

نوٹ: یہ سوال مسلم لیگ والوں سے بھی کیا گیا ہے۔

دوسروں کے شبہات واعتراضات

1۔ کانگرس کے ساتھ مل کر جو آزادی ہندوستان کو حاصل ہوگی اس کا انجام ایک حکومت مشترکہ کا قیام ہے۔ جس میں عنصر کفر غالب اور عنصر اسلام مغلوب ہوگا۔ ایسی حکومت اسلامی حکومت یقیناً نہ ہوگی۔ تو اس کیلئے جدوجہد کرنا مسلمانوں کے ذمہ کس دلیل سے واجب ہے۔ نیز اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہندو انگریزوں کو ہندوستان سے بالکل بے دخل کرنا چاہتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی مسلمانوں پر حکومت کرنا نہیں چاہتے۔ کانگرس کے اقتدار سے اس وقت ہندوؤں کے حوصلے جس قدر بڑھنے لگے اور مسلمانوں پر بازاروں' دیہاتوں' ملازمتوں' سرکاری محکموں میں جو مظالم وہ برپا کرنے لگے ہیں جمعیت علماء نے ان کے انسداد کی کیا تدبیر سوچی ہے اور اس کیلئے کوئی عملی اقدام اٹھایا ہے یا نہیں؟

2۔ کانگرس وزارتوں نے زمینداروں کی اراضی کاشتکاروں کی مملوک بنادینے کی جو تجویز سوچی ہے یقیناً صریح ظلم ہے اور جو لوگ کانگرس میں شریک ہیں وہ سب کے سب اس ظلم میں شریک ہیں۔ پھر اس سے بچنے کی جمعیت العلماء نے کیا تدبیر کی اور کون سا عملی قدم اٹھایا ہے۔

3۔ کانگرس میں بندے ماترم کا گیت گایا جاتا ہے جو مضامین شرکیہ پر مشتمل ہے اور قومی جھنڈے کو سلامی دی جاتی ہے جو قریب بہ شرک ہے۔ کانگرسی مسلمان بھی بندے ماترم کے گیت کے وقت کھڑے ہو جاتے ہیں اور قومی جھنڈے کو سلامی دیتے ہیں۔ کیا ان افعال میں شرکت کرنا گناہ نہیں؟ اگر ہے تو جمعیت العلماء نے مسلمانوں کو اس کے متعلق کیا ہدایت کی اور اس پر اور اسی قسم کے دوسرے منکرات پر صدائے احتجاج بلند کی یا نہیں۔

4۔ صدر کانگرس اور اس کی ہم خیالی جماعت جو اشتراکیت کی حامی اور مذہب اور خدا کی دشمن ہے ان کی تقریر خدا اور مذہب کے خلاف شائع ہوتی رہتی ہے۔ جمعیت العلماء نے ان کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند کیا یا نہیں اور مسلمانوں کو ایسے کافروں کی تعظیم و تکریم سے روکا ہے یا نہیں۔

5۔ کانگرس کے ساتھ جو آزادی حاصل ہوگی اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس میں مسلمانوں کے مذہبی وسیاسی حقوق کی پوری طرح حفاظت ہوگی جبکہ کانگرس اور اس کے ذمہ

دار مسلمانوں کے مذہب اور حقوق کا نام لینا بھی جرم سمجھتے ہیں اور اس کو فرقہ پرستی قرار دیتے ہیں۔ نیز جمعیت العلماء نے کانگرس کے ساتھ تعاون کر کے مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی حقوق کے تحفظ میں اس وقت تک کیا کام کیا ہے۔

6۔ جمعیت العلماء نے اچھوت قوموں میں تبلیغ اسلام کے لئے کوئی عملی قدم اٹھایا ہے یا نہیں جس کی مذہباً وسیاستہً سخت ضرورت ہے اور ان کے اسلام میں داخل ہو جانے کی بھی قوی امید ہے۔

سوالات از مسلم لیگ

1۔ آپ کے نزدیک کانگرس میں مسلمانوں کی شرکت سیاسی حیثیت سے کیوں مضر ہے اور اس سے علیحدگی کیوں ضروری ہے۔ اکثر لوگ پوچھتے ہیں۔ تو ہم ناواقفیت کے سبب جواب نہیں دے سکتے۔

2۔ کیا بدوں کانگرس کے تعاون کے ہندوستان کو آزادی مل سکتی ہے۔ اگر مل سکتی ہے تو اس کی جو صورت آپ کے ذہن میں ہو اس کو واضح فرمایا جائے۔

3۔ کیا کانگرس سے مسلمانوں کی علیحدگی آزادی ہندوستان کے مسئلہ میں باعث تعویق و تاخیر ہو گی۔

4۔ کیا مسلم لیگ تمام مسلمانوں کو یا ان کی زیادہ تعداد کو کانگرس سے روک سکتی ہے۔ بظاہر یہ امر مستبعد ہے۔ کانگرس میں پہلے ہی سے مسلمان بہت ہیں اور جب سے وزارت قبول کر کے وہ برسر اقتدار ہوئی ہے زیادہ تعداد اس میں شریک ہو رہی ہے۔ پس اگر مسلم لیگ نے تھوڑے سے مسلمانوں کو کانگرس سے روک لیا تو کیا نفع کی امید ہے جبکہ زیادہ حصہ اس میں شریک ہو گا۔

5۔ کیا مسلم لیگ کے زیادہ تر ارکان انگریزوں کے حامی اور اندرونی طور پر ان کے بہی خواہ ہیں۔ ان کے بقول سر اکبر حیدری مسلم لیگ ایک برطانوی زہر ہے۔ (مدینہ اخبار 13 دسمبر 37ء) اگر نہیں تو اس اعتراض کا اطمینان بخش جواب کیا دیا جائے۔

6۔ مخالفین کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ مسلم لیگ ایک بے عمل جماعت ہے۔ کانگرس کی طرح اس نے کوئی عملی قدم اب تک نہیں اٹھایا۔ نہ مسلمانوں کے فائدہ کیلئے کوئی کام کیا اور اس وقت کانگرس کے مقابلہ پر جو جدوجہد الیکشن میں صرف کر رہی ہے مسلمانوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ بلکہ انگریزوں کا نفع ہے کہ کانگرس کی قوت کمزور ہو کر آزادی ہندوستان کا مسئلہ تعویق میں پڑ جائے۔ اس اعتراض کا کیا حل ہے۔

7۔ مسلم لیگ نے اب تک مسلمانوں کی تنظیم اور ان کی مذہبی و تمدنی و اقتصادی ترقی

کیلئے کیا طریق عمل اختیار کیا اور اس کیلئے کونسا عملی قدم اٹھایایا آئندہ کیا ارادہ اور ذہن میں اس کی کیا صورت ہے۔

8۔ اگر کسی وقت ہر طرح سے اطمینان حاصل کر کے مسلم لیگ کو کانگرس میں شامل ہونے کی ضرورت ہوئی تو کیا مسلم لیگ کو توڑ کر اس میں شامل ہونے کی رائے ہے یا مسلم لیگ کو قائم رکھ کر مسلمانوں کے اقتدار کو بر قرار رکھتے ہوئے شرکت کی رائے ہے۔

9۔ اگر علماء مسلم لیگ کا ممبر بننا چاہیں تو کیا ان کو بھی الیکشن ہی کے ذریعے مسلم لیگ کا کوئی عہدہ حاصل ہوگا جس سے ان کو مسلم لیگ کے اجلاس اور مجلس عاملہ وغیرہ میں اپنی رائے پیش کرنے کا حق ہو۔ یا اگر وہ اس ذریعہ کو پسند نہ کریں تو ان کو بدوں اس ذریعہ کے بھی ایسا درجہ مل سکے گا۔

10۔ مسلم لیگ میں علماء کی وقعت کس درجہ کی ہوگی اور بصورت اختلاف علماء کسی مسئلہ مختلف فیہا کو کس طرح طے کیا جائے گا۔ کیا اس کے لئے کوئی قاعدہ ذہن میں ہے۔

11۔ جمعیت العلماء ہند دہلی اور مسلم لیگ کے تصادم سے مسلمانوں میں تشتت و افتراق پیدا ہو رہا ہے۔ لیگ نے اس کے ضرر کو محسوس کیا ہے یا نہیں۔ اگر کیا ہے تو اس ضرر کے انسداد کی کوئی صورت باہمی اتفاق کی سوچی ہے یا سوچنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔

نوٹ: یہ سوال جمعیت العلماء دہلی سے بھی کیا گیا ہے۔

12۔ مسلم لیگ نے اچھوت قوموں میں تبلیغ اسلام کی ضرورت کو محسوس کیا ہے یا نہیں (جو نہ صرف مذہباً بلکہ سیاستہً بھی نہایت اہم ہے۔) اگر کیا ہے تو اس کے لئے عملی قدم اٹھایا گیا ہے یا نہیں اور اس کا نتیجہ کیا ظاہر ہوا۔ اگر اب تک نہیں تو آئندہ کیا رائے ہے۔

جمعیت العلماء کا سکوت

یہ سوالات صرف حضرت کی سیاست دانی کے ہی نہیں بلکہ معاملہ کی اہمیت و افادیت کے بھی شاہد ہیں کہ حضرت نے کس طرح مسلمانوں کے انتشار کو دور کرنے اور ان کے مذہبی اور سیاسی حقوق کی حفاظت کرنے کیلئے ان اہم سوالات کے ذریعہ حالات کی پوری پوری تحقیق کرنے اور مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی ایسی سعی بلیغ کی کہ ان کا انفرادی وجود بھی قائم رہے اور قوم کا اجتماعی مفاد بھی محفوظ رہے۔ مگر ارباب جمعیت العلماء کی طرف سے اس سوالنامہ کا بار بار کی یاد دہانی کے باوجود کوئی جواب نہ ملا۔

زعماء مسلم لیگ کا جواب

مسلم لیگ والوں نے حضرت کی مخلصانہ مساعی کے عملی اعتراف کے طور پر نہایت مفصل اور جامع و مانع جواب دیا۔ جس سے اس جدوجہد آزادی کا تمام پس منظر سامنے آجاتا ہے اور اس لئے یہ طویل جواب یہاں نقل کیا جاتا ہے ورنہ طوالت کا خوف اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔ زعماء لیگ کا یہ جواب نواب محمد اسماعیل خاں صاحب ایم ایل اے بیرسٹر صدر مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ و سید حسن ریاض صاحب و دیگر اراکین کے مشورہ سے تحریر ہوا اور سید ذاکر علی جائنٹ سیکرٹری مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ صوبہ متحدہ نے دسمبر 1937ء کو حضرت کی خدمت میں روانہ کیا جو درج ذیل ہے:

1۔ بحث یہ ہے کہ مسلمان اجتماعی حیثیت سے کانگرس کے ساتھ تعاون کریں یا انفرادی حیثیت سے کانگرس میں داخل ہو جائیں۔ ہمارے خیال میں سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کی انفرادی شرکت اس لئے مضر ہے کہ مسلمان اقلیت میں ہونے کی وجہ سے کانگرس میں ہمیشہ اس قدر کم تعداد میں رہیں گے کہ کانگرس کے مسلک اور عمل پر ان کی رائے کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ نیز مسلمان ارکان کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے آل انڈیا کانگرس کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی میں کانگرس کے بااختیار ادا کرنے میں شاذ و نادر ہی منتخب ہو سکیں گے۔ کانگرس کی ان دونوں بااختیار کمیٹیوں میں اس وقت تک مسلمانوں کا جو تناسب رہا ہے اس سے یہ اچھی طرح ثابت ہو رہا ہے کہ اندیشہ یہ بالکل صحیح ہے۔ غالباً آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی کے اکیس ارکان میں سے صرف دو مسلمان ہیں اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے تقریباً تین سو ارکان میں سے سات یا آٹھ مسلمان ہیں۔ انتخاب مخلوط نشستوں کا یقین نہیں۔ کانگرس میں ہندو ووٹروں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس صورت میں کبھی توقع نہیں کی جاسکتی کہ مسلمان بااختیار کمیٹیوں میں اتنے ہو سکیں گے کہ وہ کانگرس کے فیصلوں اور طرز عمل پر کوئی اثر ڈال سکیں۔ اس سلسلہ میں کانگرسی مسلمان کہتے ہیں کہ مسلمان کو چاہئے کہ کثیر تعداد کانگرس کے ممبر بنیں اور اس طرح کانگرس پر قبضہ کرلیں۔ یہ خیال غلط ہے ہندو مسلمانوں کے مقابلہ میں بااعتبار تعداد زیادہ آگے ہیں اور ہندو عورتیں بھی کانگرس کی ممبر

بنتی ہیں اور اس میں شریک ہوتی ہیں۔ مسلمان عورتیں اگر ممبر بھی بن جائیں تو پردے کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکتیں۔ مسلمان زیادہ سے زیادہ کر سکتے ہیں کہ اپنی ساری آبادی کو کانگرس کا ممبر بنوا دیں۔ ہندو بھی یہی کریں گے۔ اس صورت میں ہندو مرد اور عورتیں مل کر مسلمان مرد ممبروں سے تقریباً پانچ گنے ہو جائیں گے اور کانگرس کی ہر کمیٹی کا فیصلہ انہی کی رائے پر منحصر ہو گا۔ مسلمان کبھی یہ توقع نہیں کر سکتے کہ ان کی کوئی تجویز کانگرس میں منظور ہو سکے گی۔ ممکن ہے کہا جائے کہ ان چار صوبوں کی کانگرس میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے یعنی صوبہ سرحد' پنجاب' سندھ اور بنگال کی ہر کمیٹی میں مسلمانوں کی اکثریت رہے گی۔ یہ ٹھیک ہے مگر دشواری یہ ہے کہ کانگرس کے نظام میں دونوں کو موجودہ انگریزی نظام حکومت کی طرح صوبجاتی خود اختیاری حاصل نہیں ہے۔ کانگرس اس وجہ سے کہ چار صوبوں میں مسلمانوں کو بااختیار اکثریت نہ ہو۔ صوبجاتی خوداختیاری کے خلاف ہے اور مرکزی وحدانی طرز انتظام پر مصر ہے۔ کامل آزادی کے مسلک میں متفق نہ ہونے کے باوجود مسلمانوں اور کانگرس کے درمیان یہ مسلسل اختلاف رہا ہے۔ مسلمان اپنی اکثریت کے صوبوں میں جو بات طے کریں گے وہ مرکزی وحدانی طرز حکومت ہونے کی صورت میں کانگرس یعنی آل انڈیا کانگرس کے اجلاس' کانگرس کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی میں نامنظور ہو جائے گی جہاں مسلمان ارکان کی تناسب چوتھائی سے زیادہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر مسلمان اس طرح کانگرس میں شریک ہو گئے تو ان کی یہ حیثیت ہو گی کہ ان کی موجودگی میں ان کے مفاد کے خلاف فیصلے ہوں گے اور آئینی اصول کے مطابق ان کو اکثریت کے فیصلوں کو ماننا پڑے گا اور اس کے باوجود کہ وہ سکوت کریں یا اختلاف کریں۔ وہ ان مخالف فیصلوں کے ذمہ دار تصور کئے جائیں گے اور کانگرس کے باہر بھی ان کو اختلاف کا کوئی حق نہ رہے گا۔ لیکن اگر مسلم لیگ کے ماتحت اپنی علیحدہ سیاسی تنظیم کریں تو وہ دوسری حیثیت سے اکثریت کے مقابلہ میں زیادہ طاقتور ہو سکتی ہے۔ یقیناً ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک اور اتحاد کے بغیر ہندوستان کا بظاہر آزاد ہونا ممکن نہیں لیکن یہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا مشترکہ مفاد اور مقصد ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو ہندوؤں سے ملنے کی جتنی طلب ہے اتنی ہی ہندوؤں کو بھی ہونی چاہئے۔ لہٰذا کانگرس اگر اخلاص کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کی طالب ہو تو اس کو مسلم لیگ کے جائز مطالبات طے کرنے پڑیں گے اور ہر اہم معاملہ میں مسلمانوں سے

سمجھوتے کرنے پر مجبور ہو گی۔ انفرادی حیثیت سے کانگرس میں شرکت سے مسلم اقلیت ہندو اکثریت میں گم ہو جاتی ہے اور جداگانہ تنظیم کی صورت میں مسلمانوں کی اجتماعی قومی انفرادیت قائم رہتی ہے۔ کانگرس میں شریک ہو کر مسلمان جو بات کہیں گے وہ اکثریت کی آواز سے فی الفور دب جائے گی اور جو بات مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کہیں گے وہ جداگانہ ہونے کی حیثیت سے ساری دنیا میں سنی ہو جائے گی۔ کانگرس میں شریک ہو کر مسلمان اپنے خاص مفاد کے لئے کوئی جداگانہ عمل نہ کر سکیں گے اور جداگانہ اسلامی تنظیم کے ماتحت ہر عمل ان کے اختیار میں ہو گا۔

جواب سوال نمبر 2

کانگرس کے تعاون کے بغیر یا دوسرے الفاظ میں ہندوؤں کے تعاون کے بغیر مسلمان یقیناً ہندوستان کو آزاد نہیں کرا سکتے لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ کانگرس کا تعاون انہیں شرائط پر حاصل کیا جائے جو کانگرس پیش کرے۔ یعنی ہر مسلمان چار آنہ کا ابتدائی ممبر بنے اور انفرادی حیثیت سے بلا مسلم مفاد کے تحفظ کی شرائط منواتے ہوئے کانگرس میں داخل ہو کر اپنی اسلامی حیثیت کو گم کر دے اور محض ہندوستانی رہ جائے۔ اسی طرح کیوں نہ ہو کہ مسلمان مسلم لیگ کے ماتحت اپنی تنظیم کریں اور مسلمانوں کی انجمن مسلم لیگ اور ہندوؤں کی انجمن کانگرس کے درمیان تمام مشترکہ مفاد کے حصول کیلئے اور نیز آزادی حاصل کرنے کیلئے بشرائط اس قسم کا معاہدہ اتحاد ہو۔ جیسا دو حلیف قوموں کے درمیان ہوتا ہے۔ اہم معاملات کے تصفیہ کیلئے کانگرس کی مجلس عامہ اور مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس ہوں اور ان اجلاسوں میں جو فیصلے ہوں ان پر دونوں انجمنیں اور دونوں قومیں کاربند ہوں۔ کیا انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنی اپنی قومی انفرادیت کو مٹائے بغیر جرمنی کے خلاف جنگ نہیں کی۔ کانگرس کا تعاون حاصل کرنے کی دوسری اور مسلمانوں کے حق میں بہتر صورت یہ ہے کہ اگر مسلمان مسلم لیگ کو مستحکم اور مضبوط کر لیں اور کانگرس میں شریک نہ ہوں تو یقیناً کانگرس اس طریقہ پر مسلمانوں سے اتحاد کرنے پر مجبور ہو گی۔

جواب سوال نمبر 3

کانگرس میں مدغم ہونے کے بعد جب مسلمان یہ دیکھیں گے کہ ان کی رائے اور آواز

بے اثر ہے اور وہ اپنے قومی مفاد کے خلاف ہندوؤں کے پیچھے پیچھے چلنے پر مجبور ہیں تو آزادی حاصل کرنے کا یہ جذبہ ان کے دلوں میں سرد ہو جائے گا اور آزادی کی تحریک اور جنگ مسلمانوں کی ہمت اور عمل سے اس طرح محروم ہو جائے گی جس طرح کہ انگریزی حکومت ہندوستان کے تحفظ کیلئے جنگوں میں ہندوستانیوں کے طبعی جوش مدافعت وطن اور جوش ملک گیری سے محروم ہے اور صرف روپیہ دیکر ان کو لڑنے پر آمادہ کرتی ہے۔ للہٰذا اس طرح حصول آزادی میں تعویق اور تاخیر زیادہ ہو گی لیکن اگر مسلم لیگ میں مسلمان رہے اور کانگرس میں ہندو رہے ان دونوں کے درمیان اس طرح اتحاد قائم ہوا جیسا کہ دو کے درمیان ہوتا ہے اور مسلمانوں کو اس کا اطمینان ہو گیا کہ ان کی اسلامیت اور قومی انفرادیت محفوظ ہے اور آزاد ہندوستان میں وہ بھی آزاد قوم کی حیثیت سے رہیں گے تو مسلمان اپنے مفاد کے لئے اور ہندو اپنے مفاد کیلئے حلیفوں کی حیثیت سے خالص وطن آزادی کے جذبہ سے جنگ کریں گے۔ یہ جنگ جس قسم کی بھی ہو زیادہ طاقت ور ہو گی۔ اس سے آزادی جلد حاصل ہو سکے گی۔

جواب سوال نمبر 4

یقیناً مسلم لیگ مسلمانوں کو کانگرس میں شریک ہونے سے روک سکتی ہے اور اس کے باوجود کہ کانگرس برسر اقتدار اور اس کی وزارت قائم ہے تجربہ سے ظاہر ہو گیا ہے کہ کانگرس کی حکومت قائم تھی۔ مسلم لیگ نے کانگرس کے مقابلہ میں پانچ الیکشن لڑے۔ ان میں سے چار میں مسلم لیگ کامیاب ہوئی اور صرف ایک بجنور میں ناکامی ہوئی۔ اس ناکامی کی وجہ بھی حافظ ابراہیم صاحب کا ذاتی اثر اور مسلم لیگ کو کام کرنے کی مہلت کم تھی۔ نیز یہ کہ ابھی تک مسلم لیگ کی تنظیم مکمل اور طاقت ور بھی نہیں ہے۔ پھر تاریخی تجربہ یہ بھی بتا رہا ہے کہ اقوام کی اکثریت اپنے مفاد اور وجود کے تحفظ کے حق میں رہتی ہے۔ حکومت کے موید صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے مفاد براہ راست حکومت سے وابستہ ہوں۔ مثال کے طور پر کانگرس کے سابقہ تحریکات کو لیجئے۔ انگریزوں کی حکومت قائم تھی۔ ہزارہا ہندو سرکاری ملازم تھے۔ زمیندار، خطاب یافتہ اور ٹھیکیدار اور اجارہ دار وغیرہ تھے مگر قوم کی آواز وہی سمجھی گئی جو کانگرس کے پلیٹ فارم سے بلند ہوئی۔ حکومت کے موید ہندوستانیوں کی تائید ہندوستانیوں یا ہندو قوم کی تائید نہیں سمجھی گئی۔ للہٰذا جو لوگ ذاتی اغراض کے لئے یا

کانگرس کے اقتدار سے مرعوب ہو کر مسلم مفاد کے خلاف کانگرس میں شریک ہوں گے وہ بھی انگریزی حکومت کے پرستار ہندوؤں کی طرح بے اثر ہو کر رہ جائیں گے۔ نیز یہ کہ جب مسلم لیگ کا نظام مضبوط ہو جائے گا اور یہ ناممکن ہو جائے گا کہ کوئی مسلمان انفرادی حیثیت سے یا کانگرس کی طرف سے کھڑا ہو کر مجالس واضعان قانون کا ممبر منتخب ہو سکے اور مسلم رائے عامہ کانگرس کا ممبر ہونا عیب اور مسلم لیگ کا ممبر ہونا اچھا سمجھنے لگے گی تو کوئی مسلمان کانگرس کا ممبر بننا پسند نہ کرے گا اور اس طرح مسلم لیگ مسلمانوں کو کانگرس میں جانے سے روک دے گی اور بالغرض اگر کوئی چھوٹی سی بے اثر جماعت کانگرس میں رہی بھی تو کانگرس کی نظر میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہو گی۔ چنانچہ 29ء سے 38ء تک یہی ہوا کہ کانگرس ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرقہ وارانہ معاملات کے متعلق کانگرسی مسلمانوں سے کوئی گفتگو نہیں کرتی تھی بلکہ ہر معاملہ میں ان کو نظر انداز کر کے کانگرس کو مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس سے رجوع کرنا پڑتا۔ آخر میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ کانگرس میں مسلمانوں کی بڑی تعداد ہرگز شریک نہیں۔ اس قسم کے تمام اعلانات جھوٹے اور بے بنیاد ہیں۔ بعض چند افراد ہیں جو کانگرس میں شریک ہیں۔

جواب سوال نمبر 5

اکتوبر 37ء سے مسلم لیگ میں مکمل انقلاب آیا۔ کامل ذمہ دار حکومت کی بجائے پورا استقلال یا پوری خود مختاری مطمع نظر قرار پایا ہے۔ محدود رکنیت کی جگہ 2 جنس کی شرط پر رکنیت عام کی گئی ہے۔ گویا اب مسلم لیگ سب سے زیادہ جمہوری انجمن ہے۔ ابتداء سے انتہا تک جتنی کمیٹیاں بنیں گی اور جتنے عہدے دیئے جائیں گے وہ انتخاب کے ذریعہ ہوں گے۔ اس صورت میں انگریزوں کے خوشامدیوں کے دخل کا مسلم لیگ میں کوئی امکان نہیں۔ لیکن بالفرض عام مسلمان انگریزوں کے حامی واقع ہوئے ہیں اور وہ ایسے ہی لوگوں کو منتخب کرنا چاہتے ہیں جو انگریزوں کے حامی ہیں۔ تو ان کو کون روک سکتا ہے۔ مگر یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ مسلم لیگ کے تمام موجودہ ارکان کا میعاد رکنیت فروری میں ختم ہو جائے گی۔ نئے انتخابات میں امیر اور غریب کو عام ممبر بننے کے وقت اس عہد نامہ پر دستخط کرنے پڑیں گے کہ وہ کامل آزادی کا طالب ہے۔ اس کے بعد وہ انتخابات میں آئے گا۔ اس کے بعد بھی اگر وہ منافقت کرے اور دل میں انگریزوں کا حامی رہے تو اس پر کسی کو قابو نہیں جیسے کوئی شخص

توحید ورسالت وغیرہ کا اقرار کرے۔ ہم اس کو مسلمان ماننے پر مجبور ہیں اس کے دل میں کیا ہے۔ اس پر سوال کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ اس طرح کے منافق لوگ خود کانگرس میں بھی موجود ہیں اور کانگرس ان کو اندر آنے سے نہیں روک سکتی۔ سر اکبر حیدری مسلم لیگ کو جو برطانوی زہر کہہ رہے ہیں اس کے معنی بالکل اور ہیں۔ کیا سر اکبر حیدری نے حیدر آباد میں کانگرس قائم کرنے کی اجازت دے رکھی ہے اور کیا وہ کانگرس کو تریاق سمجھتے ہیں۔ ہر ہندوستانی ریاست سیاسی تحریکات کو اپنے حدود کے اندر داخل ہونے سے روکتی ہے۔ خواہ وہ قومی ہو یا فرقہ وارانہ۔ صاف بات ہے کہ حیدر آباد میں مسلمانوں کو سیاسی استیلاء حاصل ہے۔ وہاں مسلمانوں کے حقوق مفاد اور آزادی خطرہ میں نہیں۔ حکومت انجمن سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ حیدر آباد میں مسلم حکومت موجود ہے۔ اس صورت میں یقیناً وہاں مسلم لیگ کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر حیدر آباد میں مسلم لیگ قائم کی جائے گی تو وہ بجائے سیاسی انجمن کے خالص فرقہ وارانہ انجمن بن کر رہ جائے گی۔ جو حکومت اور ہندوؤں کے درمیان تصادم کا باعث ہو گی۔

جواب سوال نمبر 6

یہ غلط ہے کہ مسلم لیگ بے عمل جماعت ہے۔ مسلم لیگ ابتداَء یعنی 1907ء میں اس غرض سے قائم ہوئی تھی کہ برطانیہ سے ہندوستان کو جو مراعات ملیں ان میں سے مسلمانوں کو پورا حصہ دلائے اور مزید مراعات حاصل کرنے میں اکثریت کے ساتھ تعاون کرے۔ چنانچہ اس نے یہ کیا کہ کانگرس نے ہندوستان کیلئے سیاسی اختیارات حاصل کرنے کی جب کوئی تحریک شروع کی مسلم لیگ نے اس کی تائید کی۔ مسلم لیگ اور کانگرس کے متحدہ مطالبہ پر مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات ہندوستان کو دی گئیں اور مسلم لیگ کے ذریعہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو محسوس کر کے کانگرس 1916ء میں فرقہ وارانہ معاملات میں مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہوئی جو 1935ء تک بلا تغیر جاری رہا۔ چونکہ مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد ابتداء محض ہندوستان کی اندرونی سیاسی امور تک محدود تھے اس لئے جب جنگ عظیم ہوئی اور خلافت اور اماکن مقدمہ کا مسئلہ سامنے آیا تو انہیں مسلمانوں نے جو مسلم لیگ کے بانی اور رکن تھے خلافت کمیٹی قائم کی۔ خلافت کمیٹی نے جو کچھ کیا اس سے دنیا واقف ہے۔ عملاً اگر

غور سے دیکھا جائے تو خلافت کمیٹی حقیقت میں مسلم لیگ کا شعبہ امور خارجہ تھا۔1929ء سے جب نہرو رپورٹ کا فتنہ اٹھا نئے دستور موسومہ قانون حکومت ہند 35ء کے بننے تک مسلم لیگ نے ہندوستان کے سیاسی اختیار کی ترقی اور اس میں مسلمانوں کے حق کے تعین میں جو کچھ کیا اس قانون کے اندر موجود ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ مسلم لیگ نے کانگرس کے ساتھ ملکر سول نافرمانی نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے معاملہ میں کانگرس نے مسلم لیگ کو اطمینان نہیں دلایا تھا بلکہ مسلمانوں کے علی الرغم سول نافرمانی شروع کر دی۔ کانگرس کی یہ سول نامتابعت کس مقصد کیلئے تھی۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ یہ کامل آزادی حاصل کرنے کیلئے کی گئی مگر یہ غلط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب وائسرائے نے نہرو رپورٹ منظور کرنے سے انکار کر دیا جو مسلمانوں کے مفاد کے لئے سخت مضر تھی تو کانگرس نے اس ضد میں سول نامتابعت شروع کر دی۔ مسلمان اس سول نامتابعت کو اپنے خلاف ہندوؤں کی طرف سے اس بات کا مظاہر سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں اصل طاقت ہندوؤں کی ہے اور مسلمان قابل اعتبار بھی نہیں ہوتا اور مسلمانوں کا یہ خیال صحیح تھا۔ چنانچہ ثبوت میں پنڈت جواہر لعل نہرو کا یہ متکبرانہ قول پیش کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں ایک کانگرس دوسری برطانوی حکومت۔ یہ کہ مسلم لیگ جو کانگرس سے الیکشن لڑ رہی ہے اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مخلصین کی طرف سے مسلم لیگ پر ایک بے مغز اعتراض ہے۔ اگر یہ عہدے لیکر مجلس واضعان قانون کا ممبر منتخب کرنا مسلمانوں کیلئے مفید نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے حقوق و مفاد کا تحفظ کرے گے جن کے وہ آئین مروجہ کی رو سے مستحق ہیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں کو مجالس واضعان قانون میں بھیجنا ہی مسلمانوں کے حق میں مفید نہیں۔ مسلم لیگ صرف اس غرض کیلئے الیکشن میں جدو جہد کر رہی ہے کہ صرف ان لوگوں کو بھیجے جو ہندوستان کے سیاسی اختیار کی ترقی کے ساتھ مسلمانوں کے مذہبی تمدنی اور سیاسی حقوق کے تحفظ کے خلاف کانگرس کی اطاعت نہ کریں۔ اگر یہ بات کہ مسلمان کسی عہد کے ساتھ مجالس واضعان قانون میں جائیں۔ اس قدر غیر اہم ہے کہ اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تو کانگرس اپنے قدیم دستور کے خلاف اس مرتبہ الیکشن لڑانے پر اس قدر کیوں مصر ہے کہ اس کو کمزور ہونا منظور اور کمزور ہو کر آزادی ہندوستان کی تحریک کو تعویق میں ڈالنا منظور مگر مسلم لیگ کے

مقابلہ میں الیکشن لڑانا ضرور۔ واضح رہے کہ اس معاملہ میں کانگرس کا عمل جارحانہ ہے کہ مسلم لیگ کا اس اعتراض کا صرف یہ حل ہے کہ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کا مطمع نظر کامل آزادی ہے۔ مفاد عامہ کے کاموں میں مسلم لیگ کی پارٹی کانگرس کی کوئی مخالفت نہیں کرتی۔ البتہ مسلم اقلیت کے حقوق و مفاد کا تحفظ اس کا رضائی عمل ہے۔ لہٰذا کانگرس کو مسلم لیگ کے مقابلہ میں کوئی الیکشن نہ لڑنا چاہئے۔ پھر نہ وہ کمزور ہوگی اور نہ آزادی کی تحریک (اگر اس کا کہیں وجود ہے) تعویق میں پڑے گی۔

جواب سوال نمبر 7

مسلم لیگ نے اکتوبر 1937ء سے قبل ہندو اکثریت کے جارحانہ اقدامات کے مقابلہ میں اپنی مدافعت کر کے مسلمانوں کی دینی 'مذہبی' اجتماعی 'سیاسی اور اقتصادی تنظیم کی حفاظت کی ہے۔ اکتوبر 37ء سے اس کا نیا دور شروع ہوا ہے۔ اب وہ عام مسلمانوں کو مسلم لیگ کی تنظیم میں داخل کر کے مسلمانوں کے اجتماعی اور سیاسی خلفشار کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ رائے عامہ کی تربیت کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کو آزادی کامل اور آزاد ہندوستان میں مسلم اور دوسری اقلیتوں کے لئے جمہوری تحفظ یعنی اکثریت کے فرقہ وارانہ جبر و استبداد کے امکان کے انسداد کے مقصد پر ہم خیال کرنا چاہتی ہے اور ان مقاصد کے حصول کیلئے جس طاقت کی ضرورت ہے وہ تنظیم کے ذریعے پیدا کر رہی ہے۔ اس غرض کے لئے ہر ہر شہر' قصبہ اور موضع میں جمعیت بھرتی کی جا رہی ہے۔ اقتصادی خوشحالی کیلئے مسلمان دست کاروں کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں کے رواج کی کوشش ہے۔ سود منسوخ کرانا مد نظر ہے اور مسلم لیگ کا جو ارادہ ہے وہ اس کے سالانہ اجلاس کی قرار دادوں سے مفصل معلوم ہوگا۔

جواب سوال نمبر 8

اگر کانگرس سے سمجھوتہ ہو گیا اور اکثریت کے جبر و استبداد کا کوئی خطرہ نہ رہا۔ مسلم لیگ اس وقت بھی قائم رہے گی اور اشتراک عمل مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان ہوگا۔ مسلمان منتشر ہو کر کانگرس میں کبھی شریک نہ ہوں گے۔ مسلم لیگ کی یہ قطعی رائے ہے۔

جواب سوال نمبر 9

اگر علماء مسلم لیگ کے ممبر بننا چاہیں تو ان کو الیکشن کے ذریعے مسلم لیگ کی بااختیار

کمیٹیوں میں آنے سے گریز کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ یہ تو بہترین صورت ہے لیکن خاص حالات میں بہت ہی مقتدر علماء کے لئے جو الیکشن کے ذریعہ نہ آسکیں ایک صورت اور بھی ہے جس کو انگریزی میں کواپریشن کہتے ہیں۔ یعنی وہ بطریق اضافہ آسکتے ہیں۔

جواب سوال نمبر 10

مسلم لیگ میں دینی امور کے متعلق علماء کی رائے کو وہی وقعت حاصل ہو گی جو اب تک مسلمانوں میں ان کی رائے کو حاصل رہی ہے۔ ان معاملات میں اگر علماء کے درمیان کوئی اختلاف ہو تو اس کے لئے وہی طریقہ اختیار کیا جائے گا جو حدیث و قرآن کی رو سے صحیح ہو۔

جواب سوال نمبر 11

یقیناً مسلم لیگ نے جمعیتہ العلماء اور مسلم لیگ کے تصادم کو ضرور محسوس کیا ہے اور اس کے انسداد کی اس کے ذہن میں یہ صورت ہے کہ جمعیتہ العلماء اور مسلم لیگ کے درمیان تقسیم عمل ہو جائے۔ یعنی خالص دینی امور کا انصرام جمعیتہ العلماء اپنے ذمہ لے لے اور مذہبی تمدنی سیاسی اور دوسرے شعبہ ہائے حیات کے انصرام میں شرکت کیلئے علماء حضرات مسلم لیگ میں بحیثیت مسلمان شریک رہیں۔

جواب سوال نمبر 12

بے شک راجپوتوں اور غیر مسلموں میں تبلیغ اسلام مسلم لیگ کے نزدیک ایک اہم فریضہ ہے اور سیاسی حیثیت سے بھی یہ ضروری ہے مگر اس اہم اسلامی خدمت کے اہل صرف علماء حضرات ہیں۔ بد نصیبی سے مسلم لیگ کو ان کا پورا تعاون حاصل نہیں رہا ہے۔ اس لئے وہ اس خدمت سے قاصر رہی ہے۔ اگر علماء اس کام کو شروع کریں تو مسلم لیگ ان کے ساتھ پورا پورا تعاون کرے گی۔

اعلان مسلک سیاسی

حضرت مسلم لیگ کے جواب کی روشنی میں حالات حاضرہ کا ابھی جائزہ ہی لے رہے تھے کہ 5 فروری 1938ء کو مولوی منفعت علی صاحب وکیل و ممبر مسلم لیگ سہارن پور کی طرف سے حضرت کو ایک خط موصول ہوا جس میں تمام حالات پر روشنی ڈالنے کے بعد درخواست کی گئی کہ:

"حضرت اقدس کے نزدیک دونوں جماعتوں یعنی لیگ اور کانگرس میں سے مسلمانوں کو کس جماعت میں شرکت کرنی چاہیے۔"

(مسائل سیاسیہ ص70)

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رح کے بیان کے مطابق اس خط کے موصول ہونے کے بعد 10 فروری 1938ء کو حضرت تھانوی ایک مضمون لکھ کر خانقاہ میں تشریف لائے۔ صبح کی مجلس میں مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب اور مولانا شبیر علی صاحب تھانوی و دیگر علماء خانقاہ کو بلا کر فرمایا کہ:

"رات میں نے سونا چاہا مگر نیند نہیں آئی۔ بار بار قلب یہ تقاضا کرتا تھا کہ جواب لکھو۔ جب شدید تقاضا ہوا تو میں لکھنے بیٹھ گیا اور یہ مضمون قلمبند ہوا جسے "تنظیم المسلمین" کا نام دیا گیا ہے۔"

اس کا خلاصہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہ کے الفاظ میں یہ تھا کہ از خود نہ کسی سے آمیزش کی ضرورت ہے۔ نہ آویزش کی۔ رضائے حق کو مطمع نظر رکھ کر اپنے کام میں لگے رہیں اور اس رضا کی شرط یہ ہے کہ ہر کام میں اس کا پورا لحاظ رکھیں کہ کوئی امر خلاف شرعی نہ ہونے پائے۔ یہی عبدیت کی روح اور حیات مسلم کی اصل الاحوال ہے۔

(افادات اشرفیہ و مسائل سیاسیہ ص75)

وضاحت مسلک سیاسی

تنظیم المسلمین کے ضمیمہ میں حضرت حکیم الامت قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں بعد الحمد والصلوۃ حضرات ناظرین۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ سیاسیات حاضر کے متعلق ایک فتویٰ مسمّٰی بہ تنظیم المسلمین زمانہ قریب شائع ہو چکا ہے اور اس سے میرا مسلک سیاسی واضح ہو گیا ہے۔ مگر پھر بھی روزانہ ڈاک میں اس کے متعلق برابر خطوط آتے رہتے ہیں۔ جن میں مختلف عنوانات سے سوالات ہوتے ہیں چونکہ بوجہ ضعف ہر چیز کا مفصل جواب دینے سے قاصر ہوں اور بغیر تفصیل کے غلط فہمی کا اندیشہ ہے جیسا کہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ نیز اس فتویٰ میں نہایت احتیاط کے ساتھ اس قدر قیود و حدود کی رعایت کی گئی ہے کہ ان میں غور کرنے سے تقریباً تمام ضروری سوالات کا جواب اس سے حاصل ہو جاتا ہے۔ مثلاً

1۔ ہر تنظیم کا حسب قدرت شرع کے مؤافق ہونا ضروری ہے۔

2۔ جس جماعت میں داخل ہوں اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔ اس میں منکر پر نکیر کرنا بھی آ گیا۔

3۔ جو شخص اسلام کو حق جانتا ہو اس کی اصلاح بہ نسبت غیر مسلم کے سہل ہے۔

4۔ اصلاح اس تفصیل سے کی جائے کہ اہل قوت اپنی قوت سے اور غیر اہل قوت ان اہل قوت کو آمادہ کرنے سے اور علماء سے علمی و عملی امداد حاصل کرنے میں امداد لیں۔

5۔ تمام علماء احکام کی تبلیغ میں مشغول رہیں کہ تقسیم خدمات کے قاعدہ سے یہ ان کا اصلی فرض ہے۔ اہل سیاست سے اس کی توقع فضول ہے۔ البتہ اہل سیاست تدابیر سیاست کے جواز و عدم جواز کے حکم میں علماء کے محتاج ہیں۔

6۔ غیر اسلامی جماعت کے ساتھ اصول شریعہ کے موافق صلح کا مضائقہ نہیں لیکن ان میں مدغم نہ ہوں۔

7۔ اگر کوئی دوسری اسلامی جماعت پیدا ہو جائے اس کے ساتھ اتحاد رکھیں۔

8۔ اگر ایسی سیاسی جماعت متقی نہ ہو مگر اسلام کی حفاظت اور مخالفین اسلام متعصبین مدافعت اس کا مقصود مشترک ہو جیسا کہ اس وقت زیادہ غرض تنظیم سے یہی ہے کہ جو

آزادی ہندوستان کے بعد ہندوستان سے اسلام کو ہٹانا چاہتے ہیں ان کے مقابلہ میں اس کی حمایت کریں تاکہ اسلام اپنے اصول و شعائر کے ساتھ ہندوستان میں باقی رہے۔ گو اس جماعت کی اتحاد میں اختلافت مذاہب بھی ہو اور اس وقت کی فضاء پر نظر کر کے بظاہر اسباب اس کی ضرورت ہے کہ اس مقصود کے حاصل کرنے کیلئے باہمی اختلاف کو بجائے خود رکھ کر سب کلمہ گو جمع ہو جائیں تو متقی نہ ہونا ایسی حالت میں اختلاف میں مانع تعاون نہیں۔ البتہ اس میں یہ شرط ضروری ہے کہ اس تعاون میں جو اختلاط ہو وہ مضر دین نہ ہو اور اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ عوام الناس ایسے لوگوں سے مذہبی گفتگو نہ کریں نہ سنیں۔ یہ کام علماء پر چھوڑ دیا جائے البتہ اپنے عقیدہ کی علمی و عملی اصلاح خاص ملاقاتوں میں لطف و اخلاق سے کرتے رہنا بلا خطر مناسب بلکہ واجب ہے تاکہ وہ بھی تقویٰ کے ساتھ موصوف ہو جائیں۔ حاصل اس تقسیم خدمات کا یہ ہے کہ زعماء کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں من حیث القوم مٹنے نہ دیں اور علماء کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو من حیث المذہب بگڑنے نہ دیں تو ایک جماعت میں جن خاص اوصاف کی کمی اس کے فرض میں متنخل ہے اس کی کمی دوسری جماعت میں دیکھ کر خود اس جماعت کو بیکار سمجھنا محض ناحقیقت شناسی اور ناتجربہ کاری ہے۔

ہر کسے بہر کارے ساختند

9۔ ہر حال اور ہر عمل میں اصل مطمع نظر رضائے حق کو رکھیں کہ حقیقی کامیابی اسی پر موصوف ہے۔

10۔ فتویٰ 1356ھ کے ختم اور 1938ء کے آغاز کا لکھا ہوا ہے اور اس وقت کی حالت کی بنا پر مجھے اگر حالات بدل گئے تو حکم بھی بدل جائے گا۔ یہ وہ اعلان تھا جس کے ذریعے آپ نے مسلمانوں کو چند شرائط کے ساتھ مسلم لیگ میں شامل ہونے کا فتویٰ دیا۔

مجلس دعوۃ الحق

حضرت تھانوی کی اصل سیاست یہ تھی کہ جس طرح بھی بن سکے مسلمانوں کو سچا مسلمان بنا دیا جائے۔ اس لئے آپ کی حمایت لیگ سیاسی اغراض کیلئے نہ تھی۔ بلکہ اس غرض کیلئے تھی کہ مسلمان لیگ کے اندر داخل ہو کر اپنی تنظیم اور لیگ کی اصلاح کی فکر کریں تاکہ یہ کانگرس کا مقابلہ کر سکے اور متعصبین اسلام کو ہندوستان سے نہ مٹا سکیں اور اسلام اپنے اصول و شعائر کے ساتھ ہندوستان میں باقی رہے۔ مسلم لیگ چونکہ نہ علماء کی جماعت تھی اور

نہ بالکل دینداروں کی۔ اس لئے حضرت تھانوی کو اس کی قیادت سے کچھ دینی مضرتوں کا احتمال تھا۔ جس کی وجہ سے آپ نے ایک ایسی تبلیغی جماعت بنانے کی ضرورت محسوس کی جو تبلیغ دین کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی سیاسی جماعت مسلم لیگ کی بھی نگرانی کرتی رہے تاکہ وہ مسلمانوں کے حقوق کا گورنمنٹ سے مطالبہ کرتے وقت شریعت کے خلاف عمل نہ کر بیٹھے۔ چنانچہ اس غرض کیلئے حضرت کے ایماء پر "مجلس دعوۃ الحق" قائم ہوئی جس کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے۔

الف: حضرت تھانوی کے رسائل "تنظیم المسلمین و تعلیم المسلمین" میں جو عوام و خواص کو تنظیم و تبلیغ کی ہدایت کی گئی ہے اس کے لئے ایک مرکز قائم کرنا اور تنظیم و تبلیغ کو وسیع پیمانہ پر ہندوستان میں پھیلانا۔

ب: مسلم لیگ کے لیڈروں کو دینداری کی طرف متوجہ کرنا۔ کیونکہ مسلم لیگ کو اس وقت مسلمانوں میں بڑی حد تک مرکزی شان حاصل ہے۔ اس کے لیڈروں کی اصلاح سے بہت کچھ عوام کی اصلاح متوقع ہے۔

ج: مسلم لیگ کی مجلس عامہ کے ارکان کے پاس ان کے جلسوں میں یا خاص اوقات میں چند مخلصین کا وفد بھیجتے رہنا جو یہ بات ان کے ذہن نشین کرائے کہ مسلمانوں کو ہمیشہ اتباع احکام الہیہ سے ہی کامیابی اور ترقی ہوئی ہے۔ محض اسباب ظاہر یا دیگر اقوام جیسا مظاہرہ مسلمانوں کیلئے ہرگز کافی نہیں ہوتا۔

د: مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کو شعائر اسلامیہ کی پابندی کی تبلیغ کرانا اور ان سے درخواست کرنا کہ مسلم لیگ کے ہر ممبر پر قانونی طور پر شعائر اسلامیہ کی پابندی کو لازم کیا جائے کہ اس پر کامیابی موقوف ہے اور قلوب اہل اسلام کا انجذاب بھی اسی سے ہوگا جو تنظیم کی بنیاد ہے۔

چنانچہ اس تبلیغی پروگرام پر نومبر 1938ء سے عملدرآمد شروع ہو گیا اور اس کی ابتداء قائداعظم کی تبلیغ سے ہوئی۔

تطہیر و تکفیر کی مساعی

ایک طرف تو حضرت تھانوی اور ان کے مخلصین کی جماعت اللہ کے دین کا بول بالا کرنے اور مسلمانوں کی دینی و دنیوی فلاح کی غرض سے مسلم لیگ والوں کو صحیح معنوں میں

مسلمان بنانے میں مصروف تھی اور دوسری طرف خود حضرت تھانوی کو کافر قرار دینے والا بریلویوں کا فتویٰ لوگوں میں تقسیم کیا جارہا تھا اور مسلم لیگ والوں کو بے دین ثابت کیا جارہا تھا۔ یہاں تک کہ قائداعظم کو کافر کہا جارہا تھا۔ تاکہ کسی طرح لوگ مسلم لیگ میں شامل نہ ہوں۔ اس پر حضرت نے ایک دوسرا اعلان بعنوان "الطریق الامم فی شرائط االاھم" جاری کیا اور اس میں لکھا کہ:

"بعض حضرات کانگرس کے مفاسد کے جواب میں اکثر اہل مسلم لیگ کے بعض اعمال دینیہ کی کوتاہیاں پیش کر کے بطور الزام ان کوتاہیوں کو اس کے ساتھ اتحاد کرنے کے جواز سے مانع قرار دیتے ہیں حالانکہ کہاں اصل ایمان کا فقدان کہاں فروغ اعمال کا نقصان۔ تو ایک کا قیاس دوسرے پر محض فاسد اور قیاس مع الفارق ہے۔ خصوصی جبکہ اس دوسرے نقصان کی اصلاح کی توقع بھی قریب ہو جس کی کوشش شروع بھی ہوگئی ہے۔

ظاہر ہے کہ اہل مسلم لیگ کی کوتاہیاں خوارج کے ساتھ اشتراک عمل جائز ہے تو مسلم لیگ کے ساتھ بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔ اس تحریر سے کانگرس اور مسلم لیگ کی حقیقت اور حکم میں صاف فرق ظاہر ہوگیا۔ اس پر بھی اگر کوئی شخص اپنے قیاس فاسد پر اصرار کرے تو کیا علاج۔"

جمعتہ العلماء ہند کی دعوت

جب کانگرس نے دیکھا کہ حضرت تھانوی مسلم لیگ کی پشت پناہی سے باز نہیں آرہے تو اس کی حلیف جماعت جمعیتہ العلماء ہند کے ناظم مولانا احمد سعید صاحب کی طرف سے مورخہ 26 فروری 1939ء کو حضرت تھانوی کی خدمت میں اس مضمون کا ایک دعوت نامہ پہنچا کہ

"جمعیتہ العلماء ہند کا جو اجلاس دہلی میں ہو رہا ہے اس میں شرکت کیلئے بہ نفس نفیس تشریف لادیں۔ اگر سفر کا تحمل نہ ہو تو کسی کو بطور نمائندہ روانہ فرمادیں۔ معاملات کی اہمیت حضور کے پیش نظر ہے۔"

حضرت تھانوی کا جواب

جمعتہ العلماء ہند کے دعوت نامہ کا حضرت تھانوی کی طرف سے مندرجہ ذیل جواب لکھا گیا:

"السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ آپ کا دعوت نامہ آیا۔ میرا عذر سفر تو آپ کو معلوم ہی ہے اس لئے خود تو حاضری سے قاصر ہوں۔ اگر دعوت نامہ کچھ پہلے آتا تو ممکن تھا کہ اس کے متعلق کچھ خط وکتابت کر کے کسی کو بھیجنے کا انتظام کرتا۔ اب عین وقت پر اس کا انتظام بھی مشکل ہے۔ اس لئے شرعی حیثیت سے صرف اپنی ایک رائے کا اظہار کرتا ہوں جس کے متعلق مولانا محمد کفایت اللہ صاحب سے زبانی گفتگو بھی ہو چکی ہے اور اب تو واقعات نے مجھ کو اس رائے پر بہت ہی پختہ کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا خصوصاً حضرات علماء کا کانگرس میں شریک ہونا میرے نزدیک مذہباً مہلک ہے۔ بلکہ کانگرس سے بیزاری کا اعلان کر دینا نہایت ضروری ہے۔ علماء کو خود مسلمانوں کی تنظیم کرنا چاہئے تاکہ ان کی تنظیم خالص دینی اصول پر ہو اور مسلمانوں کو کانگرس میں داخل ہونا اور داخل کرنا میرے نزدیک ان کی دینی موت کے مترادف ہے۔ والسلام اشرف علی۔" (افادات اشرفیہ)

مگر عین وقت پر اس کی روانگی روک لی گئی اور یہ جواب نہ بھیجا گیا۔ اس جواب کے نہ بھیجنے کی مصلحت اس وقت معلوم ہوئی جب جمعیتہ العلماء ہند کے مذکورہ بالا اجلاس میں ہونے والی تقریر کے رد عمل کے طور پر اجلاس کے اختتام کے قریب ہی مولوی مظہر الدین مالک اخبار الامان دہلی کو قتل کر دیا گیا اگر یہ جواب چلا جاتا تو یہی خیال کیا جاتا کہ حضرت کے جواب سے برافروختہ ہو کر جلسہ والوں نے ایسی تقاریر کیں جو مسلم لیگ کے ترجمان کے قتل پر منتج ہوئیں۔ چونکہ حضرت پر اس واقعہ کا ہونا منکشف ہو چکا تھا۔ اس لئے آپ نے جواب نہ بھیجنے دیا۔

قتل کی دھمکی

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہ کو 15 اپریل 1939ء کی ڈاک میں ایک خط موصول ہوا جس کے لفافہ پر مٹوناتھ بھجن ضلع اعظم گڑھ کے ڈاکخانہ کی مہر تھی۔ خط میں کاتب کا نام اور پتہ درج نہ تھا جس میں تحریر تھا کہ مسلم لیگ کی حمایت سے اپنا فتویٰ واپس لے لو۔ کانگرس کی حمایت کرو یہ ایک وقفہ ہے ورنہ تم کو تمہاری خانقاہ میں ذبح کر دیا جائے گا۔

لیگ خاکسار اتحاد

عین اس زمانہ میں جبکہ حضرت تھانوی کو لیگ کی حمایت کی پاداش میں قتل کرنے کی تیاریاں کی جارہی تھیں۔ مسلم لیگ خاکساران سے محبت کی پینگیں بڑھارہی تھیں۔ جس کے ذریعہ اس کے امیر علامہ مشرقی مسلمانوں میں اپنے عقائد کفریہ پھیلا رہے تھے جس کی خبریں تھانہ بھون میں مخلصین اور معترضین کے خطوط کے ذریعے برابر پہنچ رہی تھیں اور حضرت کو مطعون کیا جارہا تھا کہ آپ ایک ایسی جماعت کی تائید و حمایت کررہے ہیں جس کا تعلق علامہ مشرقی کی جماعت سے ہے۔ جو عقائد کفریہ رکھتے ہیں اس سے حضرت تھانوی کو سخت رنج پہنچا۔

صدر یوپی مسلم لیگ کی طلبی

اس سے کچھ عرصہ قبل قائداعظم کے ایماء پر نواب محمد اسماعیل خاں صاحب بیرسٹر ایم ایل اے صدر پارلیمنٹرین بورڈ یوپی مسلم لیگ نواب جمشید علی خاں صاحب کے ہمراہ لیگ کے خلاف حضرت تھانوی کے شکوک رفع کرنے کی غرض سے تھانہ بھون حاضری دے چکے تھے اور انہی کی یقین دہانی پر حضرت لیگ کی حمایت فرمارہے تھے۔ اس لئے لیگ خاکسار اتحاد کے سلسلہ میں حضرت نے ان سے ہی شکوہ کرنا مناسب سمجھا اور انہیں تھانہ بھون میں طلب فرمایا۔

افہام و تفہیم اور اس کا نتیجہ

چنانچہ نواب صاحب فوراً تھانہ بھون پہنچے۔ وہاں افہام و تفہیم کی جو گفتگو ہوئی اس کی تفصیل نواب صاحب یوں لکھتے ہیں کہ:

"دوسری مرتبہ مولانا نے خود مجھے تھانہ بھون میں طلب کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ علامہ مشرقی نے کوئی قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی۔ یا لکھنا شروع کی تھی۔ اس پر مولانا مرحوم کو سخت غصہ تھا۔ ان کو کسی نے یہ بھی بتادیا تھا کہ لیگ اور خاکساروں میں گہرا تعلق ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر ایسا ہے تو وہ لیگ سے بھی بیزاری کا اعلان کردیں گے لیکن اس سے قبل کہ وہ

ایسا کرتے انہوں نے مجھ سے تصدیق کرنی مناسب سمجھی۔ میں نے ان کو یقین دلایا کہ خاکساروں کا لیگ تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اکثر ہمارے جلسوں میں بغیر بلائے بحیثیت والنٹیروں کے آجاتے ہیں۔ میں ایک بیان شائع کروں گا جس میں پبلک کو ظاہر کردوں گا کہ لیگ کا خاکساروں کے ساتھ کوئی تعلق یا سمجھوتہ نہیں ہے۔ مولانا مطمئن ہوگئے۔ میں نے یہ بھی رائے پیش کی کہ اس سے قبل کہ مولانا کوئی بیان اخبارات کو دیں یہ بہتر ہوگا کہ علامہ مشرقی کو بتائیں کہ ان سے کیا کیا غلطیاں اس تفسیر میں ہوئی ہیں اور اگر وہ اپنی غلطیوں کا اعتراف نہ کریں تو ضرور ان کے خلاف بیان شائع کریں۔ اس کو انہوں نے خندہ پیشانی سے منظور فرمایا۔"

(مکتوب گرامی مورخہ 10 جنوری 1955ء)

حضرت تھانوی نے نواب صاحب کو بتلایا کہ وہ علامہ مشرقی کو اس سلسلہ میں لکھ چکے ہیں اور نواب صاحب نے واپس آکر بحیثیت صدر یو پی مسلم لیگ یہ بیان اخبارات میں شائع کرادیا کہ لیگ کا خاکساران سے کوئی تعلق یا واسطہ یا سمجھوتہ نہیں ہے۔ جس سے حضرت کو تسلی ہوگئی۔

سیاست کے کرشمے

اسلام نے تو سیاست کی بنیاد امانت و دیانت پر رکھی تھی۔ مگر دانایان فرنگ نے اسے خود غرضی و مطلب پرستی کا ذریعہ بنادیا اور جائز و ناجائز حلال و حرام اور دوست دشمن کی تمیز اڑا دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ذاتی مفاد کی خاطر قومی مفاد قربان کیا جانے لگا اور ذاتی اغراض کیلئے دوستوں کو بھی دشمن سمجھنے لگا۔

اس زمانہ میں پنجاب کی "اتحادی حکومت" تھی۔ جس کی عنان وزارت سر سکندر حیات خاں مرحوم کے ہاتھ میں تھی۔ اس کی پالیسی اگرچہ مسلم لیگی تھی مگر اپنی وزارت کے استحکام کیلئے کانگرسیوں سے بھی انہوں نے دوستانہ گانٹھ رکھا تھا۔ حسن اتفاق سے مسلم لیگ کو 39ء میں امرتسر کا ضمنی الیکشن لڑنا پڑا۔ مسلم لیگ نے امرتسر کے مشہور قومی کارکن شیخ صادق حسین صاحب کو نمائندہ منتخب کیا۔ کانگرس ان کے مقابلہ میں امرتسر کے مشہور کانگرسی رہنما ڈاکٹر سیف الدین صاحب کچلو کو میدان میں لے آئی۔ گو دونوں کا امرتسر اپنا گھر تھا۔ جوڑ بھی برابر کے تھے۔ مگر کانگرسیوں کو کچھ لیگیوں کا پلہ بھاری معلوم ہوا۔ اس لئے

شیخ صادق حسین صاحب کو پچھاڑنے کیلئے کانگرس کی حلیف جماعت احرار نے بھی الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا اور اپنا مشہور اور مخلص رہنما چودھری افضل حق مرحوم مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ ان کا اگرچہ امرتسر گھر نہیں تھا مگر ان کی جماعت احرار کا گڑھ ضرور تھا۔ اب ذرا لیگ والوں کے بھی کان کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اگرچہ خاکساروں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا جن کا وہ عہد شباب تھا۔ مگر وہ جانتے تھے کہ علماء حق کی امداد کے بغیر وہ کانگرس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس وقت سر سکندر حیات خاں کی بالکل وہی حالت تھی جس حالت سے چار سال قبل مولانا شوکت علی مرحوم کو جھانسی کے میدان میں دوچار ہونا پڑا۔ اس کامیاب سیاستدان نے دیکھا کہ اگر حضرت تھانوی شیخ صادق حسن صاحب کے حق میں چند سطریں لکھ دیں تو وہ ان کی روحانی قوت سے احرار اور کانگرس کو شکست فاش دے سکیں گے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت تھانوی کی خدمت میں آنریری سیکرٹری پنجاب پراونشل مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کی معرفت درخواست امداد بھیجی۔

سر سکندر حیات خاں کو ٹکا سا جواب

جس وقت سر سکندر حیات خاں کا ذاتی پیغام امداد تھانہ بھون پہنچا اس وقت حضرحیات کے کانوں تک یہ خبریں بھی پہنچ چکی تھیں کہ:

1۔ شیخ صادق حسن صاحب خاکساروں کی امداد سے الیکشن لڑ رہے ہیں۔

2۔ بعض لیگی حضرات کانگرسی علماء کو سامنے رکھ کر بلا استثنٰی علماء کرام کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

3۔ اور کہ وہ شعائر اسلام کی پابندی بھی نہیں کر رہے جس کی حضرت انہیں تبلیغ کرتے اور کراتے رہتے تھے۔ اس لئے حضرت کو ارباب لیگ سے سخت شکوہ تھا۔ سر سکندر حیات خاں کے خط آنے کے بعد اب آپ کو انہیں کھری کھری سنانے کا موقع ہاتھ آیا اور آپ نے سر سکندر حیات خاں کو ایسا ٹکا سا جواب دیا جو انہیں کبھی کسی اور نے نہ دیا تھا۔

داستان شکوہ لیگ

یہ تاریخ اور بصیرت افروز مکتوب سر سکندر حیات خاں کے خط کا صرف جواب ہی نہ تھا بلکہ ارباب مسلم لگ کے شکوہ کی مکمل داستان بھی تھی۔ حضرت رحمت اللہ علیہ نے لکھا:

از اشرف علی عفی عنہ، یکم رجب، جمعہ 58ھ

السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ الطاف نامہ صادر ہوا۔ احقر تو مسلم لیگ کا ہمیشہ سے حامی ہے اور وہ حمایت الحمد اللہ کہ کسی غرض کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی دنیوی اصلاح میں اس وقت مسلم لیگ ہی میں شامل ہونے میں سمجھ رہا ہوں اور کانگرس میں داخل ہونے میں دینی و دنیوی دونوں کا نقصان خیال کرتا ہوں لیکن ہر مسلمان جانتا ہے کہ دنیا سے دین مقدم ہے اور تاریخی واقعات و شواہد سے یہ بھی ثابت ہے کہ جب تک مسلمان دین اور مذہب پر قائم رہے اور اس قدر پختگی سے قائم رہے کہ لوگ ان کو مجنون سمجھتے تھے۔ ان کو دین کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی تعمیل کی دھن تھی۔ اس وقت تک دنیوی اعتبار سے بھی مسلمان ہر طرح کامیاب رہے اور تمام دنیا میں ان سے آنکھ ملانے والا کوئی نہ تھا۔ اور جب سے اس میں کمی آئی اسی وقت سے ذلیل ہوتے ہوتے اب ان کی ذلت کی انتہا ہو چکی ہے اور تمام سمجھدار حضرات اپنی تقریروں اور تحریروں میں فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی ماضی کی طرف لوٹنا چاہیے۔ مگر نا معلوم اس کا مفہوم کیا سمجھ لیا ہے کہ اس کو فرماتے سب ہیں۔ جانتے سب ہیں، مگر دین کی باتوں سے گریز ہے۔ کہتے ہیں مگر عمل نہیں کرتے۔ سو اگر حضرت لیگ دینداری کی طرف توجہ فرماتے تو آج لیگ کی ترقی سے تمام اقوام خائف ہوتیں۔ مگر نا معلوم کون سی چیز مانع ہے۔ کہ اس طرف نہیں آتے۔ میں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسہ پٹنہ میں ایک پیغام بھیجا تھا جو وہاں پڑھا بھی گیا تھا اور سب حضرات کو تقسیم بھی کیا گیا تھا۔ اس میں صرف دو چیزوں کی طرف میں نے توجہ دلائی تھی۔ اول نماز کی پابندی کو لیگ کے مقاصد میں شامل کیا جاوے دوسرے وضع اسلامی کو لیگ کے ہر ممبر پر لازی قرار دیا جاوے۔ نماز کا ارکان اسلام میں اہم ترین رکن ہونا ہر مسلمان کو معلوم ہے اور وضع خاص رکھنا تو ایسی چیز ہے کہ

دنیا کے تمام سیاست دان اس کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ جرمنی کا لباس الگ ہے۔ فرانسیسی کا الگ وعلیٰ ہذا اور فوجی وردی تو لازمی طور پر الگ ہوتی ہے۔ اگر جرمنی سپاہی مثلاً انگریزی وردی پہن کر جرمنی فوج میں شامل ہو اور ویسے ہر طرح وفادار اور مستعد ہو لیکن صرف وردی کی تبدیلی کی وجہ سے وہ مستوجب سزا کا ہو گا وعلیٰ ہذا تو کیا مسلمان کے لئے جو حق تعالیٰ کی فوج ہے کوئی خاص وضع اور امتیاز ضروری نہیں ہے اسے اور ضروری ہے۔

لیکن افسوس کہ حضرات لیگ نے ان دونوں باتوں کی طرف کوئی توجہ نہ فرمائی۔ اگر ان باتوں کی طرف توجہ فرماتے تو دین کی اور باتیں بھی جو ترقی دنیا میں بھی موثر ہیں میں اور بتلاتا مگر مجھے واقعی حضرات لیگ سے یہ شکایت ہے کہ مولویوں کو صرف الیکشن کے وقت پوچھا جاتا ہے اور ان کے فتوؤں پر عمل کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور پھر ان کی بات کی طرف کوئی کان نہیں دھرتا۔ ہم اگر ذاتی منافع کے لئے کچھ بھی لکھیں تو بیشک نہ سنئے۔ نہ مانئے لیکن اگر ان حضرات کو ہم پر اعتماد ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہم فتویٰ صحیح دیتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ وہ الیکشن ہی کے لئے صحیح ہوتا ہے۔ دوسرے وقت وہ قابل عمل نہیں ہوتا۔ میری غرض لیگ کی حمایت سے یہی تھی کہ اس میں بحمد اللہ سمجھدار، عالی دماغ مسلمان ہیں تو ان حضرات سے جب دینداری کے لئے کہا جائے گا تو بہت جلد مان لیا جائے گا تو گویا لیگ کی حمایت دین کی حمایت تھی اور جب میں دیکھتا ہوں کہ اصل چیز یعنی دین ہی سے بے تعلقی اور بے توجہی ہی ہے تو بجز خاموش کے اور کیا کروں۔ آپ ہی انصاف فرمادیں کہ اب میرا کیا جی چاہے یہاں تک تو وہ امور عرض کئے تھے جن کی طرف حضرات لیگ کو متوجہ کر چکا ہوں اور پھر بھی انہوں نے عمل نہیں کیا۔

اب دو نئی چیزیں پیدا ہوئی ہیں جن سے میں بہت پریشان ہو رہا ہوں ایک تو لیگ کا علامہ مشرقی سے تعلق اور دوسرا ذمہ داران لیگ کا علماء کے وقار اور ملاازم کے برباد کرنے کی ترغیب دینا ہے۔ مشرقی کی کتابیں میں نے بھی دیکھی ہیں اور جہاں تک ہو سکا میں نے اس کے اقوال کی تاویل بھی کی مگر وہ انتہا کو پہنچا ہوا ہے اور اس کے عقائد جن کی رفتہ رفتہ وہ خاموشی سے تبلیغ کر رہا ہے صریح کفر ہے اور چونکہ مسلم لیگ اس وقت تک مسلمانوں میں مقبول جماعت ہے مگر خاکساروں کی حمایت کی وجہ سے لوگ لیگ سے بھی بدظن ہو رہے ہیں۔ جس کا مجھے اس طرح علم ہوا ہے کہ اکناف ہند سے ان لوگوں کے سوالات میرے پاس

آرہے ہیں جواب تک مسلم لیگ کے سرگرم اور حامی ممبر تھے۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ لیگ جب خاکساروں سے تعاون کرتی ہے تو اب مسلم لیگ میں داخل رہنا جائز ہے یا نہیں؟ غرض ان خاکساروں سے ملنے کی وجہ سے بھی لیگ بدنام ہو رہی ہے اور جو شخص اب لیگ کی جدید حمایت کرے گا وہ بھی بدنام ہوگا۔ دوسری چیز لیگ والوں کا بلا کسی استثناء کے علماء کے وقار کو تباہ کرنے کی ترغیب دینا ہے۔ اگر کانگرسی علماء سے بچایا جاتا تو یہی سمجھا جاتا کہ اختلاف مسلک کی وجہ سے کیا جاتا ہے مگر بلا کسی استثناء کے علماء کے اثر کو مٹانے کی سعی کے معنی تو مذہب کو مٹانے کی سعی کرنا ہے اور جو جماعت دین کو مٹانے کی فکر میں ہو آپ ہی انصاف فرما دیں کہ اس سے میں کہاں تک تعاون کر سکتا ہوں۔

مجھے بھی افسوس ہے کہ مجھے جناب سے نیاز حاصل نہیں ہے اور سر سکندر حیات خاں صاحب کے ارشاد کے بعد مجھے ایک ایسی تحریر لکھنا پڑی جو بظاہر خلاف تہذیب ہے۔ مگر مسلمانوں کے اصل تہذیب چونکہ دین ہے اور دین کی خیر خواہی مجھے مجبور کرتی ہے کہ ان حالات میں میں اس ارشاد کی تعمیل سے عذر کروں۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ وہ معاف فرمائیں گے اور اگر ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے تو شاید وقت آجائے گا اور لیگ خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام پر عمل کرنا شروع کر دے۔ تو میں لیگ کا ہر وقت خادم ہوں۔ اخیر میں ایک دم تنزل کر کے عرض کرتا ہوں کہ آپ کی خدمت میں اور وزیر صاحب کی خدمت میں بھی جن سے مجھ کو ان کے غائبانہ اوصاف خصوصی اسلامی حمیت سن کر مدت سے خاص محبت ہے وہ عرض یہ ہے کہ اگر پابندی شرعی وضع کو مقاصد لیگ کا جزو بنانا کسی دنیاوی مصلحت کے خلاف کہا جاوے یا ہمت سے بڑھ کر خیال کیا جاوے تو کم از کم ان چیزوں کو تو ممنوع قرار دیا جائے جن سے لیگ کی دنیوی قوت کو یا بالفاظ دیگر اسلامی مفاد کو صدمہ یا ضعف پہنچتا ہو جن کی طرف میں نے اس خط میں اشارہ کیا ہے اور اگر خدانہ کرے یہ بھی نہ ہو سکے تو پھر میں کسی کی آزادی میں خلل ڈالنا نہیں چاہتا۔ مگر یہ درخواست ضرور کروں گا کہ پھر میری آزادی میں بھی خلل نہ ڈالا جائے اور مجھ کو اجازت دی جائے کہ اپنے لئے جو طریق عمل مناسب سمجھا جاوے تجویز کر لوں۔

میں جانتا ہوں کہ اس خط میں بہت سے ایسے امور عرض کئے گئے جو اصل سوال سے زائد ہیں۔ مگر اس کا باعث صرف یہ ہوا کہ آپ کے خط سے اسلامی ہمدردی کی جھلک محسوس

ہوتی تھی۔ پھر جناب وزیر صاحب کی توجہ بھی۔ اس لئے توقع ہوئی کہ شاید یہ توجہ کچھ ترقی کر کے اصلاح میں موثر ہو جائے لیکن اگر یہ بے محل سمجھا جاوے تو آپ سے اور جناب وزیر صاحب سے معافی کا خواستگار ہوں۔ اگر توجہ صرف نہ کی جاوے تو جواب کی تکلیف نہ فرمائی جاوے باقی دعا ہر حال میں اپنا فریضہ ہے۔

حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس
در بند آں مباش نشنید یا شنید

(مشاہدات وواردات صفحہ 205 تا 207)

نواب محمد اسماعیل خان کی درخواست امداد

سر سکندر حیات خاں تو حضرت کا جواب پڑھ کر جہاں تھے وہیں رہ گئے۔ اب ہائی کمان نے نواب محمد اسماعیل خاں صاحب صدر یوپی مسلم لیگ کو لکھا کہ وہ حضرت تھانوی سے شیخ محمد صادق حسن صاحب کیلئے بیان حاصل کریں کیونکہ حضرت تھانوی ان کا بہت احترام کرتے تھے اور ان سے ذاتی طور پر بھی متعارف تھے۔ اس لئے نواب صاحب نے حضرت کی خدمت میں خط لکھا اور تمام واقعات تحریر کر کے ایک بیان جاری کرنے کی استدعا کی۔

شرائط امداد

اس درخواست کے جواب میں حضرت کے ارشاد پر دربار اشرفیہ کی طرف سے مندرجہ ذیل خط نواب صاحب کو لکھا گیا۔

"مخدوم و محترم جناب نواب صاحب زاد مجدکم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

الطاف نامہ حضرت والا دام ظلہم کی خدمت میں آیا۔ اخبارات میں بیان دینے سے اطمینان ہوا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ خیر الجزا۔ شیخ صادق حسن صاحب کے لئے جو پیغام جناب نے طلب فرمایا ہے بیان تو کیا ایک فتویٰ کی شکل میں تحریر حضرت والا کی طرف سے ارسال کی جاسکتی تھی مگر امرتسر کے بعض متدین وثقہ حضرات سے جو آج کل خانقاہ میں آئے ہوئے ہیں معلوم ہوا کہ شیخ صاحب موصوف خاکساروں کے بہت زیادہ حامی ہیں اور ان کے موجودہ الیکشن میں بھی خاکساروں سے ہی امداد لی جارہی ہے۔ ان حضرات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ

اس تعاون کی وجہ سے مسلمان شیخ صاحب سے بہت بددل ہو رہے ہیں۔ حضرت والا شیخ صاحب سے اور ان کے حالات سے واقف نہیں۔ اگر امرتسر کے ان حضرات کی اطلاع صحیح ہے تو آپ غور فرمائیے کہ ایک طرف تو مشرقی کے وہ حالات حضرت والا کے سامنے ہیں جن پر کفر وارتداد کے فتویٰ ہیں۔ اور دوسری طرف شیخ صاحب کا ان سے تعاون ہو۔ تو انکی حمایت میں فتویٰ دینے کے کیا معنی ہوں گے؟ اور اگر یہ اطلاع کہ شیخ صاحب خاکساروں کے حامی ہیں۔ غلط ہے تو اس کی سہل تجویز یہ ہے کہ حضرت والا کی خدمت میں شیخ صاحب کی طرف سے ایک سوال روانہ کیا جائے۔ کہ پنجاب اسمبلی کی مسلم سیٹ کے لئے الیکشن ہو رہا ہے۔ جس میں مسلم لیگ کانگرس اور احرار تینوں نے امیدوار کھڑے کئے ہیں۔ اور مسلم لیگ کے امیدوار کو خاکساروں سے کوئی ہمدردی اور تعلق نہیں ہے۔ جیسا کہ مشہور کیا جا رہا ہے۔ ان حالات میں کس جماعت کے امیدوار کو ووٹ دیا جائے۔ اس سوال کا جواب حضرت والا تحریر فرمادیں گے۔ پھر اس سوال اور جواب کو پورا شائع کر دیا جائے۔ اگر ممکن ہو تو یہ سوال شیخ صاحب کی طرف سے براہ راست حضرت کی خدمت میں جلد آجانا چاہئے۔ تاکہ جواب جلد پہنچ جاوے۔

علامہ مشرقی کا رویہ

اس کے بعد گزارش یہ ہے کہ جناب کی تشریف آوری کے وقت بتلایا گیا تھا کہ مشرقی سے خط و کتابت ہو رہی ہے۔ اور اخیر خط میں مشرقی کے پاس بارہ سوال بھیجے گئے ہیں۔ چنانچہ ان سوالات کا جواب "مینیجر الاصلاح" کی طرف سے یہ آیا ہے کہ اعتراضات کے خطوط مشرقی کے سامنے پیش کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اور عام طور پر یہ دفتر بھی ایسے خطوط کا جواب نہیں دیتا۔ اور آئندہ آپ کو بھی جواب نہ دیا جائے گا۔ مشرقی کے جو موجودہ عقائد ہیں۔ ان پر بجز ارتداد کے اور کوئی حکم نہیں لگتا۔ مگر حضرت والا نے احتیاط کی وجہ سے اور تبلیغ حق کے لئے چاہا تھا۔ کہ ان سے زبانی گفتگو ہو جاوے۔ شاید وہ عقائد کی اصلاح کر لیں۔ اس پر وہ آمادہ نہ ہوئے۔ تو سوالات کے ذریعہ ان کو متنبہ کیا گیا۔ اس کا انہوں نے مذکورہ بالا جواب دیا۔ گویا آئندہ کی امید کو بھی قطع کر دیا۔

اصلاح کی آخری سعی

اب چونکہ جناب نے فرمایا تھا۔ کہ مشرقی میرٹھ آنے والے ہیں۔ اس وقت تم لوگوں

کو بھی بلایا جاوے گا۔ سو اگر اس کی امید جلد ہو تو اس کا انتظار کیا جاوے۔ جلد سے مراد ہفتہ عشرہ ہے۔ اگر یہ نہ ہو۔ تو جناب کوئی ایسی تدبیر فرماویں کہ وہ ہم لوگوں کو گفتگو کے لئے جلد سے جلد کافی وقت دے۔ اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو۔ تو پھر عوام کی اصلاح کے لئے فتویٰ شائع کر دیا جائے۔ اس میں جو صورت جناب کے نزدیک مناسب ہو۔ اس سے مطلع فرمایا جاوے۔ بطور مشورہ یہ سب صورتیں پیش کر رہا ہوں۔ والسلام۔

"احقر۔۔۔۔۔۔۔۔از تھانہ بھون"

بیان اور فتویٰ کا فرق

حضرت تھانوی کے ایماء پر جب مندرجہ صدر جواب لکھا جا چکا تو اس پر حضرت نے اپنی طرف سے مندرجہ ذیل عبارت ایزاد فرمائی:

"از اشرف علی۔ السلام علیکم۔

مکرمت نامہ کے جواب میں خلاف معمول قدرے تاخیر اس لئے ہوئی کہ واقعات و مصالح و نتائج کے تعارض سے دماغ پریشان ہو گیا۔ اور مناسب طریق سوچنے میں بہت وقت صرف ہوا۔ آخر فیصلہ ذہن میں یہ آیا کہ بیان متعارف کو مسلمان ایک رائے کے درجہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ نہ اس کا کچھ اثر ہوتا ہے۔ البتہ فتویٰ کو نظر عظمت سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے یہ صورت مناسب ہے اور اس کا موثر ہونا موقوف ہے۔ بدگمانی نہ ہونے پر۔ اس لئے خاکساروں سے بے تعلقی کے سوال پر تصریح ضروری ہے۔ والسلام۔"

چنانچہ اس خط کے پہنچنے کے بعد لیگ والوں نے صراحتاً خاکساروں سے بے تعلقی کا اعلان کر دیا۔ جس پر حضرت نے فتویٰ کی صورت میں شیخ صادق حسن کی امداد کرنے کا اعلان فرمایا۔ اور بفضلہٖ تعالیٰ حضرت کی دعا اور فتویٰ مقبول ہوا۔ اور شیخ صاحب کانگرس اور احرار دونوں کو شکست دے کر پنجاب اسمبلی میں جا پہنچے۔

علامہ مشرقی جن سے حضرت ملنا چاہتے تھے۔ لکھنو میں ہی گرفتار کر لیئے گئے۔ جس کی وجہ سے وہ میرٹھ نہ پہنچ سکے۔ اور اس طرح ان سے ملاقات کی صورت نہ نکل سکی۔ اور انکی اصلاح کی کوشش ناکام رہی۔

کانگرس کی مخالفت

اگرچہ ہندوستان کے بڑے بڑے علماء کانگرس کے ساتھ تھے مگر ان کی نظر وقتی اور ذاتی مصالح پر تھی۔اس کے نتائج پر نہ تھی۔ بخلاف ان کے حضرت کی نظر حق تعالیٰ کے اس فیصلہ پر تھی کہ:

ولایزالون یقاتلونکم حتی یردو کم عن دینکم ان استطاعوا

کفار تو ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے۔یہاں تک کہ اگر قابو پاویں۔ تو تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں۔

جس کی روشنی میں آپ پر کانگرس کے عزائم واضح ہو چکے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے آپ سے سوال کیا کہ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی جو 1857ء میں لڑی گئی کیوں ناکام رہی۔ جبکہ اس کی کمان حضرت سید اسماعیل شہید اور سید احمد بریلوی ایسے نفوس قدسیہ کے ہاتھ میں تھی۔ تو آپ نے فرمایا کہ:

"1857ء کی جنگ آزادی میں اس لئے ناکامی ہوئی کہ اس تحریک میں ہندو شامل تھے۔دونوں شانہ بشانہ لڑ رہے تھے۔ مگر ہندوؤں نے وقت پر دغا دیا۔اب بھی ان سے وفا کی امید نہیں ہے۔یہ وقت پر دھوکہ دیں گے۔ مسلمان اپنی ہی پاؤں پر کھڑا ہو کر کامیاب ہو سکتا ہے۔دوسروں کے سہارے کبھی نہیں۔"

اس لئے آپ وفاق ہند کے مخالف تھے۔اور چاہتے تھے کہ مسلم لیگ شرعی حدود کے اندر رہ کر اکیلے جنگ پاکستان لڑے۔ تاکہ کامیابی یقینی ہو۔ چنانچہ جب تک مسلم لیگ کانگرس کی ہم نوا رہی۔ آپ اس سے بالکل الگ رہے اور جب اس نے دوسروں کا سہارا چھوڑ کر اپنا پلیٹ فارم الگ بنایا۔ تب آپ نے اس کی حمایت شروع کر دی۔

آپ کانگرس کے مخالف اس لئے نہ تھے کہ اس سے آپ کو کوئی ذاتی فائدہ تھا۔ بلکہ آپ اس کی مخالفت کیلئے اس لئے مجبور تھے کہ وہ آزادی ہند کے بعد ہندوستان سے اسلام کو مٹانا چاہتی تھی۔ چنانچہ جونہی زمام اقتدار اس کے ہاتھ میں آئی۔ مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹنے شروع ہو گئے۔ ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ مسجدوں کو مندروں میں

بدلا جانے لگا۔ اور ہر اس روایت کو حرف غلط کی طرح مٹانے کے درپے ہو گئی۔ جس کی صرف نسبت مسلمانوں سے تھی۔ یعنی حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے جو باتیں 1928ء اور 1938ء میں ان کے عزائم کے متعلق بھری مجلس میں فرمائی تھیں۔ 1948ء کے بعد کے حالات نے ان کی حرف بہ حرف تصدیق کر دی۔ اور کانگرس کی اس مسلم کش پالیسی کے خلاف بالاخر انہی حضرات کو ہندوستان کی پارلیمان میں احتجاج کرنا پڑا۔ جو تحریک آزادی کے زمانہ میں حضرت کے مسلک کی مخالفت کرنے والوں کی صف اول میں نظر آتے تھے۔ مگر کسی نے اس وقت اس پر غور نہ کیا کہ قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔ جس کی وجہ سے انہیں روز بد دیکھنا نصیب ہوا۔

مخالفت میں احتیاط

اس سیاسی کشمکش کے دوران میں آپ نے ہمیشہ انتہائی احتیاط سے کام لیا۔ مثلاً

۱۔ جن معاملات میں علماء کا اختلاف ہوتا۔ ان میں بدوں کسی مکمل تحقیق و تفتیش کے کوئی فتویٰ یا اعلان شائع نہ فرماتے۔

۲۔ مقدور بھر تحقیق کے بعد اگر اعلان کی ضرورت بھی ثابت ہوتی۔ تو اس وقت بھی دوسری جانب کی پوری رعایت رکھ کر اعلان فرماتے۔ جس سے اختلاف کی خلیج وسیع ہونے اور عوام کو علماء کے خلاف برسرپیکار آنے کا موقع نہ ملتا۔

۳۔ اعلان کے بعد تحقیق حال اور مفاہمت کا سلسلہ برابر جاری رکھتے۔ اور قابل قبول چیزوں کو قبول کرنی کے لئے ہمیشہ تیار رہتے۔

مسلک کی ندرت

سیاسی کشمکش کے دوران میں علمائے امت اور لیڈران قوم ہر مسئلہ پر مختلف الرائے رہے۔ ہر جماعت نے اپنے علم یا تحقیق یا غرض کے ماتحت واقعات کو قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ واقعات بھی بسرعت تمام بدلتے رہے۔ جس کی وجہ سے شرعی نقطہ نظر سے کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی تھی۔ ان حالات میں حضرت کا جماعتی مسلک ان کے اپنے ارشاد کے مطابق ہمیشہ یہ رہا کہ۔

"نہ اعلان حق میں کبھی دریغ کیا۔ نہ عمل میں کبھی نمائش اور ہنگامہ آرائی کو دخل دیا۔ میری جماعت جس طرح شورش پسند نہیں۔ اسی طرح کسی اثر سے متاثر ہو کر کتمان حق

کرنے والی بھی نہیں۔"

(معاملۃ المسلمین فی مجادلتہ غیر المسلمین)

سیاسی تحریکات میں عدم شرکت

حضرت چونکہ درویش طبع تھے۔ اس لئے وہ سیاسی تحریکات میں حصہ نہ لیتے تھے۔ مگر سیاسی تحریکات کے متعلق جب آپ کے پاس استفسارات آتے تھے۔ تو اس وقت بحیثیت مجدد الملت اور حکیم الامت آپ کو مسئلہ کی شرعی حیثیت واضح کرنی پڑتی تھی۔ بس آپ کا سیاسیات میں صرف اسی قدر حصہ تھا۔ اگرچہ آپ کو سیاست کے عملی میدان میں لانے کیلئے کانگرس اور اس کے حلیف جماعتوں نے بہت کوشش کی۔ مگر آپ ہمیشہ ان سے الگ تھلگ رہے کیونکہ آپ فرماتے تھے کہ:

"میرے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت کی جماعت وابستہ ہے۔ جب تک مجھ کو شرح صدر نہ ہو جائے۔ میں شریک ہو کر اتنے سارے مسلمانوں کی ذمہ داری کس طرح اپنی سر لے لوں۔ کیا قیامت کے دن میری گردن نہ ناپی جائے گی۔ میں تو ان تحریکات کو مسلمانوں کے لئے سراسر مضر اور اس سلسلہ میں اکثر عوام میں جو طریق عمل اختیار کئے جا رہے ہیں۔ انکو ناجائز سمجھتا ہوں۔ نیز میرے نزدیک ان کا نتیجہ سوائے ضرر کے اور کچھ نہیں۔"

(اشرف السوانح جلد ۳ ص ۱۶۰)

یہاں تک کہ آپ نے مسلم لیگ میں بھی شرکت نہ فرمائی جس کو آپ کی تائید و حمایت حاصل تھی۔

بے نظیر استقلال واستقامت

غرضیکہ ان سیاسی طوفانوں نے بڑے بڑے ارباب استقامت کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ مگر کوہ استقلال کو اپنے مقام سے نہ ہٹا سکے۔ چنانچہ حضرت بطور تحدث بالنعمۃ فرمایا کرتے تھے کہ:

"سب کو کچھ نہ کچھ اپنے مرکز سے ہٹنا پڑا۔ لیکن الحمد للہ میں جس مرکز پر اول روز تھا۔ اس مرکز پر آج تک بدستور قائم ہوں۔ مجھ کو بفضلہ تعالیٰ اپنی رائے سے ایک انچ بھی نہیں ہٹنا پڑا۔ بلکہ تجربوں نے تو اور بھی مجھ کو اپنی رائے پر مستحکم کر دیا ہے۔"

(اشرف السوانح جلد ۳ ص ۱۶۱)

معاملہ المسلمین

رسالہ معاملتہ المسلمین فی مجادلتہ غیر المسلمین

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ملک ہندوستان میں دوسرے ملک کے رہنے والی ایک غیر مسلم قوم حکمراں ہے اور اس کی رعایا میں دو جماعتیں ہیں ایک مسلم ایک غیر مسلم۔ غیر مسلم رعایا نے اپنی ایک قومی سیاسی مجلس بنائی جس میں کچھ مسلمان بھی شریک ہوگئے اور حکمران قوم سے آزادی حاصل کرنے کے لئے ذیل کی تدابیر اختیار کریں۔

۱ حکومت کی قانون شکنی کی جاوے وہ قانون فی نفسہ مباح ہی ہو یعنی اس کے ماننے سے کسی واجب کا ترک یا حرم کا ارتکاب لازم نہ آوے۔ اور اگر اس پر حکومت تشدد کرے تب بھی مدافعت نہ کرے۔ نہ مقابلہ سے اور نہ قانون شکنی کے ترک کرنے سے۔ گو اس اصرار سے بعض اوقات ہلاکت تک کی بھی نوبت آجائے حالانکہ قانون شکنی سے بچکر اپنی جان کی حفاظت کرسکتے تھے۔

۲ حکومت سے معاملات میں مقاطعہ کیا جاوے یعنی نہ اس کی نوکری کریں اگرچہ جائز ہی نوکری ہو اور اگرچہ دوسرے ذرائع معاش کے فقدان سے نوکری نہ کرنے سے کتنی ہی تنگی ہو نہ اس کی تعلیم گاہوں میں تعلیم حاصل کی جائے اگرچہ وہ تعلیم مباح ہی ہو اور نہ اس کے ملک کی تجارتی اشیاء (خصوص پارچہ) خریدی جاویں۔

۳ جن دوکانوں پر ایسی اشیاء کی تجارت ہوتی ہو ان پر پہرہ دار مقرر کئے جائیں کہ وہ خریداروں کو جس طرح بھی ممکن ہو روکیں۔ اول زبانی فہمائش سے اگر اس سے نہ مانیں تو ان کے راستہ میں لیٹ جائیں تاکہ وہ مجبور ہو جائیں اور اگر خرید چکے ہوں تو ان کو واپسی پر مجبور کریں گو دوکاندار خوشی سے واپس نہ کرے۔ اسی طرح دوکاندار کو ایسی اشیاء کی تجارت بند کرنے پر مجبور کریں اگر وہ نہ مانے تو اس کو طرح طرح کی

تدبیروں سے ضرر پہنچائیں دیں دھمکیاں دیں گو اس دوکاندار کے پاس اور کوئی ذریعہ معاش نہ ہو اور گو اس تجارت کے بند کرنے سے وہ اور اس کے اہل و عیال بھوکوں مریں۔

۴ اپنے رہبروں کی گرفتاری وغیرہ کے موقعوں پر ہڑتال کرا دینا یعنی دوکانیں بند کرادینا اگرچہ کسی کو دوکان بند کرنے سے فاقہ ہی کی نوبت آجاوے۔ اور جو شخص ان مقاطعات و احتجاجات مذکورہ نمبر۲ و نمبر۳ و نمبر۴ میں ان سے شرکت نہ کرے اس کو اذیت پہنچانے میں حتیٰ کہ بعض اوقات موقع پاکر زد و کوب کرنے میں بھی دریغ نہ کریں۔

۵ ان مذکورہ پہروں اور ہڑتالوں مں بے پردہ عورتوں سے مدد لینا اگرچہ وہ جوان اور زینت سے آراستہ ہوں یعنی ان کا دوکانوں پر بے حجابانہ بیٹھنا اور سڑکوں پر پھرنا یا خرید و فروخت سے روکنا ہڑتال وغیرہ کی ترغیب دینا اور اس مقصود کے لئے اجنبی مردوں سے بے تکلف خطاب و اختلاط کرنا اور ہاتھ جوڑ کر یا راستہ میں لیٹ لیٹ کر خریداروں کو مجبور کرنا جس سے بعضے غلبۂ حیا سے اور اکثر غلبۂ شہوت سے متاثر ہو جاتے ہیں اور اس میں نگاہ اور قلب کا فتنہ تو یقینی ہے اور بعض اوقات اس سے آگے فحش افعال میں بھی ابتلا ہو جاتا ہے۔

۶ اگر کوئی گرفتار ہو جائے ان میں سے بعضے لوگ جیل خانہ میں مقاطعہ جوعی کرتے ہیں یعنی کھانا نہیں کھاتے یہاں تک کہ مرجاتے ہیں اور قوم میں ان کی مدح کی جاتی ہے۔

۷ وقتاً" فوقتاً" جلسے کئے جاتے ہیں جلوس نکالے جاتے ہیں ان میں تلیسی تقریریں کی جاتی ہیں بعض اوقات کنواری بیاہی نوجوان عورتیں بھی تقریر کرتی ہیں' خلاف شرع نظمیں پڑھی جاتی ہیں باجا وغیرہ بھی بجایا جاتا ہے۔

۸ ان تحریکات کی غرض خود اس جماعت کے اقرار سے تو ایک ایسی حکومت کا قائم کرنا ہے جس میں عنصر غالب ہو اس غیر مسلم جماعت کا ہوگا اور عنصر مغلوب جماعت مسلم کا۔ مگر واقع میں یہ عنصر مغلوب بھی برائے نام ہی ہے اصلی غرض اس غیر مسلم جماعت کا تسلط ہے جس سے شعائر اسلام اور جماعت مسلمین ذاتاً" یا مذہباً" بالکل فنا ہو جائیں چنانچہ خود اس جماعت کا نظام مجوزہ اور اس جماعت کے معاملات و واقعات اور

تقریرات و تحریرات اس پر کافی گواہ ہیں۔ چنانچہ تھوڑا ہی زمانہ گزرا کہ اس جماعت غیر مسلم نے عام مسلمانوں کو آزادی کی جدوجہد میں شریک کرنے اور ان سے مدد لینے کے لئے ایک قرار داد منظور کی تھی جس سے مسلمانوں کے مذہبی و قومی مصائح اور ملکی حقوق کا ایک حد تک تحفظ ہوتا تھا چنانچہ اس قرارداد کی وجہ سے مسلمان بہت کچھ مطمئن ہوگئے تھے لیکن بعد میں اس جماعت نے اپنی دوسری خالص مذہبی و قومی مجلس اعظم کے ایماء و ہدایت کے موافق اس قرارداد کو منسوخ کردیا اس کارروائی سے ایک تو اس جماعت غیر مسلم کی نیت و ارادہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو اپنے زیر اثر اور مغلوب کرکے رکھنا چاہتی ہے اور یہ خطرہ یقینی ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی اور قومی معاملات میں اسلامی شریعت کے خلاف دست اندازی ہوا کرے گی جس کی مثال ساردا ایکٹ کی صورت میں پہلے سے موجود ہے۔ دوسرے اس جماعت غیر مسلم کے نقض عہد کی وجہ سے مسلمانوں کو آئندہ ان کے کسی عہد و پیمان پر اعتماد نہیں ہوسکتا۔

۹ ان تدابیر کی تجویز و تعلیم و تنفیذ کا علمبردار ایک ایسے غیر مسلم کو قرار دیا گیا ہے جس کا مطمع نظر صرف اپنی قوم کا مفاد ہے اور مسلمانوں سے اس کو کوئی ہمدردی نہیں چنانچہ اس کے مقاصد میں سے گاؤ کشی کا انسداد خود اس کے اقرار سے ثابت ہے جیسا کہ اخبارات میں مذکور ہے اور باوجود اس کے بعض مسلمان اس غیر مسلم کے ایسی مطیع و معتقد اور محب ہیں کہ جو اس کے منھ سے نکلتا ہے عمل میں بھی اس پر لبیک کہتے ہیں اور اس کے مقولہ کو قرآن و حدیث سے ثابت کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور اس کے محاسن نہایت جوش و خروش سے بیان کرتے ہیں اور کم سے کم ٹوپی ہی پہننے میں رغبت میں اس کے ساتھ تشبہ کرتے ہیں۔

۱۰ اس جماعت غیر مسلمہ کے بعض احاد اپنی قوت بڑھانے کے لئے مسلمانوں کو شرکت کی اب بھی دعوت دیتے ہیں اور بعضوں کو اپنی قوت پر ایسا ناز ہے یا کسی مصلحت سے وہ قوت کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی طرف التفات بھی نہیں کرتے مگر بعضے مسلمان گو بہت ہی قلیل ہیں ان کی طرف بڑھتے ہیں۔= پھر ان میں بعض مسلمان تو ظاہرا" و باطنا" ان کے تابع ہو کر اور بعضے برائے نام زبان سے تو اپنے استقلال کے مدعی ہو کر مگر عملا" ان کے تابع ہو کر ان کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔

یہ مجمل صورت ہے واقعات کی۔ اور تفصیل مشاہدات و مطالعہ اخبارات سے معلوم ہوسکتی ہے۔ اب ان واقعات کے متعلق سوالات حسب ذیل ہیں۔

الف ۔ آیا یہ افعال مذکورہ شرعاً" جائز ہیں یا نہیں اور جماعت مسلمین کو ایسے افعال کا ارتکاب جائز ہے یا نہیں۔ بالخصوص جماعت غیر مسلم کے تابع ہو کر پھر خصوص جبکہ اس کا اثر کفر کی تقویت اور اسلام کا ضعف ہو جیسا کہ واقعات نمبر۸، نمبر۹، نمبر۱۰ سے ظاہر ہے۔

ب ۔ اگر افعال ممنوعہ کے ساتھ کچھ افعال مباح بھی ہوں تو ان افعال مباح کے شامل ہونے سے آیا افعال ممنوعہ بھی مباح ہو جاویں گے۔ یا مباح وغیر مباح کا مجموعہ غیر مباح رہے گا۔

ج ۔ ایسی حکومت جو مرکب ہو جماعت مسلمہ و غیر مسلمہ سے کیا۔ وہ حکومت اسلامی ہوگی یا غیر اسلامی۔ خصوص جبکہ قرائن قطعیہ سے ثابت ہو کہ اس حکومت میں ہمیشہ مقصود مصالح سیاسیہ ہوں گے اور جب کبھی ان مصالح میں اور مذہب میں تصادم و تراجم ہوگا وہ مصالح ہی مقدم ہوں گے اور مذہب کو یا ترک کردیا جاوے گا یا اس میں تحریف کرکے ان مصالح پر منطبق کر دیا جاوے گا بلکہ اس حکومت میں جس قسم کے مسلمان حصہ پاسکتے ہیں خود ان کے حالات سے بھی یہی ترجیح مصالح کی مذہب پر قریب قریب یقینی ہے جس کی تازہ نظیر امان اللہ خاں کی حکومت کا رنگ ہے پھر غیر مسلم سے تو رعایت مذہب کی توقع ہے۔ پس کیا ایسی حکومت کے لئے جو کہ مسلم و کافر میں مشترک ہو پھر مسلم بھی وہ جن کی حالت ابھی مذکور ہوئی کوشش کرنا جہاد ہے جس کی شرعی غرض اعلاء کلمتہ اللہ اور تقویت دین ہے اور گواب بھی حکومت غیر اسلامیہ ہے مگر کیا ان دونوں صورتوں میں کچھ فرق ہے یا نہیں کہ اب تو حکومت غیر اسلامیہ ہمارے اختیار سے نہیں اور وہ ہمارے اختیار سے ہوگی نیز اس وقت کی حکومت غیر اسلامیہ اپنی رعایا کے مذہب کو قصداً" ضرر نہیں پہنچاتی۔ اور وہ حکومت جو برائے نام مشترکہ اور درحقیقت غیر اسلامیہ ہوگی قصداً" مذہب اسلامی کو ضرر پہنچائیگی جس کے شواہد مشاہد ہیں جو کہ روزانہ اخبارات میں بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔

د ۔ اگر کسی ایک عالم یا علماء کی کسی جماعت نے افعال مذکورہ میں شرکت یا موافقت کا فتویٰ دیدیا یا خواہ کسی غرض فاسد سے خواہ خلوص کے ساتھ اجتہادی غلطی و حقیقت نا

شناسی ہے۔ یا فتویٰ کو تو افعال مباح کے ساتھ مقید کیا مگر مسلمانوں میں نظام نہ ہونے کی وجہ سے اور علماء میں قوت نہ ہونے کی وجہ سے یقینی ہو کہ وہ ان قیود کے ہرگز مقید نہ ہوں گے اور ضرور افعال غیر مباح کے مرتکب ہوں گے بہر حال کسی صورت سے ایسا ہی فتویٰ کسی نے دیدیا مگر اسی کے ساتھ بہت سے علماء اس فتویٰ میں متفق بھی نہ ہوں تو کیا سب مسلمانوں پر اس فتویٰ پر عمل کرنا واجب ہو جاتا ہے یا جس سے جس کو اعتقاد ہو اس کے فتوے پر عمل کر سکتا ہے۔ اور کیا چند علماء کا خواہ وہ کثیر یا اکثر ہی ہوں (گو یہاں ایسا نہیں ہے) اتفاق کرلینا اجماع میں داخل ہو جاوے گا جس کی مخالفت ناجائز ہوتی ہے۔

ہ۔ جو شخص ان تدابیر کو خلاف شرع سمجھ کر اس میں شرکت نہ کرے اس پر ملامت کرنا یا طعن کرنا یا اس کو بدنام کرنا یا اس سے بڑھ کر اس کو کسی قسم کی مالی یا بدنی اذیت و مضرت پہنچانا جیسا کہ بہت مواقع پر ہوا جائز ہے۔

المستفتی

میاں محمد علوی زمیندار کیرانہ

الجواب۔ الف یہ اقوال شرعاً جائز نہیں اور مسلمانوں کو ایسے افعال کا ارتکاب جائز نہیں خصوصی جبکہ غرض بھی وہ ہو جو سوال میں مذکور ہے اس وقت تو دو قبح جمع ہو جائیں گے ایک باعتبار حقیقت کے دوسرا باعتبار غایت کے چنانچہ ایک ایک کے متعلق لکھتا ہوں۔

(۱) حق تعالیٰ فرماتے ہیں ولا تلقو بايديكم الى التهلكة اور جس حالت میں اس قانون پر عمل کرنا شرعاً جائز ہو جیسا سوال میں مذکور ہے تو بلا ضرورت ایسی قانون شکنی کا انجام ہلاکت ظاہر ہے۔

(۲) یہ مقاطعہ بعض اوقات ترک واجب تک مقتضی ہو جاتا ہے مثلاً کسی کے پاس بجز جائز نوکری یا کسی خاص تجارت کے دوسرا کوئی جائز ذریعہ معاش کا نہیں اور ادائے حقوق اہل و عیال کے لئے اس پر اکتساب واجب ہے تو اس مقاطعہ سے اس واجب کا ترک لازم آتا ہے۔ اور ترک واجب معصیت ہے اور جن مقاطعات میں اس واجب کا ترک بھی لازم نہ آتا ہو مگر حکومت سے عداوت لازم آتی ہے اور بلا ضرورت شرعیہ ضعیف کے لئے جائز نہیں کہ قوی کو اپنا دشمن بنائے کہ اس میں بھی اپنے کو مصیبت میں ڈالنا ہے جس کی ممانعت آیت مرقومہ میں گذری ہے اور یہ جب ہے کہ اسمقاطعہ

کو واجب شرعی نہ سمجھا جاوے اور اس پر دوسرے کو مجبور نہ کیا جاوے۔ ورنہ واجب شرعی سمجھنا مصداق ہے یحرفون لکم عن مواضعہ کا اور مجبور کرنا ظلم و اکراہ ہے جس کی حرمت ظاہر ہے۔

(۳) یہ واقعہ بھی متعدد گناہوں پر مشتمل ہے ایک مباح فعل کے ترک پر مجبور کرنا کیونکہ بجز بعض خاص تجارتوں کے سب اشیاء کی خرید و فروخت کا معاملہ اہل حرب تک کے ساتھ بھی جائز ہے چہ جائیکہ معاہدین کے ساتھ فی شرح السیر الکبیرج باب مایکرہ ادخالہ دارلحرب الا انہ لا باس بذلک فی الطاعم والثیاب و نحوذ لک لماروی ان ثمامۃ بن اثال الحنفی اسلم فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقصع لمیرۃ عن اھل مکۃ وکانو یمتاز ون ھھنا فکتبوا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یسالونہ ان یاذن لہ فی حمل الطعام الیھم فاذن لہ فی ذلک واھل مکۃ یومئذ کانواحر بالرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فعرفنا انہ لا باس بذلک الی قولہ الاکرام والسبی والسلاح دوسرے بعد اتمام بیع کے واپسی پر مجبور کرنا اور زیادہ گناہ ہے کیونکہ بدون قانون خیار کے یہ واپسی بھی شرعا مثل بیع کے ہے جس میں تراضی متعاقدین شرط ہے قال اللہ تعالی ولا تاکلو اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم تیسرے نہ ماننے والون کو ایذاء دینا جو کہ ظلم محض ہے چوتھے اہل و عیال کو تکلیف پہنچانا کہ یہ بھی ظلم ہے پانچویں اگر اس کو واجب شرعی بتلایا جاوے تو شریعت کی تغییرو تحریف ہونا جس کا مذموم ہونا نمبر ۳ میں گذر چکا ہے۔

(۴) اس میں بھی وہی خرابیاں ہیں جو نمبر ۳ میں مذکور ہوئیں اور اگر ان احتجاجات مذکورہ میں شرکت نہ کرنے پر ایذاء جسمانی کی بھی نوبت آجاوے تو یہ گناہ ہونے میں اضرار مالی سے بھی اشد اور منافی اقتضائے اسلام کے ہے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ والمومن من امنہ الناس علی دمائھم واموالھم (جمع الفوائد الترمذی والنسائی ولہ والبخاری وابی داؤد بدل والمؤمن الی آخرہ والمھاجر) پھر ان مقاطعات پر مجبور کرنے میں یہ جابرین خود اپنے تسلیم کردہ قانون حریت کے بھی خلاف کر رہے ہیں ورنہ کیا وجہ کہ اپنی آزادی کی تو کوشش

کریں اور دوسروں کی آزادی کو سلب کریں۔
(۵) اس واقعہ کا نصوص حرمت زنا و مقدمات زنا کے منافی ہونا ظاہر ہے خصوص اس اعلان کے ساتھ جو کہ اس آیت کے عموم میں داخل ہے ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشة فی الذین امنوا لهم عذاب الیم فی الدنیا والاخرة الایه(۶) اس کا خودکشی اور حرام ہونا ظاہر ہے قال اللّٰه تعالٰی ولا تقتلوا انفسکم و فی التھدایه کتاب لاکراہ فیاثم کما فی حالة المخمصة الی قوله فکان اباحته لا رخضنه الخ و فی العنایة فامتناعه من التناول کا متناعه عن تناول الطعام الحلال حتی تلفت نفسه و عضوه فکان آثما اس روایت سے معلوم ہوا کہ جان بچانا اس درجہ فرض ہے کہ اگر حالت اضطرار میں اندیشہ مرجانے کا ہو اور مردار کھانے سے جان بچ سکتی ہو اس کا نہ کھانا اور جان دیدینا معصیت ہے چہ جائیکہ طعام حلال کا ترک اور اس فعل کی مدح کرنے میں تو اندیشہ کفر ہے کہ صریح کذیب ہے شریعت کی کہ شریعت جس فعل کو مذموم کہتی ہو یہ اس کو محمود کہتا ہے۔
(۷) قال اللّٰه تعالٰی وقد نزل علیکم فی الکتاب ان اذاسمعتم آیات اللّٰه یکصربها ویستهزاء بها فلا تقعلوا معهمه حتی یخوضوافی حدیث غیرہ انکم اذا مثلهم اس آیت سے صاف معلوم ہوا کہ ایسے جلسوں اور جلوسوں ----- میں خلاف شریعت تقریریں ہوتی ہوں اور علی الاعلان احکام شرعیہ کی مخالفت کی جاتی ہو صریح گناہ ہے بالخصوص جبکہ ان کو مستحسن بھی سمجھا جاوے اور دوسروں کو بھی ترغیب دی جاوے۔
(۸) اس غرض کا مذموم ہونا ظاہر ہے اور ایسی غرض کو کامیاب بنانے کی کوشش کرنا صریح اعانت ہے معصیت کی یا کفر کی جس کی حرمت منصوص ہے قال اللّٰه تعالٰی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان الا یه
(۹) قال اللّٰه تعالٰی ولا تطع منهم اثما اوکفورا اوقال تعالی یا ایها الذین امنولا تتخذ وابطانة من دونکم لا یالونکم خبالا ودوا ما عنتم قد بدت البغضاء من افواههم وما تخعی صدور هم اکبر قدبینا لکم الا ایات ان کنتم تعقلون ها انتمه اولا تحبونهم ولا یحبونکم لاٰیات وقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم انامدح

الفاسق غضب الرب تعالیٰ و اھتزله العرش رواه البھقی فی شعب الایمان (مشکوۃ) وقال تعالیٰ ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکمه النار الایه وقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم من تشبه بقوم فھو منھم رواه احمد و ابوداؤد (مشکوٰۃ) ان آیات و احادیث سے اس واقعہ کے اجزاء کا قبیح و معصیت کا ہونا ظاہر ہے۔

(۱۰) فی شرح السیر الکبیر باب الاستعانة باھل الشرک واستعانة المشرکین بالمسلمین ج

اس روایت کا حاصل یہ ہے کہ کفار کے ساتھ ایسے معاملات میں شرکت کی جبکہ اور کوئی امر شرعی مانع نہ ہو) شرط یہ ہے کہ وہ ہمارے تابع ہوں اور اگر وہ ہمارے تابع نہ ہوں خواہ متبوع ہو یا دونوں قوت و عمل میں برابر ہوں تو ان کے ساتھ شرکت جائز نہیں جس کی وجہ بھی اس روایت میں مذکور ہے کہ جب انہیں بھی قوت مستقلہ ہو تو شرکت میں اندیشہ ہے کہ جب مجموعی قوت سے ان کا مقابل مغلوب ہو جاوے پھر وہ اپنی قوت سے مسلمانوں کو مغلوب کر سکتے ہیں اور اگر اس شرط کے خلاف ہوا ہے جیسے ایک غنیم کے مقابلہ میں نجاشی کی مدد حضرات صحابہؓ نے کی تو اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ نجاشی اس وقت مسلمان ہوگئے تھے یا یہ وجہ ہے کہ مسلمانوں کو حالت موجودہ میں کسی پناہ کی حاجت تھی اور نجاشی بہ نسبت اس غنیم کے مسلمانوں کے لئے زیادہ مفید تھے اس لئے اس موقع پر وہ شرط نہیں رہی یہ حاصل ہے روایت کا اب اس واقعہ کی حقیقت میں غور کرنے سے اس کا حکم اس روایت سے صاف ظاہر ہے وہ یہ کہ اگر مسلمان اس غیر مسلم طالب آزادی جماعت کے ساتھ شریک ہو جائیں تو یقیناً" وہ مسلمانوں کے تابع نہیں ہیں بلکہ یا تو متبوع ہو گے اور مسلمان ان کے تابع اور غالب یہی ہے اور یا دونوں برابر ہوں گے تو گویہ احتمال بہت ضعیف ہے لیکن اگر ایسا بھی ہو تب بھی جواز شرکت کی جو شرط تھی کہ مسلمان متبوع ہوں وہ مفقود ہے۔ اس لئے جواز بھی مفقود ہے اور جو وجہ عدم جواز شرکت کی روایت مذکورہ میں بیان کی گئی ہے کہ مسلمانوں سے کام نکال کر پھر خود مسلمانوں پر غالب آنے کی کوشش کریں یہاں اس کا خطرہ یقینی ہے یہ تفصیل تھی حرف الف کے جواب کی اب بقیہ جوابات عرض کرتا ہوں۔

ب ۔ اصولیین و فقہاء کا مسئلہ مسلمہ ہے۔ ما اجتمع الحلال و الحرام الا وقد غلب الحرام یعنی مجموعہ حلال و حرام کا حرام ہی ہوتا ہے اور یہی مسئلہ عقلی بھی ہے بلکہ اگر صاف جزو مباح ہی پر نظر کی جاوے مگر وہ ذریعہ ہو جاوے کسی مقصود غیر مباح کا سوبقاعدہ شرعیہ مقدمتہ الحرام حرام خود وہ جز و مباح بھی غیر مباح ہو جاتا ہے اس سے اس سوال کا جواب معلوم ہوگیا کہ مباح کے انضمام سے مجموعہ مباح نہ ہوگا اور بعض صورتوں میں خود وہ مباح بھی مباح نہ رہے گا۔

ج ۔ اسی اصل مذکور حرف بہ کے مقتضاء سے ایسی حکومت بھی غیر اسلامی ہوگی خصوص جبکہ اس میں وہ خطرات ہوں جو اس سوال میں لکھے گئے ہیں پھر اس کے لئے کوشش کرنا جہاد کیونکر ہوسکتا ہے اس کو اعلاء کلمتہ اللہ و تقویت دین کون کہہ سکتا ہے۔ فی جمع الفوائد سئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الرجل یقاتل شجاعته ویقاتل حمیته (للقوم اوالوطن مثلاً") ویقاتل ریاء ای ذلک فی سبیل الله فقال من قاتل لتکون کلمة الله هی العلیا فهو فی سبیل الله للستة الامالکا اور جن دونوں قسم کی حکومتوں میں سوال میں نہایت وضوح و تفصیل سے دو فرق و کھلا کر حکم کا فرق پوچھا گیا ہے فرق ظاہر ہے اور نمبر ۱۰ کے جواب میں روایت سے جو قصہ نجاشی کا لکھا گیا ہے وہ ایسی ہی فرق پر مبنی ہے اور ایسی ہی وصف فارق پر حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ نے اپنے ایک فتویٰ کو مبنی فرمایا ہے جو ذیل میں منقول ہے وہی اخذہ چونکہ قدیم سے مذہب اور قانون جملہ مسیحی لوگوں کا یہ ہے کہ کسی کی ملت اور مذہب سے پرخاش اور مخالفت نہیں کرتے اور نہ کسی مذہبی آزادی میں دست اندازی کرتے ہیں اور اپنی رعایا کو ہر طرح سے امن و حفاظت میں رکھتے ہیں لہٰذا مسلمانوں کو یہاں ہندوستان میں جو کہ مملوکہ و مقبوضہ اہل مسیحی ہے رہنا اور ان کا رعیت بننا درست ہے چنانچہ جب مشرکین مکہ معظمہ نے مسلمانوں کو تکلیفیں اور اذیتیں پہنچائیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملک حبشہ میں جو مقبوضہ نصاریٰ تھا بھیج دیا اور یہ صرف اس وجہ سے ہوا کہ وہ کسی کے مذہب میں دست اندازی نہ کرتے تھے۔ (از حصہ روائداد جلسہ ۵۲ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور منعقدہ ۲۵۵ مارچ ۷۱ء) و. تقیید الفتوىٰ با لمذہب والرعیته اخرج اضرار بعضهم من لیس علی ملتتهم فی البلاد الشامعته فماهومن اهل الحکومته لیس فی الملة وما هو فی

المنۃ لیس من اھل حکومتہ اور اسی فرق کی تائید یک دوسرے مسئلہ سے بھی ہوتی ہے جو کہ عقلی بھی ہے اور شرعی بھی وہ یہ کہ یہاں دونوں شقوں میں مفسدہ ہو مگر ایک میں اشد ایک میں اخاف اشد سے بچنے کے لئے یا اس کو دفع کرنے کے لئے اخاف کو گوارا کرلیا جاتا ہے کما قالوا من ابتلی بلیتین فلیختره اھون لھما وقال لنووی فی شرح مسلم فی حدیث بریرۃ مانصہ والثانیۃ والعشرون احتمام اخف المفسدین لدفع بعضھا و احتمال مفسدۃ یسیرۃ لتحصیل مصلحۃ عظمیۃ علی مابیناہ فی تاویل شرط الولاء لھم

د۔ ایسا قوی سب پر حجت نہیں ہر شخص کو جائز ہے کہ جس عالم سے عقیدت ہو اس کے فتوے پر عمل کرے بلکہ حالات مذکورہ سوالات پر نظر کرکے تو جواز شرکت کا فتوی دینے والوں کے قول میں اگر تاویل ہی کر دیجاوے غنیمت ہے مثلاً" یہ کہ ان کی نیت نیک ہوگی اور ان مقام پر نظر نہ ہوگی اور اس کو اجماع تو کسی طرح کہہ ہی نہیں سکتے فی نور الا نوار واھل الا جماع من کان فجتھد اصلاحا الخ والشرط اجتماع الکل بخلاف الواحد مانع کخلاف لا کثراھ وانظر لی بعض اقوال بعض المجتھدین خالفوا فیھا الحمیم الغفیر من العلماء ولم یطعن فیھم بمخالفتہ الا جماع و مبناہ مانفیتہ خلاف الواحد

ہ۔ اول تو اگر جانبین میں صواب و خطا کا برابر بھی احتمال ہوتا تب بھی مسائل اجتہادیہ میں کسی ایک شق کو صواب سمجھنا اور دوسری شق کے اختیار کرنے پر ملامت کرنا مصداق ہے ومن یتعد حدود اللہ فقد ظلم نفسہ کا اور یہاں تو جواب مذکورہ پر نظر کرکے جانب منع راجح ہے پھر تو شریک نہ ہونے والے پر کسی قسم کی بدگمانی یا بدزبانی کرنے کا بدرجہ اولی کسی کو حق نہیں واللہ تعالٰی اعلم و علمہ اتم واحکم

کتبہ اشرف علی عاشر صفر ۱۳۲۹ھ

(نوٹ نمبرا) اس کے قبل دوبار مجھ سے ایک ایسی عبارت کے متعلق سوال کیا گیا جو میری طرف منسوب کرکے بدوں میرے علم کے شائع کی گئی تھی اول بار اس عبارت میں حوالہ بھی نہ تھا دوسری بار میں حوالہ تھا اب تیسری بار میں مستقل سوالات پیش

کئے گئے چونکہ واقعات و حالات کے تبدل سے ہمیشہ جواب بدل جاتا ہے جس کا احتمال آئندہ بھی ہے اس لئے تینوں بار میں مختلف عنوان سے جواب دیا گیا گو معنون میں تعارض نہیں پس جوابوں کے تخالف حقیقی کا شبہ نہ کیا جاوے اگر کچھ تخالف صوری ہے تو وہ سوالات کا ہے۔

(نوٹ نمبر ۲) یہ تحریر بالا تو خاص سوالات کا جواب تھا جو واقعات کے تابع ہیں چونکہ میرے پاس کوئی موثوق بہ ذریعہ تحقیق واقعات کا نہیں اس لئے احتیاطاً" میں نے اپنے لئے طریق عمل وہ تجویز کیا ہے جو ایک خادم دین جماعت نے ایک دینی درسگاہ کے لئے تجویز کیا ہے وھو ھذا ابتصرف یسیر علماء امت ونیز لیڈران قوم باہم مختلف الرائے ہیں ہر ایک جماعت اپنے علم و تحقیق یا اغراض کے مطابق واقعات کو ملک کے سامنے پیش کر رہی ہے اور حالات بسرعت واقعات کے ساتھ تبدیل ہو رہے ہیں اس صورت میں کسی ایک واقعہ خاص کو پیش نظر رکھکر رائے قائم کرنا شرعی نقطہ نظر سے دشوار ہے اس لئے سیاسی مسائل میں جب تک کسی قطعی فیصلہ کی شرعی ضرورت داعی نہ ہو سکوت ہی مصلحت سمجھا گیا ہے پس اس درسگاہ کا جماعتی مسلک مختصر الفاظ میں ہمیشہ یہ رہا اور ہے کہ اس نے نہ اعلان حق میں کبھی دریغ کیا اور نہ عمل میں کبھی نمائش اور ہنگامہ آرائی کو دخل دیا اس کی جماعت جس طرح شورش پسند نہیں ہے اسی طرح کسی اثر سے متاثر ہو کر کتمان حق کرنے والی بھی نہیں ہے یہ اس کا قدیم جماعتی مسلک ہے جس پر کسی انفرادی یا شخصی عمل کی ذمہ داری نہ کبھی پہلے عاید ہوئی ہے نہ اب ہو سکتی ہے ۴ ذی الحجہ ۴۸ھ و ۱۴ محرم ۲۵ھ

(نوٹ نمبر ۳) چونکہ اس مضمون کی ایک معتدبہ مقدار ہوگئی اس لئے حسب معمول مناسبت مضمون کے اس کا ایک لقب بھی تجویز کردیا۔ معاملته المسلمین فی مجادلته غیر المسلمین اشرف علی عفی عنہ

تنظیم المسلمین

سوال متعلق کانگریس و مسلم لیگ

سوال (٦١٦) سیدی و مولائی دام مجد کم' السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ آج کل ہندوستان میں دو سیاسی جماعتیں ہیں۔ ایک کانگریس اور دوسری مسلم لیگ۔ کانگریس کا یہ دعویٰ کہ وہ ملک کی واحد نمائندہ جماعت ہے' اور ہر شخص کو بلا تفریق مذہب و ملت اس جماعت کا ممبر ہونا چاہئے' اور اس جماعت کے ہوتے ہوئے کسی دوسری سیاسی جماعت میں شریک نہیں ہونا چاہئے اور سب یک جا ہو کر ملک کو آزاد کرائیں' مسلم لیگ خالص مسلمانوں کی جماعت ہے' اور اس کا نصب العین بھی ملک کو آزاد کرانا ہے' مگر اس کا یہ دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کے کچھ خاص ایسے حقوق ہیں کہ جن کے تحفظ کے لئے اس جماعت کا علیحدہ نظام و قیام ضرور ہے اور واقعہ یہ ہے کہ دونوں جماعتیں سیاسی ترقی میں تو ایک دوسرے کی شرکت کا کام کرسکتی ہیں مگر کانگریس میں مدغم ہو کر وہ خاص حقوق محفوظ نہیں رہ سکتے' کانگریس کا شروع سے مسلمانوں کے ساتھ کیا رویہ رہا' اس کے متعلق تو مفصل بحث کتاب موسومہ آزادی کی مؤلفہ عبدالوحید خاں صاحب میں درج ہے جو غالباً" حضرت والا کی نظر سے بھی گذری ہے' بعد کے بھی کچھ واقعات یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ کانگریس میں چونکہ ہنود کی کثرت ہے' وہ رام راج قائم کرنا چاہتے ہیں' اور کانگریس کی اصل غرض یہ ہے کہ ہندوستان کا محافظ انگریز رہے' اور زیر سایہ برطانیہ دفتری حکومت ہندو کے ہاتھ میں آجاوے اور ان کو یہ خوف ہے کہ ایشیا کی اسلامی سلطنت حملہ آور ہو کر اسلامی حکومت قائم کرلی گئی' اس کے متعلق مسلمان کتنا ہی اطمینان دلادیں' مگر ان کا یہ خوف دور نہیں ہوسکتا' چنانچہ ہندی زبان و لباس کے رواج دینے میں بے حد کوشاں ہیں اور اپنا ہی اقتدار حاصل کرنے کی فکر میں ہیں' ملک میں اس وقت آئینی لڑائی ہے' جس میں جملہ معاملات کثرت رائے پر طے ہوتے ہیں اور اس وقت کانگریس کی مرکزی جماعت و مجلس انتظامیہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت ہی قلیل ہے' ان کانگریسی مسلمانوں کی یہ کیفیت ہے کہ مسلمانوں کے خاص

حقوق کے تحفظ کے سوال کو فرقہ پرستی سمجھتی ہیں اور مسلمانوں کے احتجاج پر یہ حجت پیش کرتے ہیں کہ اگر مسلمان کثرت کے ساتھ کانگریس میں شریک ہو جاویں تو ہنود کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا کرسکتے ہیں' اور دوسری چیز جو پیش کرتے ہیں وہ مخلوط انتخاب ہے' ان کی یہ حجت ہے کہ جب تک جداگانہ انتخاب ہے ایک مذہب والا دوسرے مذہب والے سے بے نیاز ہے' جس میں اتحاد کی امید نہیں' اگر انتخاب مخلوط ہو جاوے تو ہندو مسلمان ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرنے پر مجبور ہوں گے' لیکن اس کی تردید میں چند واقعات ہیں ہندو مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ایسا ہے کہ مسلمان تو مجبور ہوسکتا ہے مگر ہندو کو ضرورت نہیں ہے چنانچہ دو چار جگہ ڈسٹرکٹ بورڈ و میونسپلٹی کے انتخابات مخلوط ہوئے' اور مسلمان اور نشستوں سے کہ جن پر پہلے سے منتخب ہوتے تھے محروم ہوئے بعض جگہ تو اس خیال سے کہ کہیں مسلمان نہ ہو جاوے سرکاری آدمی کو منتخب کیا' علاوہ ازیں خود کانگریس میں مسلمان انتخاب میں نہیں آسکے' اور سب اس وجہ کہ ہندو کی کثرت ہے' اور مخلوط انتخاب میں مسلمانوں کا صحیح نمائند کبھی منتخب نہیں ہوسکتا' اور بکثرت کی بنا پر ایسے قوانین بھی پاس ہوسکتے ہیں جو مسلمانوں کے حقوق کے منافی ہوں مگر موجودہ شکل میں گورنر و گورنر جنرل کو ایسا قانون مسترد کرنے کا حق ہے۔

مسلم لیگ کی قیادت اس وقت مسٹر محمد علی جناح آبائی شیعی ہیں مگر غیر متعصب ہیں اور گو کوئی متقی نہیں لیکن سیاست میں بہترین شخص سمجھے جاتے ہیں' اس کے کانگریس والے بھی معترف ہیں' اور یہ بھی مانتے ہیں کہ وہ سرکاری آدمی نہیں ہیں' ملک اور قوم کی آزادی کے لئے ان کے دل میں درد ہے۔ اسی لئے گورنمنٹ کے مقابلہ میں بھی کانگریس میں بھی انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کے لئے آواز بلند کی' مسٹر محمد علی جناح موصوف کے خلاف یہ بھی غلط پروپگنڈہ ہے کہ وہ جاہ پسندی کے لئے یہ سب کام کر رہے ہیں' اگر وہ جاہ پسند ہوتے تو کبھی کسی خطاب یا کسی عہدہ کی اپنے لئے کوشش کرتے جس کا ملنا بہت سہل تھا' مگر انہوں نے کبھی بھی اس کی کوشش نہیں کی' بہرحال کلمہ گو ہیں' برعکس اس کے جو مسلمان کانگریسی یہ حجت پیش کرتے ہیں کہ وہ شیعی ہیں تو کانگریس کا صدر تو غیر مسلم ہے' نیز صدارت مسٹر محمد علی جناح کی ملک نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس بات پر آمادہ ہیں کہ عامتہ المسلمین اپنا دوسرا صدر منتخب کرلیں' اہم سوال اس وقت علماء کی رائے کا ہے' بعض حضرات کانگریس کی شرکت کو ترجیح

دیتے ہیں اور دوسرے حضرات مسلم لیگ میں شریک ہونے پر زور دیتے ہیں اور جو حضرات کانگریس کو ترجیح دیتے ہیں بجز ایک دو صاحب کے وہ سب بھی اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمانوں کے نظام کی ضرورت یقینی ہے' مگر کچھ شرائط کے ماتحت کانگریس میں شریک ہونا چاہئے' مسٹر محمد علی موصوف بھی کانگریس سے تصفیہ کرنے پر آمادہ ہین' ان کی صرف اس قدر خواہش ہے کہ مسلمان اپنی جگہ پر منظم رہیں۔ اور حکومت و آزادی کے لئے کانگریس کے دوش بدوش کام کریں' اور یہ اس وجہ سے کہ اگر حسب سابق آئندہ کانگریس کی کثیر جماعت مسلمانوں سے بد عہدی کرے تو مسلمانوں کو اس وقت دوبارہ تنظیم کی ضرورت نہ پیش آوے' حضرات علماء کی اس اختلاف رائے کی وجہ سے عوام کو رائے قائم کرنا مشکل ہے' اس لئے دریافت طلب ہے کہ حضرت اقدس کے نزدیک دونوں مذکورہ بالا جماعتوں میں سے مسلمانوں کو کس جماعت میں شرکت اختیار کرنا چاہئے۔

یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ مسلم لیگ میں گو مذہبی حالت کے اعتبار سے کچھ کمی ہے' مگر اصلاح کی بہت قریب توقع ہے اور یہ اصلاح عوام کے ہاتھ میں ہے' اور عوام کی اصلاح حضرات علماء کی جدوجہد پر منحصر ہے' تو اس ترتیب سے مسلم لیگ کی اصلاح گویا علماء کے ہاتھ میں ہے'

خادم منفعت علی ممبر مسلم لیگ سہارنپور' معروضہ ۵ر فروری ۱۹۳۸ء

الجواب ۔ مکرمی' السلام و رحمتہ اللہ' چونکہ اس کے متعلق دوسرے مقامات سے بھی سوالات آتے ہیں' اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ یہ جواب بعنوان کلی لکھدیا جاوے تاکہ دوسرے جزئی سوالات پر بھی منطبق ہوسکے' اور تمام سوالات کا جامع جواب ہو جاوے' اور اسی لئے اس جواب کا ایک مستقل و مناسب لقب بھی تجویز کر دیا گیا' اب وہ جواب عرض کرتا ہوں۔

الجواب و منہ الصدق الصواب و لقبتہ تنظیم المسلمین

قال اللہ تعالٰی واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا۔ الایتہ

بعد الحمد و الصلوۃ' احقر اشرف علی مدعا نگار ہے کہ سب کو معلوم ہے کہ آج کل ہندوستان میں مفاد ملکی کے نام سے ایسی سیاسی جماعتیں جو تنظیم و تعمیم کی جامع ہوں' ایک کانگریس دوسری مسلم لیگ اور دونوں اپنی اپنی طرف شرکت کی دعوت دیتی

ہیں، اور نافعیت میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے میں اہل الرائے اختلاف رکھتے ہیں، اور اسی کی تحقیق کے لئے مدت سے مترددین کی طرف سے شرکت کے متعلق مختلف عنوانات سے سوالات کا سلسلہ جاری ہے، اب تک چونکہ دونوں کے واقعات کا کافی علم نہ تھا، اس لئے جواب کی بناء زیادہ تر سائلین کے بیان پر ہوتی تھی، اور احیاناً" جواب کے کچھ حصہ میں ثقات کی روایات کا بھی کچھ دخل ہوتا تھا اور بعض اوقات بغرض مزید تحقیق خود سائل سے بھی واقعات کی تنقیح کی جاتی تھی اور ان بناؤں کے اختلاف سے مختتم جواب نہ ہوسکتا تھا جس سے ممکن ہے کہ سائل کو شفائے تام نہ ہوتی ہو، اور اس صورت میں یقیناً" ایسے جوابوں سے طریق عمل کا اخذ کرنا۔ جو سوال سے اصل مقصود تھا، دشواری سے خالی نہ تھا، اس لئے سخت ضرورت تھی کہ واقعات کی مزید تعین و تبیین کی جاوے جس کے لئے مختلف ذرائع اختیار کئے گئے، جس میں خاص اہتمام کے بعد بحمد للہ تعالیٰ اتنی ضروری کامیابی ہوگی جس سے انشاء اللہ تعالیٰ شافی جواب پیش کرنا ممکن ہوگیا، اور آج آپ کا خط اس جواب کے پیش کرنے کا محرک ہوگیا۔ یہ چند سطریں اسی جواب کی حکایت ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اس میں تو کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ فضاء حاضر میں مسلمانوں کو شدید استحکام کے ساتھ منظم ہونے کی سخت ضرورت ہے، اور ان کے تمام منافع و مصالح کی حفاظت اور تمام مضارہ مفاسدے صیانت اسی تنظیم پر موقوف ہے، مگر اس کے ساتھ ہی ہر مسلمان پر یہ بھی واجب التسلیم والعمل ہے کہ وہ تنظیم حسب قدرت بالکل احکام شریعہ کی موافق ہو (جو آیت پیشانی میں اعتصام بحبل کی لاتفرقوا پر تقدیم سے بھی ظاہر ہے) سو اگر اس وقت ملک میں اس صفت کی کوئی منظم جماعت موجود ہوتو یا اس کا ہونا متوقع قریب ہوتا تو جواب واضح تھا لیکن موجودہ حالت میں افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ ایسی جماعت کا نہ تحقیق ہے نہ قریب توقع اس لئے بجز اس کے چارہ کار نہیں کہ موجودہ جماعتوں میں سے کسی جماعت میں داخل ہوں اور اس میں قواعد شریعہ کی رو سے جو نقص ہو اس کی اصلاح کریں، اور اگر ان میں ایک کی اصلاح آسان اور دوسری کی دشواری ہو تو بقاعدہ عقلیہ و نقلیہ من ابتلی بلتیین فلیخترا ھو نھما (جس کی ماخذ کثیرہ میں سے ایک ماخذ حدیث بریرہ میں یہ ارشاد نبوی ہے اعتقیھا و اشترھی لھم الولاء علی ماقررہ النووی فی شرحہ لصحیح مسلمہ) اس میں داخل ہو جائیں

جس کی اصلاح آسان ہو' سو اس کے متعلق جہاں تک تفحص بلیغ کے ساتھ تحقیق کیا گیا' مذکورہ و مسئولہ دونوں جماعتوں میں ان کی موجودہ حالت پر نظر کرکے مسلم لیگ کے نقائص کا رفع کرنا سہل ہے' اور کانگریس کی اصلاح شعبہ بلکہ متعذر ہے جس کے وجوہ کا خلاصہ وہی ہے جو آپ نے لکھا ہے کہ مسلم لیگ خالص کلمہ گویوں کی جماعت ہے اور کانگریس میں عنصر غالب غیر مسلمین کا ہے اور جو شخص اسلام کو حق جانتا ہو اس کو شریعت کے قریب لانا بہ نسبت اس شخص کے جو اسلام کو حق نہیں جانتا ظاہر ہے کہ سہل ہے' نیز مسلم لیگ کے اعلانات جیسے لیگ کا مینو فسٹو وغیرہ اور کانگریس کے معاملات اس کے شاہد ہیں' رسالہ آزادی کی جنگ کو جس کا آپ نے سوال میں حوالہ دیا ہے میں نے بھی دیکھا ہے' واقعی اس میں ان معاملات کی تفصیل اچھی طرح کی گئی ہے' منصف مزاج کے لئے اس کا مطالعہ میرے خیال میں کافی ہے' پس اس اصل کی بناء پر شرح صدر کے ساتھ میری یہ رائے قائم ہوئی ہے کہ مسلمانوں کو اطمینان و توکل کی ساتھ مسلم لیگ میں داخل ہو جانا چاہئے' پھر ان میں جو اہل قوت و اہل اثر ہیں ان کو اپنی قوت و اثر سے اس کی اصلاح کی کوشش کرنا چاہئے' اور جو اہل قوت نہیں وہ اہل قوت کو وقتاً" فوقتاً" یاددہانی کے تقاضے کے ساتھ ان سے اصلاح مطلوب کی درخواست کرتے رہیں' اور اصلاح کے طریقوں میں علماء محققین سے مدد لیتے رہیں' جو علماء اس میں شریک ہوں ان سے تو علمی و عملی دونوں قسم کی امداد حاصل کریں اور جو اس میں کسی مصلحت یا عذر سے باضابطہ شریک نہ ہوں ان سے صرف علمی مدد لیں یعنی ان سے واقعات سے ظاہر کرکے احکام شریعہ معلوم کرتے رہیں' اور ان کے موافق مسلم لیگ کی حالت کو درست کرتے رہیں اور مسلم لیگ میں جو معاملات پیش آویں ان کے متعلق اگر علماء میں اختلاف ہو تو جو علماء کسی جماعت میں باضابطہ شریک نہ ہوں ان سے استفتاء کیا جائے اور ان میں بھی اگر اختلاف ہو تو شرعاً" دونوں شقوں میں گنجائش سمجھی جاوے اور دونوں شقوں یں اسے مدبروں کے نزدیک جو مصلحت ہو اس پر عمل کیا جاوے اور جو علماء باضابطہ کسی جماعت میں شریک نہ ہوں وہ بیکار نہ رہیں بلکہ وہ اس سے اہم خدمت میں مشغول رہیں اور وہ خدمت بندگان خدا کو احکام شرعیہ کی تعلیم و ترغیب دینے کی ہے جو مشترک طریقہ ہے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کا' بلکہ پہلی قسم کے علماء کو بھی جتنا وقت مسلم لیگ کی خدمت سے بچے اس اشاعت احکام میں حصہ لینا ضروری ہے پس اس تفصیل سے بقاعدہ تقسیم عمل (جو آیت وما کان

المومنون لینفروا کافۃ فلولا نفرمن کل فرقۃ منھمطائفۃ لیتفقھوا فی الدین سے بھی ماخوذ ہے) سب کو اپنے کام میں مشغول ہو جانا چاہیے' پھراس کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ وعدہ الہیہ ان اللہ لا یضیع اجرا لمحسنین (سورہ ہود) وانا لانضیع اجرا المصلحین (سورہ اعراف) کا ظہور ہوگا۔ اور اس کی بھی ضرورت ہے کہ بہیئت مذکور اس تنظیم کو ہمیشہ ہمیشہ مستقلا" جاری و باقی لکھیں کیونکہ اس کے ثمرہ کی تو ہمیشہ ہی حاجت ہے' یہ تو خلاصہ ہے ہمارے انتظام کا باقی دوسروں کے ساتھ معاملہ سو اس انتظام کے بعد اگر کانگریس مسلم لیگ سے صلح کی طرف مائل ہو تو حسب ارشاد و ان جنحوا السلمہ فاجنح الھا اس سے اصول شریعہ کے موافق تیقظ و تدبر کے ساتھ اہل تجربہ و اہل علم و اہل فہم کے مشورہ سے صلح رکھیں' مگر اپنی تنظیم مذکور کو اس وقت بھی قوت و استقلال کے ساتھ قائم رکھیں اس کو کمزور نہ کریں اور نہ کانگریس میں مدغم کریں کہ یہ شرع اور تجربہ دونوں کے اعتبار سے نہایت مضر ہے اور بالفرض اگر مسلم لیگ کی اصلاح کے قبل یا بعد اور کوئی جماعت مسلمہ منتظمہ صاحب قوت صاحب اثر تیار ہو جاوے اس صورت میں مسلم لیگ اور وہ جماعت دونوں اتحاد و اشتراک کے ساتھ کام کریں' تاکہ مسلمانوں میں افتراق و تشتت نہ ہو' اور ان سب حالات میں قولا" و فعلا" و حالا" و تقریر"ا و تحریر"ا موافق و مخالف ہر ایک کے ساتھ اخلاق اسلامی کو اپنا شعار رکھیں' جیسا ارشاد ہے وقل لعبادی یقولوا التی ھی احسن و غیر ھا من الایات (اور آپ میرے بندوں سے کہہ دیجئے کہ ایسی بات کہا کریں جو بہتر ہو)

خلاصہ دستور العمل یہ ہے کہ از خود نہ کسی سے آویزش کی ضرورت نہ آمیزش کی ضرورت' رضائے حق کو مطمع نظر رکھ کر اپنے کام میں لگے رہیں' اور اس رضا کی شرط یہ ہے کہ ہر کام میں اس، کا پورا لحاظ رکھیں کہ کوئی امر خلاف شرع نہ ہونے پاوے یہی عبدیت کی روح اور حیات مسلم کی اصل الاصول ہے' اور اس استقلال و استقامت کے ساتھ ہی دعاء و ابتہال کو اصل وظیفہ و تدبیر سمجھیں' اور پھر نصرت حق کے منتظر رہیں' اب اس تحریر کو بزرگوں کی ایک نافع وصیت اور دو جامع دعاؤں پر ختم کرتا ہوں' یہ دعائیں بھی ورد رکھنے کے قابل ہیں خصوص بعد نماز

وصیت

کار کن کار بگذر از گفتار
(کام کرو باتیں مت بناؤ)

کاندریں راہ کار باید کار
(اس راہ سلوک میں کام ہی کام ہے)

دعائے اول : اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه و الباطل با طلا وارزقنا اجتنابه
(اے اللہ ہمیں راہ حق دکھا اور اسکی پیروی کی توفیق عطا فرما اور ہمیں باطل سے بچنے کی توفیق عطا فرما)

دعائے ثانی :۔ اللھم انصر من نصر دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم و اجعلنا منھم و اخذل من خذل دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم ولا تجعلنا منھم
(اے اللہ مدد کر اس شخص کی جس نے دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کی اور ہمیں ان سے بنا اور اسے ذلیل کر جس نے دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسوا کرنے کی کوشش کی اور ہمیں ان میں سے نہ بنا)

نوٹ نمبرا : اس جواب میں میں نے اپنے مزید اطمینان کے واسطے احتیاطاً" اپنی جماعت کے متعدد و محقق علماء سے بھی مشورہ کر لیا ہے' ان سب نے بھی اس سے اپنی موافقت کا اظہار فرمایا۔

نوٹ نمبر۲ : یہ جواب مسلم لیگ کی موجودہ حالت پر ہے' اگر خدانخواستہ حالات بدل جائیں تو حکم بھی بدل جائیگا

نوٹ نمبر۳ : جو صاحب اس مضمون کو شائع کرنا چاہیں وہ اس کا خلاصہ شائع کردہ مضمون میں کچھ کمی بیشی کا شبہ ہو تو تھانہ بھون کے ماہوار رسالہ النور بابت ماہ ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ سے مقابلہ کرلیں کہ اس رسالہ میں میرا یہ مضمون بعینہ پورا چھپا ہے' والسلام خیر ختام مقام تھانہ بھون

۱۹ر ذی الحجہ ۵۶ھ مطابق ۱۰ فروری ۳۸ء النور ص ۱۳ ز۔ یقعدہ ۵۶ھ)

تعلیم المسلمین

بعد الحمد و الصلوۃ احقر اشرف علی عفی عنہ مدعا نگار ہے کہ اس کے قبل متصل احقر کے ایک مضمون ملقب بہ تنظیم المسلمین متضمن احکام تنظیم المسلمین کے شائع ہو چکا ہے اس کے اخیر میں خصوصیات کے ساتھ اہل علم کو یہ بھی مشورہ دیا گیا ہے کہ بندگان خدا کو احکام دین کی تعلیم کرنے کا التزام و انتظام جاری رکھیں۔ مگر وہاں یہ مضمون اجمالاً" و ضمناً" و تبعاً" تھا اب اسی کو تفصیلاً" و مقصوداً" و مستقلاً" عرض کیا جاتا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ نصوص کثیرہ میں اپنی اصلاح کے ساتھ دوسروں کی اصلاح کی تاکید بھی جا بجا وارد ہے اور سورۃ العصر تو بلاشرکت کسی اور مضمون کے خاص اسی موضوع کے لئے نازل ہوئی ہے چنانچہ اسمیں جہاں امنوا کو جس کا مفہوم تصحیح عقائد ہے اور عملوا الصالحت کو جس کا مفہوم اصلاح اعمال ہے شرط نجات فرمایا ہے جو حاصل ہے خسران سے استثناء کا وہاں ہی اس کے ساتھ تو اصوبالحق میں دوسروں کی تعلیم عقائد کو اور تو اصوابالصبر میں دوسروں کی تعلیم اعمال کو بواسطہ عطف کے شرط نجات فرمایا ہے اور بے شمار نصوص قرآنیہ و حدیث میں یہی مضمون بعنوان امربالمعروف و نہی المنکر و وعظ و تذکیر نہایت تاکید و اہتمام کے ساتھ مذکور ہے اور بہت سے نصوص میں خاص حالات میں اس میں سستی یا ترک پر شدید وعیدیں بھی وارد ہیں اور حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوۃ و السلام کا اصل فریضہ یہی رہا ہے باقی جتنے شعبے دین کے ہیں مثلاص افتاء و درس و تصنیف و مناظرہ سب اسی کے آلات و مقدمات ہیں اور خود تنظیم بھی جس کی ضرورت عام طور سے مسلم ہے وہ بھی اسی کا تابع اور مقدمہ ہے' اور یہ متبوع و مقصود ہے چنانچہ آیت الذین ان مکنا ہم فی الارض میں جہاں تمکین کے مقاصد ذکر فرمائے ہیں ان ہی میں امربالمعروف و نہی عن المنکر کو بھی جزو مقصود فرمایا گیا ہے تو اس بناء پر سب مسلمانوں کو اس طرف توجہ فرمانا از بس ضروری ہوا۔ سخت تعجب ہے کہ ادنی امراض جسمانیہ ہی جس کا انجام محض معمولی کلفت ہے علاج تو ضروری سمجھا جاتا ہے اور جہل عن الاحکام الشرعیہ کا جو اشد مرض نفسانی و روحانی ہے

اور جو اساس ہے بد عملی کی اور بواسطہ بد عملی کے مسلمانوں کے لئے سبب ہے تمام مضار دنیا و آخرت کا۔ چنانچہ اخلال و فی الطاعات و ارتکاب معاصی کا تمام آفات و مصائب دنیا و آخرت کے لئے سبب ہونا قرآن و حدیث میں مصرح ہے اور خادمان ملت نے اس باب میں مستقل تالیفات بھی لکھی ہیں۔ چنانچہ ایک مختصر رسالہ جزاء الاعمال بطور نمونہ کے اس احقر کا لکھا ہوا بھی شائع ہو چکا ہے اور حیوۃ المسلمین کے خطبہ میں بھی ایک دل نشین عنوان سے اس کی تقریر کی گئی ہے اس سے اس قدر بے فکری ہے تو اس کے بعد امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ضروری ہونے میں کیا شبہ رہا اور اس کے ذرائع میں سب سے زیادہ سہل اور نفع کے اعتبار سے تام اور عام ذریعہ وعظ ہے تو ان سب مقدمات پر نظر کرکے واعظین مخلصین کے ذریعہ سے تمام مکلفین بالخصوص مسلمانوں کو احکام سے مطلع کرنے کی ضرورت بداہتہ" ثابت ہوگئی۔ یہ ذیل کی چند سطریں اسی کے انتظام کی ترغیب و تحریک کے لئے عرض کی جاتی ہیں اور ظاہر ہے کہ کوئی انتظام بطور استقلال عادتا" خصوص آج کل کی فضاء میں بدون آئینی ہیئت کے مکمل نہیں ہوتا۔ پس اس ہیئت کے متعلق خود سوچنے سے نیز ایک جماعت علماء صلحاء کے مشورہ سے اس کا جو نظام ذہن میں آیا ہے اس کو قلم بند کرکے شائع کرتا ہوں۔ جمہور اہل اسلام عموما" اور علماء کرام ورؤسا عظام و مہمان مدارس و انجمن ہائے اسلامیہ خصوصا" اس نظام کو جاری فرمائیں یا اگر اس سے اچھا کوئی نظام کسی کے ذہن میں ہو اس کا اجراء فرمائیں بہرحال کام مقصود ہے۔ خاص کوئی صورت نظام مقصود نہیں۔ اب میں یہاں تجویز کردہ نظام پیش کرتا ہوں جو مرکب ہے چند اجزاء سے اور وہ یہ ہے۔

جزو اول :۔ ہر مدرسہ اسلامیہ کم از کم ایک واعظ مقرر کرے اور یہ سمجھے کہ ضرورت تعلیم کے لئے ایک مدرس کا اضافہ کیا گیا کیوں کہ جس طرح مدرسہ کے معلمین طلبہ کے مدرس ہیں یہ واعظین عوام کے اسی طرح اہل انجمن یہ سمجھیں کہ تعلیم عوام کے لئے یہ ایک مکتب ہے جو شاخ ہے انجمن کی۔

جزو ثانی :۔ جہاں ایسا مدرسہ یا انجمن نہ ہو یا وہ حضرات کسی وجہ سے ایسا انتظام نہ کریں وہاں کہ رؤساء انفرادا" یا اشتراکا" اپنے پاس سے تنخواہ دے کر ایسا واعظ مقرر کر دیں مگر اس واعظ کا انتخاب محققین علماء کی رائے سے کریں خود منتخب نہ کریں لیکن

تنخواہ کا تعلق اپنے سے رکھیں۔

جزو ثالث :۔ جہاں ایسا کوئی باہمت رئیس نہ ہو وہاں عام اہل بستی ایسے واعظ کا انتظام کرلیں اور باہمی چندہ کر کے اس کو تنخواہ دیں اور مثل جزو ثانی کا تعلق اپنے سے رکھیں مگر چندہ میں کسی کے اوپر جبر نہ کریں۔

جزو رابع :۔ یہ واعظ خواہ تبحر عالم نہ ہو مگر دینیات پر اس کی کافی نظر ہو کہ اپنی تقریر میں یا کسی کے سوال کے جواب میں غلط روایت یا غلط مسئلہ بیان نہ کرے۔

جزو خامس :۔ بلا ضرورت مسائل اختلافیہ بیان نہ کرے اور جہاں ضرورت ہو یا کوئی اس کے متعلق سوال کر بیٹھے تو تقریر میں یا جواب میں اس کا لحاظ رکھے کہ عنوان متین اور نرم اور مخاطب کے قریب الفہم ہو یا موحش نہ ہو۔ اگر سائل خاص شخص کا نام لے کر جواب کا معاوضہ کرے تو اس شخص کی نسبت کوئی کلمہ ثقیل نہ کہے متانت کے ساتھ شبہ کا حل کر دیا جائے خواہ کوئی مانے یا نہ مانے۔

جزو سادس :۔ اگر خرچ میں گنجائش ہو تو واعظ کو ایک خادم بھی دیا جائے وہ کھانا وغیرہ بھی پکا سکے اور جہاں سواری نہ ملے وہاں سامان و بستر وغیرہ اٹھا کر لے جاوے۔

جزو سابع :۔ عام طور پر واعظ کسی کی دعوت قبول نہ کرے البتہ اگر داعی پہلے سے شناسا اور مخلص ہو مضائقہ نہیں۔ یا اگر شناسا نہ ہو مگر قرائن سے مخلص ہونا دل کو لگتا ہے تو قبول کر لینے کا مضائقہ نہیں مگر اور کوئی چیز از قسم ہدیہ نقد یا غیر نقد ہرگز قبول نہ کرے۔

جزو ثامن :۔ واعظ کسی مدرسہ یا انجمن کے لئے یا اسی مد وعظ کے لئے چندہ کی ہرگز ترغیب نہ دے بلکہ اگر کوئی بلا ترغیب بھی دے تب بھی انکار کر دے اگر کوئی اصرار کرے اس سے کہہ دے کہ میں نہیں لیتا خود مرکز میں بھیج دو۔

جزو تاسع :۔ جو واعظ کا ناظم ہو وہ واعظ کے دورہ کے مقامات معین کر دے البتہ اتنی اجازت دے دے کہ اگر کسی جگہ خود واعظ سخت ضرور سمجھنے یا رغبت کے ساتھ اس کو بلایا جائے اور دونوں صورتوں میں وہ جگہ مقامات اذن سے پانچ کوس سے زیادہ فاصلہ پر نہ ہو تو وہاں بھی جا سکتا ہے اور اس سے زیادہ فاصلہ پر عذر کر دے کہ ناظم وعظ سے

درخواست کرو۔

جزو عاشر:۔ ناظم وعظ گاہ بگاہ کسی شخص تفتیش کے لئے مقامات دورہ پر بھیج دیا کرے کہ بستی والوں سے واعظ کی حالت اور کارگزاری کی کیفیت تحقیق کر کے ناظم کو اطلاع دے اور بار بار کی کوتاہی یا کسی گرانبار کوتاہی کے ثابت ہونے پر اولاً" تفہیم اور صورت اس کے نافع نہ ہونے کے معزولی کو عمل میں لایا جاوے۔

جزو حادی عشر:۔ اگر اتفاق سے کسی پر دو دو واعظ جمع ہو جاویں تو بعد میں پہنچے اس کو وہاں ٹھہرنا نہ چاہئے اور اگر اتفاق سے دونوں بالکل ایک ہی وقت میں پہنچیں گو ایسی صورت بہت شاذ ہے تو مصلحت یہ ہے کہ باہم مشورہ کر کے یا تو دونوں باری باری سے وعظ کہہ دیں یا ایک وہاں ٹھہر جائے دوسرا آگے چلا جاوے۔

جزو ثانی عشر:۔ واعظ کی رخصت یا غیر حاضری پر وضع تنخواہ وغیرہ امور میں مناسب حال قواعد تجویز کر کے واعظ کو اطلاع کر دی جائے۔

جزو ثالث عشر:۔ واعظ سیاسی امور یا کسی شخص کے ذاتی معاملات کے فیصلہ میں دخل نہ دے اگر اس کی درخواست بھی کی جائے صاف انکار کر دے۔

جزو رابع عشر:۔ احقر کے مواعظ مطبوعہ اور حیات المسلمین اور جزاء الاعمال اور فروع الایمان اور تعلیم الدین اگر میسر ہوں وعظ میں مدد لینے کے لئے واعظ کو عاریتہ" سپرد کر دیئے جائیں۔

جزو خامس عشر:۔ کسی کو تعویز گنڈہ دینے یا بیعت لینے سے تاکید منع کر دیا جاوے اگرچہ وہ اس کا اہل بھی ہو۔

جزو سادس عشر:۔ واعظ صرف وعظ ہی پر اکتفا نہ کرے کیونکہ وعظ میں سب نہیں آتے وہی لوگ آتے ہیں جو پہلے سے کچھ دیندار ہیں اور ضرورت ہے سب کو دیندار بنانے کی اس لئے واعظ کو حسب طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔

(الف) جو مسلمان نماز نہیں پڑھتے مسجد میں نہیں آتے ان کے مکان پر چند واقف مخلوص احباب کو ساتھ لے کر جائے اور صاحب خانہ کو بلا کر نرمی کے ساتھ اول اس کا کلمہ سنے پھر اس کے واسطہ سے اس کے گھر والوں کا کلمہ ٹھیک کیا جاوے۔ پھر

سب کو نماز کی تاکید کی جاوے۔ اسی طرح سب بے نمازیوں کے مکانوں پر جایا جاوے اور ہر بستی کے اندر ایک یا متعدد جماعتیں چند مخلص مستعدد و دینداروں کی ماتحتی میں قائم کر دی جائیں جو دوام کے ساتھ اس طرح لوگوں کے مکانوں پر جا کر ان کو کلمہ سکھلاتے رہیں اور بے نمازیوں کو نمازی بنانے کی کوشش کرتے رہیں اور اس خطاب خاص میں بجز تلقین کلمہ اور تاکید نماز کے کچھ نہ کہا جاوے۔ بقیہ احکام کے لئے وعظ عامکو کافی سمجھا جاوے۔

(ب) واعظ کو دیہات میں بھی اسی طرح کام کرنا چاہئے اور وہاں بھی اسی طرح جماعتیں قائم کر دینا چاہئیں۔

(ج) وعظ میں مسلسل تقریروں کے ساتھ مسائل ضروری سے بھی مسلمانوں کو مطلع کرنا چاہئے اور ان سب کاموں میں تحمل اور لطف و نرمی سے کام لیا جاوے گا۔

(نوٹ)

نمبر ا:۔ بحمد للہ یہاں اسی اعلان کے موافق کام شروع کر دیا گیا ہے خدا وہ دن بھی لائے کہ میں سب جگہ اس کے مطابق کام شروع ہو جانے کی خبر سن کر دل ٹھنڈا کروں۔

نمبر ۲:۔ چونکہ اس کام کے لئے ابھی کوئی مرکز متعین نہیں ہوا اس لئے اس کا انتظار نہ کیا جائے کہ جب کسی کی طرف سے تحریک ہوگی تو کام شروع کیا جائے گا بلکہ ہر جگہ کے علماء اور عوام کو اس اعلان کے موافق اس کام کی اہمیت پر نظر کر کے بطور خود کام شروع کر دینا چاہئے پھر اگر چاہیں تو مشورہ کر کے کسی جگہ جمع ہو کر کوئی مرکز مقرر کرلیں۔ والسلام۔

کتب اشرف علی مقام تھانہ بھون

تاریخ ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۹۳۸ء

تفہیم المسلمین

بعد الحمد و الصلوۃ۔ ان ہی ایام قریبیہ میں ایک مضمون بعنوان تنظیم المسلمین اور دوسرا بعنوان تعلیم المسلمین شائع ہو چکا ہے۔ پہلے مضمون میں مسلمانوں کی تنظیم کا طریقہ بتلایا گیا تھا۔ دوسرے مضمون میں علماء کو مشورہ دیا گیا کہ وہ خطاب خاص نیز وعظ عام کے ذریعہ بندگان خدا کو احکام اسلام پہنچائیں اور اس کے لئے ایک خاص نظام بھی بتلا دیا گیا تھا۔ پھر غور کرنے سے یہ بات ذہن میں آئی۔ کہ اس وقت فضاء زمانہ کا مقتضی یہ ہے کہ احکام الہیہ کے پہنچانے کا کام ہر مسلمان اپنے ذمے لازم سمجھے اور ہر شخص اسی دھن میں لگ جائے جیسا ہمارے اسلاف کا طریقہ تھا کہ علماء و صوفیاء امراء و روسا امیر و غریب خواندہ اور ناخواندہ سب کو یہی دھن تھی کہ جتنا جس کو احکام اسلام کا علم ہے اس کو دوسروں تک پہنچایا جائے۔ علماء وعظ و تذکیر کرتے تھے۔ صوفیاء اپنی مجلسوں میں نور باطن سے اور اپنی پاکیزہ باتوں سے بندگان کو اللہ کی طرف متوجہ کرتے تھے تاجر اپنے معاملات اور باہمی ملاقات میں اس کام کو نہ بھولتے تھے۔ اس عام توجہ کا یہ اثر تھا کہ بہت جلد لاکھوں کروڑوں بندگان خدا کو حق کی طرف ہدایت ہوگئی۔ اگر یہ کام تنہا علماء کے ذمہ ڈال دیا جاتا تو حق کی روشنی ان مقامات میں نہ پہنچ سکتی جہاں کسی عالم یا فاتح کا قدم بھی نہیں پہنچا۔ پس ضرورت ہے کہ تمام اہل اسلام عموماً" اور میرے ساتھ تعلق رکھنے والے خصوصاً" آج ہی سے اس دھن میں لگ جائیں کہ جتنا جس کو اسلام کے متعلق علم ہے اس کو دوسروں تک پہنچائے اور اس فریضہ کے ادا کرنے میں سرگرم ہو جائے اور غیب اور نصرت الٰہی کا امیدوار رہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت کرنے والوں کی ضرور مدد فرماتے ہیں ان تنصر و اللّٰہ ینصر کم ویثبت اقدامکم اب اس کے متعلق بھی ایک دستور العمل اور نظام مقرر کیا جاتا ہے تاکہ اس کے مطابق عمل درآمد کیا جائے۔

(۱) ہر شخص کو اولاً" خود دین میں مستقل پختہ اور مضبوط ہونا چاہئے۔ احکام الٰہی پر

عمل کرنے اور دوسروں تک پہنچانے میں کسی سے مرعوب نہ ہونا چاہئے اور نہ دینی کام میں کسی صورت و تعلقات کی پرواہ کرنا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے بڑا لائق محبت و تعلق کون ہے جس کے لئے احکام الہیہ کو ترک کیا جائے۔

(۲) ہر شخص کو اس کا خیال کرنا چاہئے کہ کسی جلسہ اور کسی مجلس کو احکام الہیہ کے پہنچانے سے خارج نہ رکھے مگر باریک اور اختلافی مسائل میں دخل نہ دیں کہ یہ کام علماء کا ہے اور اگر کوئی رد کردے یا سخت جواب تو صبر و تحمل سے کام لیں۔ سختی کا جواب سختی سے نہ دیں۔ جب کسی دیناوی غرض کے لئے بھی ملاقات ہو یا تجارت و ملازمت کے سلسلہ میں کسی سی ملنا ہو تو حسب موقع باتوں باتوں میں کلمتہ الحق ضرور پہنچا دیا جائے دین کے معاملہ میں مسلمان کی وہی شان ہونا چاہئے جو کہ حضرات صحابہ کی شان ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن نے بتلائی تھی جب ان سے پوچھا گیا کہ حضرات صحابہ کیسے تھے تو انہوں نے فرمایا (کہ دین کے معاملہ میں تو وہ گویا مجنون تھے) فاذا ارید احد منهم على شى من امر الله دارت حماليق عينيه كانه مجنون ص ۱۱۰ ج ۱۱۱ الادب المفرد للبخاری۔

(۳) رات دن میں کوئی وقت خاص اس کام کے لئے بھی نکالا جائے کہ اس میں بندگان خدا کو (خواہ مسلم یا غیر مسلم) احکام اسلام پہنچائے جائیں اور برے کاموں سے روکا جائے۔

(۴) احکام اسلام پہنچانے میں لہجہ ہمیشہ نرم ہونا چاہئے۔ گفتگو تہذیب اور متانت سے کرنا چاہئے البتہ جن پر اپنی حکومت ہے جیسی بیوی، اولاد، نوکر، شاگرد وغیرہ ان کو اول نرمی سے نصیحت کی جائے پھر بتدریج سختی سے سمجھایا جائے۔

(۵) احکام اسلام پہنچانے میں اس ترتیب کو ملحوظ رکھا جائے۔

(الف) جن کو اسلام معلوم نہیں ان کو لہ الہ الا اللہ محمد رسول اللہ سکھلایا جاوے اور اس کے معنی سمجھا دیئے جائیں۔

(ب) جن کو کلمہ اسلام معلوم ہے ان کو اس کے معنی بتلائے جائیں اور کہا جائے کہ رات دن میں کم از کم سو مرتبہ لا الہ الا اللہ اس کے ساتھ کبھی کبھی محمد رسول اللہ ملا کر پڑھا جائے۔

(ج) جو لوگ نماز نہیں پڑھتے ان کو پابندی نماز کی تاکید کی جائے۔ مردوں کو مسجد

میں با جماعت نماز پڑھنے کی تاکید کی جائے۔ جن کو نماز کا طریقہ معلوم نہیں ان کو نماز سکھلائی جائے اور ممکن ہو تو ہر نمازی کو پوری نماز کا ترجمہ بھی یاد کرا دیا جائے یعنی سبحانک اللھم سے التحیات درود شریف تک ہر چیز کا ترجمہ یاد کرلیں گے کہ اس سے نماز میں دلجمعی زیادہ ہوتی ہے اور وضو اور پاکی ناپاکی کے مسائل سے وقتاً" فوقتاً" آگاہ کیا جاوے۔

(د) جن پر زکواۃ فرض ہے ان کو زکواۃ ادا کرنے کی تاکید کی جائے جن پر قربانی واجب ہے ان کو قربانی کی ترغیب دیں۔

(ہ) رمضان شریف کے روزہ کی سب مسلمانوں کو تاکید کی جائے۔

(و) جن پر حج فرض ہو ان کو حج کی تاکید کی جاوے۔

(ز) ہر بستی میں تعلیم قرآن شریف کے مکاتب ضرور ہونا چاہئیں۔ جن میں تعلیم قرآن کے ساتھ اردو رسائل بہشتی زیور' بہشتی ثمر' راہ نجات وغیرہ بھی پڑھائے جائیں' تاکہ بچوں کو ضروری احکام کی اطلاع ہو جائے۔

(ح) سب مسلمانوں کو باہم اتفاق و اتحاد سے رہنے کی اور گالم گلوچ لڑائی جھگڑا بند کرنے کی تاکید کی جاوے۔

(ط) بستی کے کسی ایک با اثر دیندار کو یا چند دینداروں کی جماعت کو اپنا بڑا بنالیا جائے جن کا کام یہ ہو کہ لوگوں میں اتحاد و اتفاق قائم رکھیں اور امور مذکورہ بالا درج کریں اور جب کسی معاملہ میں نزاع ہو تو اس کا شریعت کے موافق علماء سے پوچھ کر فیصلہ کردیں اور سب اس فیصلہ کی تائید کریں۔

(ی) جھوٹ' غیبت' حسد و کینہ' دشمنی' کسی کی بے جا طرف داری' چغل خوری' زنا' بدنگاہی بے پردگی' شراب نوشی' لڑکوں سے ناجائز تعلقات' سودی لین دین' بے کاری آوارہ گردی کا انسداد کرنے کی پوری کوشش کی جائے۔

سوچ کر بولنے باہم تواضع اور محبت کا برتاؤ کرنے' انصاف و عدل پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہنا اور جائز ذرائع معاش میں لگے رہنے۔ کفایت شعاری اور آمدنی سے زیادہ خرچ نہ کرنے کی بہت تاکید کریں۔ تنگی برداشت کرلیں مگر حتی المقدور زیادہ خرچ نہ کریں۔

تقریبات اور روز مرہ کے خرچ میں کفایت شعاری کرنے پر لعن طعن کرنیکو عار نہ

سمجھیں۔ گھاس کھودنے تک کو بے کاری اور ذلت سوال پر ترجیح دیں اور نیک اعمال اختیار کرنے کی خود بھی کوشش کریں اور دوسروں کو بھی تاکید کرتے رہیں۔

(۶) حیات المسلمین، تبلیغ دین، تعلیم الدین، محاسن الاسلام، بہشتی زیور کو مطالعہ میں رکھیں اور وقتاً فوقتاً ان کے مضامین اپنے دوستوں، ملنے والوں اور سب بندگان خدا کو پہنچاتے رہیں۔

(۷) جو علماء کسی دینی خدمت میں مشغول ہیں جیسے درس تدریس تصنیف و تالیف وغیرہ وہ بھی اپنی نشست و برخاست اور اوقات ملاقات میں بندگان خدا کو احکام الہیہ پہنچانے میں سستی نہ کریں اور فرصت اوقات میں جیسے جمعہ کی تعطیل ہے یا رخصت طویلہ کا زمانہ ہے وعظ و نصیحت کا ذریعہ بندگان خدا کو احکام اسلام پہنچانا اپنا فریضہ سمجھیں۔ میں اپنے ساتھ خاص تعلق رکھنے والوں کو خاص طور پر مکرر تاکید کرتا ہوں کہ امور مذکورہ بالا کی پوری پابندی۔ اس میں ہرگز کوتاہی نہ کریں اور تمام اہل اسلام سے بھی یہی درخواست کرتا ہوں کہ اس دستور العمل کو حرز جان بنا کر ہر شخص دین الہی کی خدمت کے لئے آمادہ اور مستعد ہو جائے۔ مجھے اللہ کے بھروسہ پر یقین ہے کہ اگر سب مسلمان اسی طرح کام میں لگ جائیں گے تو تمام مصائب اور پریشانیوں کا جو اس وقت مسلمانوں کے سامنے ہیں بہت جلد خاتمہ ہو جائے گا اور نصرت الہی ان کے ساتھ ہوگی اور اس دستور العمل کو چند روز کے لئے نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم اور جاری رکھیں۔ اب اس مضمون کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں۔ ربنا اغفر لنا ذنوبنا واسرافنافی امرنا و ثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین۔

اشرف علی عفی عنہ

تاریخ ۲۳ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ مطابق ۲۴ فروری ۱۹۳۸ء

مقام تھانہ بھون

مسلم لیگ کی حمایت کرنے پر قتل کی دھمکی

مولانا تھانوی نے جب آل انڈیا مسلم لیگ کی مشروط حمایت شروع کی تو مخالف گروپ میں اس کا شدید رد عمل ہوا۔ روزنامہ الامان کے ایڈیٹر مولانا مظہر الدین پہلے ہی قتل کئے جا چکے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا تھانوی کو بھی ایک دھمکی آمیز خط لکھا گیا جس میں کہا گیا کہ آپ نے مسلم لیگ کی حمایت جاری رکھی تو آپ کو قتل کر دیا جائے

گا یہ گمنام خط ۱۳ اپریل ۱۹۲۹ء کو لکھا گیا۔ اس کے لفافے پر مٹھو ناتھ بھجن ضلع اعظم گڑھ کی مہر تھی اور تھانہ بھون کے ڈاک خانہ کی ۱۵ اپریل کی مہر لگی ہوئی تھی۔ اس تہدیدی خط میں لکھا گیا کہ ''مولوی اشرف علی تھانوی یہ بات ہمارے لئے بہت تشویش اور شرم کی ہے کہ کانگرس' جمعیتہ العماء ہند' احرار اور مومن کانفرنس کی تمام کوششوں کے باوجود مسلم لیگ کا فتنہ تمام ملک میں پھیلتا جا رہا ہے اور آپ نے علماء کے خلاف مسلم لیگ کے موافق فتویٰ دیا ہے جس کا بہت اثر ہوا ہے اب ہماری پارٹی مسلم لیگ کے بددین مولویوں کو مزا چکھانے کے لئے میدان میں آگئی ہے اس لئے آپ کو بھی تاکیدی نوٹس دیا جاتا ہے کہ آپ ایک ماہ کے اندر اندر اپنا فتویٰ واپس لے لیں اور حضرت امیرالھند مولانا حسین احمد مدنی کا مسلک قبول کر لو اور کانگرس کی حمایت کرو ورنہ یقین اور پورا یقین رکھو کہ تم کو بھی مولانا مظہرالدین الامان والے کی طرح تمہاری خانقاہ میں ذبح کر دیا جائے گا۔ یہ قسمیہ اور ایمانا'' اطلاع بھیجی جاتی ہے۔ ایک ماہ کی مدت غنیمت جاننا۔ ایک ماہ تمہارے بیان کی انتظاری کر کے ہمارا آدمی روانہ ہو جائے گا جو پستول اور چھرے سے تم کو ختم کر دے گا پھر مردود جینا (جناح) اور بدعتی مولوی بدایونی کی باری ہو گی۔ یہ چھٹی کوئی دھمکی نہیں ہے فقط کانگرس زندہ باد جمعیتہ العلماء ہند زندہ باد۔

قیام پاکستان کی پیشن گوئی

مولانا تھانوی نے نہ صرف مسلم لیگ کی تائید میں فتویٰ جاری کئے اور اپنے مریدوں اور احباب کو مسلم لیگ کی عملی امداد کی تلقین کی بلکہ ۱۹۳۸ء میں اپنے برادر نسبتی سعید احمد عثمانی نے قیام پاکستان کے متعلق پیشین گوئی بھی کر دی تھی۔ سعید احمد عثمانی نے راقم کو اس واقعہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا۔ ''حکیم الامت مجھ سے باپ کی طرح شفقت فرماتے تعلیم کے سلسلے میں کم و بیش میرا ان کاساتھ ایک ہی گھر میں بارہ تیرہ سال رہا اور بعض باتیں جو حضرت سے دوسرے لوگ نہیں کہہ سکتے تھے میں گستاخانہ کہہ دیتا اور مرحوم بہت تحمل سے ان کے حسن و قبیح پر غور کر کے مانتے یا رد کر دیتے تھے۔ جس واقعہ کی آپ کو جستجو ہے وہ یوں ہے کہ چند اعزا' مجھ سے مولانا ظفر احمد عثمانی کے مکان پر سیاسیات پر گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے دوران گفتگو میں کہا کہ جب تک غدار علماء کو ختم نہ کیا جائے گا کامیابی مشکل ہے۔ اس پر علی ساجد صاحب نے فرمایا کہ آپ تو انارکسٹ ہیں۔ غرض ہماری گفتگو ہماری ہمشیرہ صاحبہ نے سنی۔ ظاہر ہے بھائی کی طرف سے ان کو پریشانی ہوئی۔ ان دنوں میری سہارنپور کانگرس سے بہت چلی ہوئی تھی۔ میں ڈسٹرکٹ بورڈ سہارنپور میں ملازم تھا۔ کانگرسی میری سخت خلاف تھے اور اس زمانہ میں مجھ کو معطل کیا ہوا تھا۔ ہمشیرہ صاحبہ نے میری تمام گفتگو حضرت سے بیان کر دی۔ اس رات تقریباً" ڈھائی تین بجے حضرت نے مجھ کو بیدار کیا اور فرمایا کہ کیا تم اس گاڑی سے جاؤ گے جو ساڑھے تین بجے جاتی ہے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ فرمایا ضروریات سے فارغ ہو کر مجھ سے مل لینا ضروری بات کرنی ہے۔ میں سخت پریشان ہوا کہ کیا بات ہو گی جلدی سے فارغ ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ چوکی پر قبلہ رو ہو کر اپنے اوراد میں مشغول تھے۔ مجھ کو دیکھ کر اپنے پاس بٹھایا اور فرمایا ''مجھے تمہارے خیالات کا علم ہوا گھبرانے کی کوئی بات نہیں مجھے بہت سے مجذوبوں نے بتلایا ہے کہ یہ سلطنت ۱۹۴۷ء میں قائم ہو جائے گی۔''

آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کی دعوت

آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ۱۳ اپریل ۱۹۴۳ء کو دہلی میں منعقد ہوا۔ مسلم لیگ کی طرف سے مولانا تھانوی اس اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ دعوت نامے میں آپ سے استدعا کی گئی کہ آپ اس موقع پر تشریف لا کر اپنے ارشادات سے مجلس کو ہدایت فرمائیں تو بہتر ہے لیکن اگر حضور تشریف نہ لا سکیں تو اپنے نمائندہ کو بھیج کر مشکور فرمائیں اور دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس اجتماع کے رعب سے غیر مسلموں کے دلوں کو مسحور کر دے اور ہمارا مطالبہ پاکستان منوا دے تاکہ اسلامی سلطنت قائم ہو سکے۔"

مولانا تھانوی اس زمانہ میں سخت بیمار تھے اس لئے آپ نے شرکت سے معذوری کا اظہار کرتے ہوئے مندرجہ ذیل خط تحریر کیا۔

ازناکارہ آوارہ ننگ انام اشرف برائے نام۔ بخدمت ارکان مسلم لیگ نصرھم اللہ و انصرھم اللہ السلام علیکم: لیگ کے عزائم معلوم کرکے اس آیت پر عمل کی توفیق ہوئی قل بفضل اللّٰہ و برحمتہ فبذالک فلیفرحوا" لیکن اس کے ساتھ ہی یہ عذر نہ ہوتا تو اس آیت پر عمل کرتا "انفروا خفافا و ثقالا" لیکن عذر کے سبب اس رخصت پر عمل کی اجازت مل گی۔ " لیس علی الضعفاء و علی المرضی ولا علی الذین لا یجدون ما ینفقون لیکن اس کے ساتھ ہی اس آیت کا شرف حاصل ہوگیا کہ اپنی دو کتابوں کا پتہ دیتا ہوں جو انشاء اللہ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لیے پیام عمل ہے۔ ایک حیوۃ المسلمین شخصی اصلاح کے لیے دوسری صیانتہ المسلمین جمہوری نظام کے لیے ان کے مضامین اپنے موضوع پر گو رنگین نہیں مگر سنگین ضرور ہیں جس میں وہی فرق ہے جو ذوق اور غالب کے اشعار میں اور محمود خان اور محمد صادق کے نسخوں میں ہے اور نمائندہ وہ کام نہیں کرسکتا جو کتابیں کرسکتی ہیں۔ مگر شرط عملی ہے جیسے اعلیٰ درجہ کا ماء اللحم بوتلوں میں بھرا قیمتی ہے مگر نتیجہ خیز نہیں۔ یہ نفع اس وقت ظاہر ہوگا جب حلق سے اترے گا ورنہ بدوں عمل یہ سب کوششیں اس کا مصداق ہوں گی کہ نشستد و گفتند و برخاستند۔ باقی دعا ہر حال میں خصوص ان تاریخوں میں زیادہ اہتمام سے جاری رکھوں گا۔

نوٹ: اگر یہ کتابیں مل گئیں تو ۲۲؍ اپریل کو ڈاک سے ہدیتہ" روانہ کردوں گا ورنہ دہلی میں کسی تجارتی کتب خانہ سے تلاش کی جائیں والسلام احقر اشرف علی تھانوی

ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ

مسلم لیگ کی تعزیتی قرارداد

مولانا تھانوی ایک طویل عرصہ سے بیمار چلے آئے تھے۔ بالاخر ۲۰/ جولائی ۱۹۴۳ء کو آپ اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ مولانا تھانوی کو علمی دنیا میں جو مقام حاصل تھا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کی وفات پر آپ کے سیاسی مخالفین نے بھی آپ کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ بجنور کے مشہور نیشلسٹ اخبار مدینہ نے تعزیتی نوٹ میں لکھا "اگرچہ ہم مولانا کے سیاسی نظریات سے متفق نہیں ہوئے لیکن اس کے باوجود ان کے علم، تقویٰ اور دینداری کے سامنے سرجھکاتے ہیں۔ مولانا ایک بہت بڑے مفسر، عالم اور اعلیٰ درجہ کے مقرر تھے لیکن ان کی سب سے بڑی خاصیت یہ تھی کہ وہ اپنے دشمنوں کے خلاف بھی کوئی لفظ استعمال نہیں کرتے تھے۔

مولانا تھانوی کی وفات پر آل انڈیا مسلم لیگ نے جو تعزیتی قرارداد پاس کی اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم لیگ کے حلقوں میں مولانا کو کیا مرتبہ و مقام حاصل تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے ۱۴ نومبر ۱۹۴۳ء کو مندرجہ ذیل تعزیتی قرارداد پاس کی "آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا یہ اجلاس حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی وفات پر گہری رنج و غم کا اظہار کرتا ہے مولانا مرحوم ایک جید عالم تھے انہوں نے سیکنڑوں کتابیں لکھیں۔ لاکھوں لوگ ان کے مرید تھے اسلام کی اشاعت و تبلیغ میں انہوں نے جو خدمات انجام دیں ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے ان کی وفات مسلم لیگ کے لیے اس وجہ سے مزید دکھ کا باعث ہوئی کہ مولانا کی تائید و حمایت اس کے لیے بہت مددگار ثابت ہوئی جس کی وجہ سے مسلم لیگ نے خود غرض اور گمراہ طاقتوں کا مقابلہ کیا جو مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ کونسل کا یہ اجلاس خداوند کریم سے دعا کرتا ہے کہ مولانا کی روح کو سکون پہنچے اور ان کی روح بدستور ان مسلمانوں کی رہنمائی کرتی رہے جو مسلم انڈیا کی وحدت کے لیے کام کر رہی ہے۔ کونسل کا یہ اجلاس مولانا کے خاندان اور ان کے لاکھوں مریدوں سے بھی دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔"

پرچم کشائی

۲۷ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ بمطابق ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء بروز جمعتہ المبارک جشن پاکستان منایا جائے گا۔ تو بانی پاکستان جناب قائداعظم مرحوم نے علماء ربانی کی تاریخی خدمات کے اعتراف کے طور پر پاکستان کے پرچم کشائی کا اعزاز شیخ اسلام علامہ شبیر احمد عثمانی تھانوی کو بخشا۔

کراچی میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نے تلاوت قرآن مجید اور مختصر تقریر کے بعد اپنے متبرک ہاتھوں سے آزاد پاکستان کا پرچم آزاد فضا میں لہرا کر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کو اسلامی ممالک کی برادری میں شامل کرنے کی رسم کا افتتاح کیا۔ افواج پاکستان نے پرچم پاکستان کو پہلی سلامی دی۔

اسی دن اور اسی تاریخ کو ڈھاکہ میں پہلی پرچم کشائی' کی رسم اداء کرنے کی لئے جناب قائداعظم مرحوم کی ہدایت کے مطابق جناب خواجہ نظام الدین صاحب نے شیخ المحدثین حضرت علامہ ظفر احمد عثمانی تھانویؒ تحریک پاکستان میں خدمات کے پیش نظر آپ کو دعوت دی حضرت علامہ صاحب نے سورہ انا فتحنا کی ابتدائی آیات تلاوت کیں' تمام وزراء اور عمائدین مسلم لیگ خاموش اور باادب سنتے رہے۔ پھر بسم اللہ کرکے حضرت علامہ نے پاکستانی پرچم لہرایا۔ خوشی میں توپ خانہ سے سلامی کی توپیں چلیں۔ پھر وزرائے اسمبلی نے ہال میں حلف اٹھایا۔ اس تقریب میں حضرت علامہ مع جماعت علماء کرام شریک ہوئے اور چیف جسٹس مشرقی پاکستان سے آپ نے حلف لیا۔ اس کے بعد چیف جسٹس موصوف نے گورنر وزیر اعلیٰ اور دوسرے وزراء سے حلف وفاداری لیا۔

قیام پاکستان کے بعد اندرونی اور بیرونی سیاسی خلفشار اور دیگر معاملات میں الجھ کر نظام اسلام کی پیش رفت نہ ہوسکی جیسی کہ ہونی چاہئے تھی شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اور ان کے رفقاء کار مفتی محمد شفیع مفتی اعظم پاکستان مولانا ظفر احمد عثمانی اور دوسرے علماء کی کوشش سے پاکستان میں پہلی اسمبلی ۱۹۴۹ء اس کے وزیراعظم جناب لیاقت علی خان مرحوم کے ذریعہ قرارداد مقاصد منظور کرائی گئی تھی' اس سے حکومت کی اسلامی حیثیت متعین ہوگئی تھی۔ بعد میں اس کو آئین کا حصہ بھی بنا دیا گیا۔ اس

کے بعد حکومت سے ''بورڈ تعلیمات اسلام'' کا قیام تسلیم کرایا۔ تقریباً'' چار سال علامہ سید سلیمان ندوی کی سربراہی میں مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع ڈاکٹر حمید اللہ وغیرہ اسلامی قوانین کی ترتیب میں مصروف رہے۔ مگر اس وقت کی حکومتوں نے ان حضرات کی خدمات کی طرف قطعاً'' کوئی توجہ نہ دی۔ اور نہ ہی عوام کو ان حضرات کی سفارشات سے مطلع کیا گیا۔ اس کے بعد حکومتی حلقوں پر علماء نے اسلام نظام کے متعلق دباؤ ڈالا۔ تو حکومتی حلقوں نے سوال اٹھایا کہ اسلامی نظام کی کونسی تعبیر قابل قبول ہوگی۔ اس سوال پر ۱۹۵۱ء میں ملک کے مختلف مکاتب فکر کے جید علماء کرام حضرت مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع کی سربراہی میں کراچی میں اکٹھے ہوئے۔ اور ۲۲ اسلامی نکات مرتب کیے۔ جسمیں کسی بھی فرقہ کو کوئی اختلاف نہ ہے۔ ۱۹۷۳ء کے آئین میں حضرت مفتی محمود صاحب اور مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی مولانا عبدالحق کوششوں سے اس بات کی ضمانت دی گئی تھی کہ کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہیں بنایا جائیگا۔ اور پھر آئینی طور پر یہ کام اسلامی نظریاتی کونسل کے سپرد کر دیا گیا۔ کہ وہ غیر اسلامی قوانین کو اسلام کے مطابق بنانے کی سفارش قومی اسمبلی میں پیش کرے۔ مگر اسکا بھی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ جسٹس مولانا محمد تقی کا عثمانی دوسرے علمائے کرام اور ارکان اسلامی نظریاتی کونسل کی کوشش سے اسلامی قوانین کے متعلق ایک مسودہ تیار کیا گیا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کا اکثر کام مکمل ہوچکا ہے۔ اب اسکو اسمبلی میں پیش کرکے حسب ضابطہ منظوری لینے کی ضرورت ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پاکستان کا ابتدائی پانچ نکاتی خاکہ

جو سب سے پہلے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے پیش کیا

(از منشی عبدالرحمٰن خان)

متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی قریباً ایک ہزار سال حکومت رہی جس کے دوران دوسرے فرقوں کے علاوہ برہمنوں یعنی ہندوؤں پر زر و جواہر اور انعام و اکرام کی بارش ہوتی رہی۔ اکثر بادشاہوں اور صوبیداروں کے وزیر اعظم یعنی میر منشی اور مشیر مال برہمن ہوا کرتے تھے۔ اس اعزاز و اکرام کے باوجود سرزمین ہند پر اسلامی سلطنت کا وجود ہمیشہ اس کے لئے ناقابل برداشت رہا اور وہ مار آستین بن کر ہندو راج کے قیام کے لئے کوشاں رہے۔

1857ء میں جب مسلمانوں نے جنگ آزادی شروع کی تو ہندو برہمن انگریزوں کے ففتھ کالم کا کردار ادا کرتے رہے اور اپنے رفقائے جنگ آزادی یعنی مسلمانوں کے خلاف مخبریاں کرتے رہے اور اپنی وفاداری کی آڑ میں انگریزوں کو بہکا کر مسلمانوں کو تختہ مشق بناتے رہے۔ ہندو دھرم کے احیاء اور مسلمانوں کا صفحہ ہند سے نام و نشان مٹانے کے لئے 1887ء میں کانگرس کی سنگ بنیاد رکھی گئی۔ 21-1920ء میں جب چند مسلمان کانگرس میں شامل ہو گئے تو انہیں پر کاہ جتنی بھی وقعت نہ دیتے ہوئے' پنڈت جواہر لال نہرو کے والد پنڈت موتی لال نہرو نے کھلم کھلا اعلان کر دیا کہ کانگرس ہندو جماعت ہے۔ چند مسلمانوں کی اس میں شرکت کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی' مسلمانوں کو کسی گنتی میں شمار نہ کرتے ہوئے برملا کہدیا کہ ایک عام تحریک میں ہر قسم کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ کانگرسی لیڈر لالہ لاجپت رائے نے حقیقت پر سے پردہ اٹھاتے ہوئے صاف کہدیا کہ کانگرس میں مسلمان اس لئے کرائے پر لائے گئے ہیں کہ ان کی شرکت سے ہندو کانگرس کو نیشنل کانگرس ظاہر کیا جائے اور اس کے ذریعہ ہندو راج کے قیام کی مہم جاری رکھی جائے۔ اس حقیقت کے انکشاف کے بعد مولانا محمد علی جوہر اور مسٹر محمد علی جناح کانگرس سے علیحدہ ہو گئے۔ مگر کانگرسی علماء ہندوؤں کی چیرہ دستیوں اور مسلم کشیوں کو مقامی مناقشات کا نام دے

کر، ہندوؤں کے انسانیت سوز مظالم کی اہمیت گھٹانے اور اپنی اہمیت بڑھاتے رہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بقول مؤرخ اسلام مولانا سید سلیمان ندوی:۔

"ایک مرد درویش ایک پرانے قصبہ کی ایک کہنہ مسجد کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا، مسلمانوں کے سارے احوال اور ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر نظر ڈال کر حق و باطل۔ نیک و بد اور صحیح و غلط کے درمیان تفرقہ کی لکیر بنانے میں مصروف تھا۔ اس کے سامنے دین کی صحیح مثال تھی اور اس کو دیکھ دیکھ کر موجودہ زندگی کی تصویر میں جہاں جہاں غلطیاں تھیں وہ ان کے درست کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے پوری زندگی اس امر میں صرف کر دی کہ مسلم کی تصویر حیات کو اس شبیہ کے مطابق بنادے جو دین حق کے مرقع میں نظر آتی ہے۔"
(جامع المجددین)

یہ ذات گرامی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تھی۔ جنہوں نے اس غرض کے لئے 1928ء کے آغاز میں اپنی معرکتہ الارا کتاب "حیات المسلمین" شائع کی اور اس کے ساتھ ساتھ مطلوبہ پاکستان کا نقشہ بھی ذہناً تیار کرتے رہے۔

جون 1928ء میں جب کانگرسی لیڈر مولانا حسین احمد مدنی اور خلافتی رہنما مولانا عبدالماجد دریا آبادی دربار اشرفیہ میں تھانہ بھون پہنچے تو مولانا اشرف علی تھانوی نے بلا جھجھک، صاف صاف ان زعماء کے سامنے اپنے مندرجہ ذیل پانچ نکات پیش کر دیئے:۔

۱۔ دل یوں چاہتا ہے کہ ایک خطہ پر اسلامی حکومت ہو۔
۲۔ سارے قوانین وغیرہ کا اجراء احکام شریعت کے مطابق ہو۔
۳۔ بیت المال ہو۔
۴۔ نظام زکواۃ رائج ہو۔
۵۔ شرعی عدالتیں قائم ہوں وغیرہ۔

دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے یہ نتائج کہاں حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے تو صرف مسلمانوں ہی کی جماعت ہونی چاہئے اور اس کی کوشش کرنی چاہئے۔
(سیرت اشرف ص555)

حضرت تھانویؒ نے اس یادگار تاریخی ملاقات میں، سب سے پہلے پاکستان کا جو نقشہ پیش کیا۔ میں نے مولانا عبدالماجد دریابادی سے اس کی مزید تفصیل چاہی تو مولانا موصوف نے اپنے گرامی نامہ مورخہ 22 مئی 1955ء میں تحریر فرمایا کہ:۔

حضرت تھانوی کو بعض معاصر علماء کی طرح "جنگ آزادی"۔ جنگ حقوق۔ آزادئ وطن وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ان کے سامنے مسئلہ سیاسی نہ تھا۔ تمام تر دینی تھا۔ وہ صرف اسلام کی حکومت چاہتے تھے۔ 1928ء میں جب پہلی بار حاضری ہوئی تو حضرت نے دارالاسلام کی اسکیم خاصی تفصیل سے بیان فرمائی تھی۔ پاکستان کا تخیل۔ خالص اسلامی حکومت کا خیال یہ سب آوازیں بعد کی ہیں۔ پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان میں پڑیں۔ حضرت کی گفتگو میں یہ جزو بالکل صاف تھا۔" (سیرت اشرف۔ نقوش و تاثرات۔ انداز سخن)

گویا دربار اشرفیہ میں بقاء پاکستان کا لائحہ عمل اور نظام پاکستان کا مکمل نقشہ اس وقت منظر عام پر آیا۔ جبکہ پاکستان چاہنے والوں کو ابھی اس کا خواب و خیال بھی نہ تھا۔ پھر لطف یہ ہے کہ حضرت تھانوی نے دارالاسلام یا پاکستان کا جو نقشہ جون 1928ء میں پیش کیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اس کے اڑھائی سال بعد 29 دسمبر 1930ء کو اپنے خطبہ الہ آباد میں اس کا مطالبہ صرف ان الفاظ میں کیا کہ:

میں صرف ہندوستان اور اسلام کے فلاح و بہبود کے لئے ایک منظم اسلامی ریاست کا مطالبہ کرتا ہوں۔"

اس میں لفظ پاکستان یا اس کی تفصیل موجود نہ تھی۔

(۱) حضرت تھانویؒ نے جن متذکرہ بالا پانچ نکات پر دارالاسلام یا پاکستان چاہا تھا۔ انہی پانچ بنیادی نکات کے لئے قائداعظم نے پاکستان کی جنگ لڑی۔

(۲) ان ہی اصولوں کی حکومت کے لئے مسلمانوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔

(۳) انہی اصولوں کے مطابق دربار اشرفیہ کے فیض یافتہ۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کی مساعی جمیلہ سے قرارداد مقاصد پاس ہوئی۔ جو اب قانونی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔

(۴) ان ہی اصولوں پر مجلس دستور ساز نے نظام مملکت کی بنیاد رکھی کہ آئندہ کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جائے گا۔ جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

(۵) ان ہی اصولوں کی تعلیم مجلس دستور ساز نے مملکت پاکستان کے مسلمانوں کے لئے لازمی قرار دی۔

یہ شرف اولیت صرف اور صرف حضرت تھانوی کو حاصل ہے کہ ان کے پانچ بنیادی نکات آئین پاکستان کا جزو بن چکے ہیں اور بعض جنرل محمد ضیاء الحق کی مساعی سے قانونی شکل اختیار کر چکے ہیں۔

حضرت تھانویؒ بعض زعماء کی طرح صرف مسائل پیش کرنے کے عادی نہ تھے بلکہ ان کا حل بھی ساتھ بیان فرمادیتے تھے۔ اور ان کو عملی جامہ پہنانے میں خود بھی سعی فرماتے رہتے تھے۔ جیسے :۔

(۱) متحدہ ہندوستان میں قاضیوں کے تقرر کی تحریک سب سے پہلے حضرت تھانوی نے شروع کی۔

(۲) پنجاب میں شرعی نظام وراثت کی بجائے رواج عام کا قانون نافذ تھا۔ جس کی رو سے بیٹی اور بہن کو میراث سے حصہ نہ ملتا تھا۔ جس کو منسوخ کرانے کا کسی کو احساس تک نہ تھا۔ حضرت تھانویؒ نے اس سلسلہ میں بھی سبقت حاصل کرتے ہوئے اس غیر شرعی قانون کو منسوخ کرانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا اور تازیست اس مہم میں سر توڑ کوشش فرماتے رہے جو بالآخر 1945ء میں منسوخ ہو کر رہا۔

(۳) متحدہ ہندوستان میں بعض مقامات پر دینی تعلیم حکماً بند کردی گئی جبری تعلیم کی بدولت مسلمانوں پر قرآنی تعلیم کے دروازے بند کر دیئے گئے حضرت تھانوی نے اپنی دعا اور مالی امداد سے جبری تعلیم کے قانون کو منسوخ کرانے کی ایک تحریک چلائی۔ جس کی بدولت تھوڑی مدت بعد بفضلہٖ تعالیٰ تمام دینی مدارس کھل گئے اگر اس سلسلہ میں حضرت تھانوی فوری توجہ نہ فرماتے اور دوسرے رہنماؤں کی طرح منقار زیر پر رہتے تو یقیناً نتائج روح فرسا ہوتے۔

(۴) آپ کے عہد زندگی میں ہندوستان میں ایک ایسا قانون اوقاف نافذ تھا۔ جس کی رو سے مسلمانوں کے اوقاف کے انتظامی معاملات میں غیر مسلم حکومت دخیل تھی۔ مسلمانوں پر مذہبی امور میں غیر مسلموں کے عمل دخل کے خلاف آپ نے جو تحریک چلائی۔ اس میں آپ نے دوسرے زعماء کی طرح صرف زبانی جمع خرچ پر اکتفا نہ کیا بلکہ اس گوشہ نشیں

درویش نے چوٹی کے وکلا سے بحث مباحثہ کے بعد اپنا مئوقف منوالیا اور اس سلسلہ میں جس قدر اخراجات ہوئے۔ان کا ایک تہائی حصہ حضرت تھانویؒ نے اپنی جیب خاص سے ادا کیا۔یہ مہم 1930ء سے شروع ہوئی جبکہ پاکستان عالم خواب میں تھا۔اور حضرت تھانوی دارالاسلام کے قیام کے لئے تن من دھن سے کوشاں تھے۔

(۵) دوسری جنگ عظیم کے موقعہ پر گورنمنٹ نے فوجی امداد دینے کے لئے ایک بل اسمبلی میں پیش کیا۔جس کی کانگرس نے شدید مخالفت کرتے ہوئے قائداعظم اور مسلم لیگ کے خلاف آسمان سر پر اٹھالیا۔اور مختلف ذرائع سے قائداعظم کو بدنام کرنا شروع کر دیا۔جن کے واویلا کا اثر دربار اشرفیہ تک جا پہنچا۔کانگرس زدہ حضرات نے آرمی بل کی آڑ میں حضرت تھانوی کو قائداعظم سے برگشتہ کرنے کی شدت سے کوششیں کرنی اور چالیں چلنی شروع کردیں۔جس پر حضرت تھانوی نے فوراً اپنا ایک وفد بغرض وضاحت قائداعظم کی خدمت میں دہلی بھیجا جسے ملاقات کے لئے آدھ گھنٹہ دیا گیا۔مگر جب بات طول کھینچنے لگی تو قائد وفد نے قائداعظم سے کہا کہ اگر آپ کا کچھ ہرج ہوتا ہو تو ہمیں اجازت بخشیں۔قائداعظم نے فرمایا کہ:۔

> "نہیں۔دوسرے لوگ جو مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔میں جانتا ہوں وہ مجھ سے کیا کہیں گے۔ لیکن آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ میں نہیں جانتا۔اس لئے آپ جس قدر چاہیں شوق سے گفتگو کریں۔میں برابر سنوں گا۔"

حضرت تھانوی چونکہ قائداعظم کی دینی تربیت فرمارہے تھے اور مسلم لیگ کی حمایت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کررہے تھے۔اس لئے حضرت تھانوی کا ہر حرف قائداعظم کے لئے حرف آخر کی حیثیت رکھتا تھا۔متذکرہ بالا وفد کو دیا ہوا آدھ گھنٹہ کا وقت ڈیڑھ گھنٹہ پر ختم ہوا جب اس وفد نے واپس جا کر حضرت تھانوی کو تمام حالات سنائے تو انہوں نے ازراہ مسرت قائداعظم کے متعلق فرمایا کہ:۔

> "قوم کے اس مخلص رہنما کی نظر صرف آج کے حالات پر ہی نہیں۔بلکہ آج سے نودس سال بعد ہونے والے واقعات کو بھی وہ اپنی چشم فراست سے برابر دیکھ رہے ہیں۔"

مسلم لیگ کے مخالفین نے جب حضرت تھانوی کو آرمی بل کے سلسلہ میں قائداعظم کی تائید میں پایا تو ان کے عزائم مشومہ پر اوس پڑ گئی۔ اندازہ لگایئے اور انصاف کیجئے کہ ایک غیر معروف' دور افتادہ قصبہ میں بیٹھا ہوا یہ دور بین مرد درویش کس طرح ہندوستان میں پاکستان کی داغ بیل ڈالنے کے لئے آئینی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ تن واحد ہے۔ کوئی جماعت نہیں ہے۔ چندہ نہیں ہے جلوس نہیں جلسہ نہیں۔ پریس نہیں۔ اخبار نہیں۔ ماحول سارے کا سارا مخالف ہے۔ حصول پاکستان کی جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی۔ مگر حضرت تھانوی دامے۔ درمے قدمے اور سخنے اس مقصد کے لئے مصروف جدوجہد ہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد تحریک خلافت کے آغاز سے ہندوستان میں ایک ایسا بے پناہ سیاسی طوفان آیا کہ مسلمانوں کے بڑے بڑے لیڈر جن میں عالم بھی شامل تھے۔ یہ کہتے پھرتے تھے کہ بھائیوں کو راضی کرو۔ چاہے ہمارا دین ہمارے ہاتھ سے جاتا رہے مگر دنیا ہمیں ضرور ملے گی وغیرہ (مدینہ بجنور 21 فروری 1920ء) اور ایک ایسا فتنہ کھڑا ہو گیا۔ جس کے فرو کرنے کے لئے حضرت تھانوی نے مسلمانوں کو راہ راست پر لانے کی مساعی شروع کر دیں اور انہیں قرآن کریم کا یہ ارشاد ربی سنانا شروع کیا کہ قیامت آجائے ہندو کبھی مسلمان کا خیر خواہ اور دوست نہیں ہو سکتا۔ تاوقتیکہ تم ان کا مذہب اختیار نہ کرلو۔ اس فتنہ کی پشت پناہی ہندو کانگرس کر رہی تھی جس کے رہنما گاندھی تھے جو قائداعظم اور مسلم لیگ کے خلاف کانگرسی علماء کی امداد سے شورش پیدا کر رہے تھے۔ جس پر حضرت تھانوی نے مسلم لیگ سے تعاون کرنے کے لئے فتویٰ صادر کر دیا جو کانگرسی صفوں میں اسلامی بم بن کر پھٹا جس کی پاداش میں حضرت تھانوی کو قتل کرنے کے لئے غنڈے بھیجے گئے جو اس راستہ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ جس راستے حضرت تھانوی صبح کو نماز پڑھنے کے لئے مسجد جایا کرتے تھے۔ حضرت تھانوی کو قتل کی دھمکیاں اور خطوط کانگرسی تنخواہ خوار مسلمان پہلے دے چکے تھے۔ بلکہ مسلم لیگی صحافی مولانا مظہر الدین کو قتل کر چکے تھے۔ مگر ان سب باتوں کا علم ہونے کے باوجود حضرت تھانوی نے مسلم لیگ کی حمایت جاری رکھی اور نہ مسجد جانے کا راستہ بدلا۔ کانگرسی ٹولہ حضرت تھانوی کو آتے دیکھ کر ان کو قتل کرنے کے لئے جب آگے بڑھا تو ان پر ایسی ہیبت حق طاری ہوئی کہ انہوں نے قدموں پر زور دیا اور بھاگ گئے۔ مگر حضرت تھانوی مسلم لیگ کی حمایت سے تادم آخر باز نہ آئے۔

حضرت تھانوی طبعاً درویش منش تھے۔ وہ سیاسی تحریکات میں حصہ نہ لیتے تھے مگر سیاسی تحریکات کے سلسلہ میں جب آپ کے پاس استفسار آتے۔ تو اسوقت بحیثیت مجدد الملت۔ حکیم الامت آپ کو ان کی شرعی حیثیت واضح کرنی پڑتی جو کانگرس جمیعتہ العلماء احرار مومن کانفرنس اور نیشلسٹ مسلمانوں کے لئے ناقابل برداشت ہوتی۔ یہ ایک ایسا دور تھا۔ جس میں سب کو کچھ نہ کچھ اپنے مرکز سے ہٹنا پڑا۔ مگر حضرت تھانوی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مستحکم رہے اور اپنی رائے سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹے۔ اسی مسلک حق کی بدولت ہر آرے وقت میں ارباب مسلم لیگ آپ سے مشورہ لیتے رہے اور اس پر عمل کرتے رہے۔ متذکرہ بالا پارٹیوں یا جماعتوں کی سعی اتحاد کے باوجود 'حضرت تھانوی کی دعا و پر خلوص اعانت سے مسلم لیگ تاریخ ساز الیکشن جیتتی رہی۔ جس پر قائداعظم کو بہت فخر تھا۔ اسی لئے ایک دفعہ قائداعظم کی مجلس میں بمبئی کے چند تاجروں نے یہ کہا کہ کانگرس میں علماء زیادہ ہیں اور مسلم لیگ میں علماء کوئی نہیں۔ جس پر قائداعظم نے جوش کے لہجہ میں فرمایا کہ "مسلم لیگ کے ساتھ ایک بہت بڑا عالم ہے جس کا علم و تقدس اور تقویٰ اگر ایک پلڑے میں رکھا جائے دوسری پلڑے میں ہندوستان کے سب علماء کرام کو رکھا جائے تو اس کا ایک پلڑا بھاری ہوگا۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی ہیں جو چھوٹے سے قصبہ میں رہتے ہیں۔ مسلم لیگ کو ان کی حمایت کافی ہے اور کوئی موافقت کرے یا نہ کرے ہمیں پرواہ نہیں۔"

(تعمیر پاکستان اور علماء ربانی ص ۹۶)

ایسا ہی جوش اس وقت دیکھا گیا۔ جب حضرت تھانوی کا تبلیغی وفد قائداعظم کو نماز پڑھنے کی تلقین کر رہا تھا قائد وفد مولانا شبیر علی تھانوی نے جب قائداعظم سے کہا کہ "خود آپ پر بھی تو نماز فرض ہے۔ آپ کیوں نہیں پڑھتے؟ اس وقت قائداعظم کرسی پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ قائد وفد لکھتے ہیں کہ میری بات سن کر وہ آگے کو جھک گئے اور نہایت ندامت کے لہجے میں یہ الفاظ فرمائے:۔

> "میں گنہگار ہوں۔ خطاوار ہوں۔ آپ کو حق ہے کہ مجھے کہیں۔ میرا فرض ہے کہ اس کو سنوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ نماز پڑھا کروں گا۔"

اس روز سے تادم آخر وہ نماز پڑھتے رہے۔

منصوبہ پاکستان چونکہ اللہ والوں کا تیار کردہ تھا۔ اس لئے اسے تائید ایزدی حاصل تھی۔ جس کی وجہ سے ہر میدان میں دشمنان پاکستان کی سیاست اور ان کی تدابیر ناکام رہی اور مٹھی بھر مخلص علماء ربانی کامیاب و کامران رہے۔ صوبہ سرحد اور صوبہ سلہٹ میں ان ہی کی قربانیوں کی وجہ سے ریفرنڈم میں کامیابی حاصل ہوئی اور۔۔۔ ان کی قربانیوں نے دونوں صوبوں کو پاکستان میں شامل کرا کر اسے دنیا کی پانچویں بڑی مملکت بنایا۔ اگر یہ دونوں صوبے پاکستان میں شامل نہ ہوتے تو پاکستان کی کوئی حیثیت نہ ہوتی۔ اس تاریخی اور شاندار فتح کی خوشی میں 27 رمضان المبارک یعنی 14 اگست 1947ء بروزہ جمعتہ المبارک جشن پاکستان کے موقع پر ملک کی سب سے بڑی مقتدر ہستی یعنی قائداعظم محمد علی جناح گورنر جنرل پاکستان نے علماء ربانی کی تاریخی خدمات کے اعتراف کے طور پر پاکستان کی پرچم کشائی کا اعزاز علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی کو بخشا۔ جنہوں نے اپنے متبرک ہاتھوں سے آزاد پاکستان کا آزاد فضاء میں پرچم لہرا کر' دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کو اسلامی ممالک کی برادری میں شامل کرنے کی رسم کا افتتاح کیا۔ اور دنیا نے دیکھ لیا کہ مجدد الملت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے کانگرسی لیڈر مولانا حسین احمد مدنی اور خلافتی لیڈر مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے سامنے پاکستان کا جو نقشہ جون 1928ء میں پیش کیا تھا۔ اس کی رسم افتتاح بھی دربار اشرفیہ کے خدام کے حصہ میں آئی۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ اور ان کی سیاسی خدمات

حضرت مولانا شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نے جہاں مذہبی خدمات میں اپنی عمر کو گزار دیا وہاں آپ نے ملکی سیاسی خدمات اور آزادی ہندوستان کی راہنمائی بالخصوص مسلمانوں کو سیاسی راہ بتانے میں بڑی خدمات انجام دیں۔ آپ نے جمعیۃ الانصار میں سرگرمی سے حصہ لینے کیلئے ۱۹۱۱ء کی جنگ بلقان و طرابلس سے سیاسیات میں حصہ لینا شروع کیا۔ اس دور میں آپ نے بلقان اور طرابلس کے مسلمانوں کی مالی امداد کیلئے ہندوستان کے مختلف خطوں سے چندہ فراہم کیا۔

تحریک خلافت

1912ء سے 1918ء کی جنگ عظیم میں خلافت ترکی جرمن کے ساتھ مل کر برطانیہ سے لڑ رہی تھی۔ جرمن اور ترکی کو شکست ہوئی مسلمانان ہند نے تحریک خلافت میں سردھڑ کی بازی لگا دی۔ حضرت علامہ عثمانی نے بھی تحریک خلافت میں بڑا کام کیا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں آپکی زبردست تقریریں ہوئیں۔ تحریک خلافت میں حصہ لینے اور جلسوں میں تقریروں سے حضرت علامہ عثمانیؒ کی ملک میں دھوم مچ گئی۔

جمعتہ العلماء میں شرکت

تحریک خلافت جب شباب پر آئی تو جمعتہ العلماء ہند کی بنیاد 1919ء میں ڈالی گئی۔ ان میں ہندوستان کے ہر فرقے اور طبقے کے علماء شامل ہوئے۔ حضرت علامہ عثمانی کی شخصیت کے پیش نظران کو جمعیتہ العلماء ہند کی ورکنگ کمیٹی اور مجلس منتظمہ کیلئے منتخب کیا گیا۔ آپ جمیعتہ العلماء کے جلسوں میں شرکت فرماتے اور تقریریں کرتے۔ 1920ء کے دہلی کے سالانہ جلسہ میں حضرت علامہ عثمانی نے ترک موالات پر اپنا زبردست خطبہ دیا جو کہ اس وقت چھپ چکا تھا۔ یہ جلسہ حضرت مولانا شیخ الہند محمود حسن صاحب کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ جو کہ اس وقت مالٹا کی قید سے رہا ہو کر آئے ہی تھے۔

حضرت شیخ الہند کے ہمراہ حضرت علامہ عثمانی کا دورہ ہند

حضرت مولانا شیخ الہندؒ کو ہندوستان کے تمام شہروں سے جلسوں میں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی، ان تمام جلسوں میں حضرت علامہ عثمانی ان کے ہمراہ ہوتے تھے۔ دہلی، میرٹھ۔ مراد آباد۔ علی گڑھ۔ کانپور۔ سہارنپور۔ غرضیکہ ہر جگہ حضرت علامہ عثمانیؒ بطور نمائندہ تقریریں فرماتے۔ استاد محترم کی نیابت کا یہ بہت بڑا شرف تھا۔ جامعہ ملیہ کے افتتاح پر حضرت مولانا شیخ الہند سخت بیمار تھے۔ اسی عالم میں علی گڑھ پہنچے۔ حضرت علامہ عثمانی نے ہی خطبہ لکھا۔ اور انہوں نے ہی پڑھا۔ خلافت اور جمعیۃ العلماء کے جلسوں میں شرکت اور تقریریوں نے حضرت علامہ عثمانی کی شخصیت میں اور چاند لگادیئے اس طرح موصوف جمیعۃ العلماء میں شریک رہتے تا آنکہ مسلم لیگ کے نصب العین نے کانگرس سے علیحدہ اپنا زبردست محاذ قائم کرلیا۔

حضرت علامہ عثمانیؒ اور مسلم لیگ

حضرت موصوف کا رجحان ابتدا سے ہی اس طرف تھا۔ کہ مسلمانوں کے حقوق کی نمائندہ جماعت باوقار طور پر کانگریس سے علیحدہ ہو کر اپنے حقوق کی نگرانی کرے۔ اور ایسی جماعت مسلم لیگ ہی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا حضرت کانگرس میں اس وقت تک شرکت کرنے کو گوارہ نہیں فرماتے تھے جب تک کہ ان سے حقوق نہ منوا لئے جائیں۔ لیکن جمیعۃ العلماء جو کانگرس کے ساتھ متحد تھی۔ وہ آزادی ہند کی خاطر یہ نصب العین رکھتی تھی کہ ہندوستان کی دونوں قوموں یعنی ہندو اور مسلمانوں کو متحد ہو کر انگریزوں سے آزادی حاصل کرلینی چاہیئے۔ دشمن کو گھر سے نکال کر آپس میں حقوق کا فیصلہ کرنا چاہیئے۔

لیگ اور کانگرس کا اختلاف

مسلم لیگ کے قائد محمد علی جناح نے بالاخر ہندو اور کانگرس کے حالات کے پیش نظر 1945ء کے الیکشن کیلیئے مسلم لیگ کو علیحدہ الیکشن لڑنے اور مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مسلم لیگ کی تحریک نے زور پکڑ لیا۔ اور اس طرح دونوں کا سخت مقابلہ ٹھن گیا۔ 1940ء میں مسلم لیگ نظریہ پاکستان پیش کرچکی تھی حضرت علامہ

عثمانی بھی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔

حضرت علامہ عثمانیؒ اور مسلم لیگ کو ترقی

ہندوستان میں علماء کی دو جماعتیں بن گئیں۔ جن میں سے بہت سے کانگریس میں شامل تھے۔ جمیعتہ للعلمائے ہند دہلی قطعی طور پر کانگریس کی موید تھی' ان حالات میں جبکہ بڑے بڑے علماء کانگرس میں شامل تھے۔ مسلم لیگ کو مذہبی طور پر سخت دقت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن ایسے نازک وقت میں کسی موثر اور مقتدر عالم کی تائید کی سخت ضرورت تھی' حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی ہمیشہ سے ہی کانگرس کے خلاف تھے۔ حضرت عثمانی بھی کانگرس سے بیزار رہتے تھے۔ اس لئے آپ نے لیگ میں شرکت کا بروقت اعلان فرمایا۔ جس سے لیگ کو بہت طاقت حاصل ہوئی۔

کل جمیعتہ العلمائے اسلام کی صدارت

1945ء میں جمیعتہ العلمائے کے مقابلہ میں کل جمیعتہ العلمائے اسلام کی بنیاد پڑی۔ اس کا شاندار اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا۔ یہ اجلاس اپنی نوعیت کا نہایت ہی عظیم الشان اور تاریخی تھا۔ بے شمار عوام و خواص اس میں شامل ہوئے۔ حضرت علامہ عثمانی بیماری کی وجہ سے تشریف نہ لا سکے۔ البتہ آپ نے اپنا ایک تحریری پیغام بھیجا جو کہ جلسے میں پڑھا گیا۔ محض اس پیغام سے مسلمانوں پر جو اثر ہوا وہ بجلی کی طرح تمام مسلمانان ہند میں پھیل گیا۔ اس بیان کو چھپوا کر ہندوستان کے طول و عرض میں تقسیم کیا گیا۔ جس سے مسلمانوں میں کانگرس کے خلاف اور لیگ کے موافق جوش پھیل گیا۔ حضرت علامہ عثمانی کی شرکت نے مسلم لیگ کو بے حد تقویت پہنچائی اور کانگرس کو زبردست دھکا لگا۔

میرٹھ کانفرنس

میرٹھ میں لیگ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اسکی صدارت حضرت علامہ عثمانی نے فرمائی۔ آپ نے اسمیں زبردست خطبہ صدارت پڑھا۔ جس نے ملک کی کایا ہی پلٹ دی۔ اور آپ نے مسلم لیگ کو ووٹ دیکر کامیاب بنانے کا فتویٰ دیا۔ جس کے نتیجہ میں لیگ کو زبردست کامیابی ہوئی۔ اور لیاقت علیخان بھی آپ کی کوششوں کے نتیجے میں الیکشن میں کامیاب

ہوئے۔

جمیعتہ العلمائے اسلام کا اجلاس لاہور

1946ء میں حضرت علامہ عثمانی کی صدارت میں جمیعتہ کا اجلاس اسلامیہ کالج کے گراؤنڈ لاہور میں ہوا۔ یہ اجلاس اس لئے بھی زبردست اہمیت کا حامل تھا کہ پنجاب میں یونیسٹوں کی وزارت تھی۔ اور وزیر اعظم خضر حیات تھے۔ حضرت علامہ عثمانی نے اس اجلاس میں "ہمارا پاکستان" کے نام سے ایک بسیط و طویل خطبہ صدارت پڑھا۔ جس سے مسلمانان پنجاب کو صحیح راہ ملی اور ان کا جوش مسلم لیگ کے حق میں ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

ہندوستان کا دورہ

تحریک پاکستان اور مسلم لیگ کو تقویت پہنچانے کیلئے آپ نے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا۔ اور تقریریں کیں۔ جس سے لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مان لی گئی اور مسلمانوں کی اکثریت لیگ کے ساتھ ہو گئی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر حضرت علامہ عثمانی لیگ میں شامل نہ ہوتے تو مسلمانوں کو مذہبی حیثیت سے یہ باور کرانا دشوار ہو جاتا۔ کہ مسلم لیگ نہ صرف مسلمانوں کی جماعت ہے۔ بلکہ مذہبی حیثیت سے بھی اسمیں شرکت کرنا ضرور ہے بہر حال حضرت عثمانی کی لیگ میں شرکت بہت ہی بابرکت ثابت ہوئی۔

لیگ میں شرکت کی وجہ

حضرت علامہ عثمانیؒ نے قائداعظم سے تعاون کرنے کا جو اقدام کیا۔ اسمیں جو عوامل کار فرما تھے۔ ان میں سب سے بڑا یہ تھا کہ پاکستان بننے کے بعد وہاں اسلامی حکومت قائم کی جائیگی۔ بد قسمتی سے یہ خواب آج تک شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

دستور ساز اسمبلی میں حضرت علامہ عثمانی کی شرکت

متحدہ ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کیلئے حضرت علامہ عثمانی بنگال سے رکن منتخب ہوئے تھے۔ جب پاکستان کی منظوری برطانیہ کی پارلیمنٹ نے دیدی تو یہ بات طے ہو گئی کہ مسلم لیگ کی حمایت اور تائید کے پیش نظر مسلمانوں کیلئے ان صوبوں میں جہاں انکی اکثریت

ہے۔پاکستان بنادیا جائے۔اور جن صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہ ہندوستان میں شامل کردیئے جائیں۔اس فیصلے سے کانگرس اور لیگ کی کشمکش ختم ہوگئی۔

حضرت علامہ عثمانی اور صوبہ سرحد کا ریفرنڈم

اس نظریہ کے تحت کانگریس نے مطالبہ کیا کہ صوبہ سرحد میں چونکہ کانگرس کی وزارت ہے۔اور وہاں کے لوگ کانگرس میں شرکت کو پسند کرتے ہیں لہٰذا ان سے اس معاملہ میں رائے لی جائے۔کہ وہ ہندوستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا پاکستان میں۔یہ مرحلہ پاکستان کیلئے بڑانازک تھا۔اس مقصد کیلئے قائداعظم کی نظرانتخاب حضرت عثمانی پر پڑی۔آپ نے صوبہ سرحد کا سخت گرمی میں دورہ کیا۔وہاں کے بڑے بڑے شہروں میں تقریر کرکے ان کو وقت کی نزاکت کا احساس دلایا چنانچہ ریفرنڈم ہوا۔اور صوبہ سرحد کی اکثریت نے پاکستان میں اپنی شمولیت کا ووٹ دیا اور سرحد کی فتح کا یہ سہرا حضرت عثمانی کے سر بندھا۔

یوم آزادی کراچی میں آمد

14 اگست 1947ء کو کراچی میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن پہنچ رہے تھے۔تاکہ پاکستان کو آزادی کا حکم سنا کر حکومت کی ذمہ داری مسلم لیگ کے سپرد کردی جائے۔حضرت علامہ عثمانی چونکہ دستور ساز اسمبلی کے رکن تھے۔اس لئے اس حیثیت سے آپ انڈیا واپس نہ جاسکے۔اور جانا مناسب بھی نہ تھا ورنہ شہید کردیئے جاتے بہر حال آپ نے پاکستان میں مستقل قیام کیا۔

مہاجرین کی آمد اور انکی خدمت

1947ء کے انقلاب میں ہندوستان سے مسلمانوں کا زبردست انخلاء شروع ہوا۔اور قتل کا بازار گرم ہوگیا۔آپ نے مہاجرین کی زبردست خدمات انجام دیں۔علامہ ازیں حکومت کا بھی ساتھ دیا۔

مسئلہ کشمیر

ستمبر 1947ء میں حکومت ہند نے کشمیر پر قبضہ کرلیا۔پاکستان کیلئے یہ مسئلہ نہایت ہی

نازک صورتحال اختیار کر گیا۔ حضرت علامہ عثمانی نے شرعی حیثیت سے کشمیر میں جہاد کا فتویٰ دیا۔ مجاہدین کشمیر کیلیئے امداد کی اپیل کی۔ اور انکی طبی و مالی اعانت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

قرارداد مقاصد

آپ کا منتہائے نظر پاکستان میں اسلامی قانون کا اجراء تھا۔ اس کیلیئے آپ نے دستور ساز اسمبلی میں رہ کر اور باہر عوام میں بڑی کوشش کی۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کیلیئے آپ نے ڈھاکہ میں جمیعتہ العلمائے اسلام پاکستان کا جلسہ منعقد کروایا۔ اور اس جلسہ میں ایک معنی خیز خطبہ صدارت دیا۔ جس کے نتیجہ میں لیاقت علیخان نے قرارداد مقاصد کی تجویز پیش کی کہ پاکستان کا قانون اسلامی قانون ہوگا۔ حضرت علامہ عثمانی مرحوم نے اسمبلی میں اس ریزولیوشن کی زبردست تائید کی۔

انجمن خدام الدین
شیرانوالہ دروازہ لاہور

۱۳۷۲ھ
۲ صفر

مخدومی و مخدوم العلماء والفضلاء حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت برکاتکم

از احقر الانام احمد علی عفی عنہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کو معلوم ہے۔ کہ الحاد اور زندقہ کا طوفان پاکستان میں بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔ اس کا سد باب فقط مضبوط اور علماء کرام کی متحدہ جمعیۃ علماء اسلام ہی سے ہو سکتا ہے۔ اور حکومت بھی ایسی ہی جمعیۃ علماء اسلام کو قابل اعتبار سمجھیگی۔ اور عام مسلمانوں میں بھی یہی جمعیۃ مقبول ہو سکتی ہے۔ اسلئے مجھے آپ کی معاملہ فہمی اور اخلاق حمیدہ سے امید واثق ہے۔ کہ ہمارے پنجاب کے وفد کو جو حضرت مولانا محمد صاحب اور حضرت مفتی مولانا محمود صاحب پر مشتمل ہے۔ کامیاب و سرفراز فرما کر واپس فرمائینگے۔

فقط

عکسِ تحریر حضرت لاہوریؒ

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ اور انکی سیاسی خدمات

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ ان علماء ربانی میں سے ہیں۔ جنہوں نے مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کی اس وقت پشت پناہی کی جس وقت جمعیت العلماء ہند۔ احرار۔ نیشنلٹ کانگریس کے جھنڈے تلے اس کے خلاف صف آرا ہو چکے تھے۔ سارا دیوبند ایک طرف اور مفتی دیوبند ایک طرف۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ علماء نے پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ کیونکہ جمعیت العلماء ہند نے کھلم کھلا کانگریس کی حمایت کی اور پاکستان کی مخالفت کی۔ حالانکہ اس کے برعکس علماء کی ایک بڑی جماعت "جمعیت العلماء اسلام" کے نام سے تحریک پاکستان میں زبردست حصہ لیتی رہی۔ سلہٹ اور سرحد کے ریفرنڈم میں مسلم لیگ کی کامیابی اسی جمعیت العلماء اسلام کے اکابرین کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ دارالعلوم دیوبند جیسے شہرہ آفاق مرکز علوم اسلامیہ کے سرپرست اعلیٰ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ان علماء کرام کے سرپرست اور مربی تھے۔ جو مسلمانوں کی الگ تنظیم اور حصول آزادی کیلئے جدوجہد کو ناگزیر سمجھتے تھے۔ وہ مسلم لیگ اور قائداعظم کے زبردست حامی تھے۔ اسی نظریہ کے تحت انہوں نے اپنے متوسلین میں سے جن جید علماء کرام کو ہدایت فرمائی۔ کہ وہ پوری طاقت سے قائداعظم اور مسلم لیگ کا ساتھ دیں ان میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی حضرت مولانا عبدالکریم گتھلوی۔ حضرت مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری۔ حضرت مولانا مفتی محمد حسن امرتسری صاحب۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس وقت درالعلوم دیوبند دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ ایک گروپ کانگریس کا ساتھ دے رہا تھا۔ دوسرا گروپ جسمیں دارالعلوم دیوبند کے سرپرست اعلیٰ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور مہتمم حصرت علامہ شبیر احمد عثمانی مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب۔ صدر مفتی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب پر مشتمل تھا۔ کانگریس کا سخت مخالف تھا۔ جب ان حضرات نے یہ محسوس کیا کہ دارالعلوم دیوبند میں رہ کر اگر اختلاف

بڑھ گئے تو یہ دارالعلوم کے لئے نقصان دہ ہوگا۔ یہ علماء کرام دارالعلوم سے الگ ہو گئے اور خود کو تحریک پاکستان کیلئے وقف کر دیا۔ اسی زمانے میں حضرت مفتی صاحب کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ کے عنوان سے ایک کتاب تالیف فرمائی۔ جسمیں مطالبہ پاکستان کے سیاسی مصالح اور اس مطالبہ کی شرعی حیثیت قران و سنت کی روشنی میں تحریر کی اور ثابت کیا کہ ان حالات میں کانگریس کی حمایت نا مناسب ہے۔ جسمیں حصہ لینا قرآن و سنت کی روشنی سے بھی نامناسب ہے۔ جید علماءِ وقت جن میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی' حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اس فتویٰ کی پرزور تائید کی۔ نومبر 1945ء کے انتخابات ہندوستان کی قسمت کیلئے فیصلہ کن حیثیت رکھتے تھے۔ ضلع مظفر نگر و سہارنپور وغیرہ حلقہ انتخاب سے کانگریس کے مقابلے میں مسلم لیگ کی طرف سے لیاقت علیخان کھڑے تھے۔ اس حلقہ میں "جمعیت العلماء ہند" کا سب سے زیادہ اثر تھا۔ اس لئے مسلم لیگ کی کامیابی سب کو مشکل نظر آرہی تھی اور سہارنپور کے عوام کا مطالبہ تھا کہ اس حلقہ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے فتویٰ کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ چنانچہ مسلم لیگی زعماء نے حضرت مفتی صاحب کا فتویٰ حاصل کیا۔ اور اسے شائع کرا کر بڑے بڑے پوسٹروں کی شکل میں پورے حلقہ انتخاب میں چسپاں کر دیا گیا۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ کانگریس کے امیدواروں کو ووٹ دینا صحیح نہیں۔ مسلم لیگ کے امیدوار اس کے صحیح حقدار ہیں۔ حضرت مفتی صاحب کے اس فتویٰ نے انتخاب کی فضا کو یکسر بدل دیا۔ اور مسلم لیگ کی جو شکست یقینی نظر آرہی تھی کامیابی میں تبدیل ہو گئی اور یہ حقیقت ہے کہ اگر حضرت مفتی صاحب کا فتویٰ شائع نہ ہوتا تو مسلم لیگ کی شکست یقینی تھی۔ اس کا اعتراف خود لیاقت علی خان نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ "حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے فتویٰ کی بدولت ہمیں کامیابی ہوئی ان کا فتویٰ شائع ہوتے ہی ہوا کا رخ تبدیل ہو گیا۔ سلہٹ اور سرحد کے علاقے پاکستان کیلئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ چنانچہ قائداعظم نے حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب' حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب' مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے سامنے 11 جون 1947ء کو اس بات کا اظہار کیا۔ کہ یہ دونوں علاقے ہر قیمت پر پاکستان میں شامل ہونے چاہئیں۔ ان تینوں نے وعدہ فرمایا کہ وہ سرحد اور سلہٹ کا دورہ کرینگے اور مسلم لیگ کی کامیابی

کی سر توڑ کوشش کرینگے۔ حضرت علامہ عثمانی اور حضرت مفتی صاحب نے سرحد کا محاذ سنبھالا اور صوبہ سرحد کا دورہ کیا جن علاقوں میں فضا مسلم لیگ کے خلاف تھی۔ ان علماء کرام کے دوروں سے فضا یکدم تبدیل کر دی۔ اور مسلم لیگ کیلئے راہ ہموار ہو گئی۔ اگر حضرت علامہ عثمانی" اور حضرت مفتی صاحب اس موقع پر دورہ نہ کرتے تو اس ریفرنڈم میں پاکستان کی کامیابی چنداں آسان نہ تھی۔ اس بات کا اندازہ خود قائداعظم کے ان الفاظ سے لگایا جاسکتا ہے۔ جو انہوں نے اس وقت کہے جب ان حضرات علماء نے سرحد ریفرنڈم میں مسلم لیگ کی کامیابی پر قائداعظم کو مبارک باد دی اس مبارک باد کے جواب میں کہا' اس مبارک بادی کے مستحق آپ حضرات ہیں۔ یہ ساری کامیابی آپ حضرات علماء کی بدولت ہوئی ہے۔ جب حکومت برطانیہ نے ہندوستان سے کوچ کرنے کا فیصلہ کیا۔ تو نئی صورت حال پر غور کرنے کے لئے 9 جون 1947ء کو دہلی میں مشترکہ ہندوستان کی اسمبلی کے مسلم ارکان کا ایک اہم اجتماع ہوا۔ جسمیں شرکت کے لئے حضرت علامہ عثمانی اور حضرت مفتی صاحب کو خاص طور پر مدعو کیا گیا۔ جنکی بدولت مسلم لیگ نے انتخاب جیتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مفتی صاحب تعمیر پاکستان میں ایک بنیادی حیثیت رکھتے تھے۔ ان دونوں حضرات کو قائداعظم کے ایماء پر مدعو کیا گیا۔ جو دل سے ان کا احترام کرتے تھے تو دوسری طرف حضرت علامہ عثمانی اور ان کے رفقاء میں اگر ایک طرف قائداعظم اور مسلم لیگی زعماء کی خدمات ہیں۔ تو دوسری طرف حضرت علامہ عثمانی اور ان کے رفقاء کی اتنی ہی خدمات ہیں۔

اس وجہ سے پاکستان کو دونوں طبقوں کی مشترکہ کوشش کا ثمرہ خیال کرنا چاہئے۔ حضرت مفتی اعظم اور دوسرے علماء کرام نے پاکستان کیلئے جدوجہد محض اس مقصد کے لئے کی تھی کہ اس خطہ زمین میں پاکستان مسلمان قرآن و سنت کے قوانین نافذ کریں گے۔ اور اپنی تہذیب اپنی ثقافت اپنے علوم وفنون اپنی اردو زبان کو فروغ دینے کیلئے کسی کے محتاج نہیں رہیں گے۔

قرارداد مقاصد

جو پاکستان کے ہر آئین میں بطور دیباچہ شامل چلی آرہی ہے اور 1973ء کے آئین میں بھی شامل ہے۔ یہ وہ اہم قومی دستاویز ہے جس میں مملکت خداداد پاکستان کے مقاصد اور

قومی جہد و عمل کی سمت قرآن و سنت کی روشنی میں مقرر کی گئی ہے۔ اور ان بنیادی حدود کا تعین کیا گیا ہے جن پر دستور سازی کے تمام مراحل انجام پائے تھے۔ اور جنکی پابندی دستور ساز اسمبلی اور پاکستان کے ہر آئین کو کرنی تھی۔ یہ تاریخی دستاویز پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کیلئے سب سے پہلا ٹھوس قدم تھا۔ اب تک پاکستان کے دستور و قانون میں جو اسلامی دفعات شامل ہوئی ہیں یا آئندہ شامل ہونگی وہ سب در حقیقت اسی قرارداد مقاصد کی مرہون منت ہیں۔ قرار داد مقاصد اگرچہ دستور ساز اسمبلی میں اس وقت کے وزیر اعظم لیاقت علیخان نے پیش کی تھی۔ مگر اس کا مسودہ حضرت علامہ عثمانی اور حضرت مفتی صاحب نے طویل غور و خوض کے بعد مرتب فرمایا تھا۔ اسکی تیاری اور اس کے بعد اسے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے منظور کرانے میں حضرت علامہ عثمانی کو طویل علمی اور سیاسی جدو جہد کرنی پڑی' برسر اقتدار طبقہ کا گروہ اس راہ میں مسلسل رکاوٹیں کھڑی کر رہا تھا۔ مگر وزیر اعظم نے اس گروہ کے علی الرغم حضرت علامہ عثمانی کی حمایت کی۔ اور اسمبلی میں 12 مارچ 1949ء کو قرارداد مقاصد خود پیش کر کے اسے منظور کروایا۔ قیام پاکستان کے بعد جب دستور سازی کا کام شروع ہوا اس وقت علماء کرام نے اسلامی دستور سازی کیلئے انتہائی کوششیں کیں۔ ان کوششوں کے دوران مخالفین کی طرف سے یہ شوشہ چھوڑا گیا کہ اسلام کا سرے سے کوئی دستور مملکت ہی نہیں۔ اسکی عملی شکل کہیں بھی نظر نہیں آتی اسلام کے مبینہ اصولوں پر تمام علماء متفق نہیں ہیں۔ اس چیلنج کا جواب دینے کیلئے مختلف مکاتب فکر کے 31 علماء جمع ہوئے اور انہوں نے متفقہ طور پر اس کے جواب میں اسلامی مملکت کے بنیادی اصول جو 22 نکات کے نام سے مشہور ہیں۔ تحریر کئے اور بڑے پیمانے پر ان کو شائع کرایا گیا ان بنیادی اصولوں کی تیاری کے سلسلے میں حضرت مفتی صاحب کو سب سے زیادہ جدو جہد اور کاوش کرنا پڑی۔ اس کے بعد مسٹر اے۔ کے بروہی نے جب یہ اعلان کیا کہ قرآن میں دستور مملکت سے متعلق ایک لفظ بھی موجود نہیں' اس کے جواب میں حضرت مفتی صاحب ایک مفصل کتاب "دستور قرآنی" کے نام سے تحریر فرمائی۔ جسمیں انہوں نے حکومت کے اغراض و مقاصد۔ طرز حکومت فرائض حکومت اور صدر مملکت کے اوصاف سے متعلق 18 دستوری دفعات پیش کر کے قرآنی آیات کے ذریعہ انکو ثابت کر دیا۔ کہ جس دستور اسلامی کا مطالبہ پاکستان کے مسلمانوں کی طرف سے کیا جا رہا ہے۔ وہ کتاب اللہ میں موجود ہے۔ علماء د

فقہاء کے اجتہادات وقیاسات پر مبنی نہیں۔

بورڈ آف تعلیمات اسلام کی رکنیت

جب 1949ء میں دستور ساز اسمبلی نے باقاعدہ آئین سازی کا کام شروع کیا تو وزیر اعظم لیاقت علیخان نے ایک اسلامی مشاورتی بورڈ بنایا' جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسلامی دستور کا خاکہ تیار کر کے پیش کرے اور اسکی روشنی میں دستور ساز اسمبلی پاکستان کا آئین تیار کرے یہ بورڈ مندرجہ ذیل چھ حضرات پر مشتمل تھا۔

۱۔ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ صاحب۔ صدر

۲۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب۔ رکن

۳۔ جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب۔ رکن

۴۔ جناب پروفیسر عبد الخالق صاحب۔ رکن

۵۔ مولانا جعفر حسین صاحب مجتہد۔ رکن

۶۔ جناب ظفر احمد انصاری صاحب مرحوم۔ سیکریٹری

یہ بورد 9 اگست 1949ء سے اپریل 1959ء تک تقریباً ساڑھے چار سال قائم رہا۔ اس بورڈ نے عرق ریزی کے بعد دستور پاکستان کیلئے جو سفارشات پیش کی تھیں۔ اگرچہ 1956ء اور 1973ء کے دستاویز میں ان کی جھلک کسی تک موجود تھی۔ لیکن افسوس کہ اس بورڈ کی تمام سفارشات کسی بھی دور کے آئین میں نہ تو تمام کی تمام روبہ عمل لائی گیں۔ اور نہ انہیں ارباب حل وعقد نے شائع کیا۔

لا کمیشن کی سفارشات

بورڈ آف تعلیمات اسلامی کا تعلق تو صرف دستور کی حد تک تھا۔ پاکستان کے موجودہ قوانین سے اس کا تعلق نہ تھا۔ موجودہ قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے علامہ سید سلیمان ندوی نے حکومت پر زور دیا۔ تو 1950ء کے اواخر میں ایک "لا کمیشن" بنایا گیا۔ جسمیں علماء کرام کی جانب سے ابتداً صرف سید سلیمان ندوی کو ممبر بنایا گیا تھا۔ جسٹس رشید اور جسٹس میمن ماہر قانون کی حیثیت سے شریک کئے گئے یہ وہ وقت تھا کہ جب حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثانی وفات پاچکے تھے۔ حضرت سید صاحب نے محسوس فرمایا کہ اسلامی

قانون کے ماہر کی حیثیت سے "لا کمیشن" میں حضرت مفتی صاحب کی شرکت ضروری ہے۔ چنانچہ انہوں نے لا کمیشن میں اپنی شرکت باقی رکھنے کیلئے حکومت کے سامنے یہ شرط پیش کردی کہ کمیشن کا رکن حضرت مفتی صاحب کو بنایا جائے۔ بالآخر آپ کو اسکی بھی رکنیت قبول کرنی پڑی۔ یہ کمیشن بھی دو سال تک قائم رہا۔ لیکن وزارتوں کے تغیر تبدل اور برسر اقتدار طبقہ میں کئی ایسے افراد کی طرف سے مسلسل رکاوٹوں کے باعث جو اس ملک میں اسلامی نظام دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ اس کمیشن کی مساعی کوئی نتیجہ نہ پیدا کر سکیں۔ ایک موقع پر اس کمیشن کے ایک اجلاس میں حضرت مفتی صاحب نے کمیشن کے چیئرمین کو جو ایک جسٹس تھے مخاطب کر کے فرمایا۔ کہ قانون سازی کا کام اسلامی رخ پر آپ چلنے نہیں دیتے۔ اور غلط رخ پر میں نہیں چلنے دونگا۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ گاڑی یہیں کھڑی رہے گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔

زکوٰۃ کمیٹی میں شرکت

تقریباً اسی زمانہ کی بات ہے کہ حکومت پاکستان نے زکوٰۃ کی وصولی اور اس کی مصارف وغیرہ کے اسلامی قانون مدون کرنے کے لئے "زکواۃ کمیٹی" قائم کی تھی حضرت مفتی صاحب اس کے بھی اول سے آخر تک رکن رہے۔ لیکن اسمیں بھی وہی صورتحال پیش آئی۔ جو لا کمیشن میں پیش آئی تھی۔

مرکزی جمعیت العلماء اسلام کی قیادت

13 دسمبر 1949ء کو حضرت مولانا علامہ عثمانیؒ کی وفات کے بعد حضرت علامہ سید سلیمان ندوی صاحب "جمعیت علماء اسلام" کے صدر منتخب ہوئے۔ لیکن 22 نومبر 1953ء کو حضرت سید صاحب کی وفات پر جہاں دستوری مساعی کی دوسری ذمہ داریاں حضرت مفتی کے کندھوں پر آ پڑیں۔ اسی کے ساتھ جمعیت علماء اسلام کی صدارت بھی آپکو سونپ دی گئی۔ جتنے سرکاری اداروں میں آپ بحیثیت ممبر شریک ہوئے۔ ان سب میں آپ نے اپنی شرکت کی یہ شرط ارباب حل وعقد سے ہمیشہ منوائی کہ ہم پر عوامی تقریر و تحریر کی وہ پابندیاں عائد نہیں ہوگی۔ جو سرکاری ملازمین پر ہوتی ہیں۔ چنانچہ صدارت جمعیت علماء اسلام سے پہلے اور بعد میں آپ نے جمعیت کی جانب سے تحریک دستور اسلامی کیلئے مشرقی و مغربی پاکستان کے طول وعرض کے بار بار دورے کیئے اور ضلع ضلع پہنچ کر اسلامی دستور کیلئے عوامی

شعور کو بیدار کیا۔ مغربی پاکستان کا ایک دورہ جو 18 دسمبر 1955ء سے 3 جنوری 1956ء تک جاری رہا۔ جمعیت علماء اسلام کے صدر کی حیثیت سے آپ نے تین سال تک خدمات انجام دیں۔ آپکی مساعی ابھی جاری تھی کہ ملک میں انقلاب آیا۔ اور جنرل محمد ایوب خان نے مارشل لاء لگا کر تمام جماعتوں کو کالعدم قرار دے دیا۔ مگر 1970ء کے انتخابات سے کچھ پہلے سیاسی ہنگاموں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ پاکستان میں خاص اسلامی حکومت کی بجائے کیمونزم اور سوشلزم پھیل جانے کی خطرات قوی ہوگئے۔ اور سوشلزم کو عین اسلام باور کرانے کیلئے پروپیگنڈہ اور جلسے و جلوس عام ہوگئے۔ تو اس مسئلہ کی نزاکت نے پھر آپ کو جمعیت علماء اسلام کے احیاء پر مجبور کر دیا۔ کیونکہ ضابطہ میں صدر آپ ہی تھے۔ مغربی و مشرقی پاکستان کے تمام ارکان جمعیت کا اجلاس بلا کر جمعیت کی صدارت تو حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی کی طرف منتقل فرما دی۔ اور خود کسی عہدے کے بغیر "مرکزی جمعیت العلماء اسلام" کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے۔ اسلام اور سوشلزم کے درمیان جو خلیج حائل ہے۔ اسے تحریر و تقریر کے ذریعہ واضح فرمایا۔ آپ نے ایک رسالہ "اسلام کا نظام تقسیم دولت" اور دوسرا رسالہ "اسلامی نظام میں معاشی اصلاحات کیا ہونگی"؟ اسی دور میں تصنیف فرمائے جو کثیر تعداد میں شائع ہوئے۔ تقریباً ایک سال اسی جدوجہد میں صرف ہوا۔ جس سے مسئلہ کی وضاحت تو پوری ہو گئی۔ مگر سیاست کے میدان میں مسائل اور حقائق سے زیادہ زور کام کرتے ہیں۔ انتخابات کا نتیجہ بالکل برعکس نکلا اور اس کے اثر سے پاکستان پر جو زوال آنا تھا۔ آگیا۔

اجتماع علماء

ارباب اقتدار کے اس اعتراض کا کہ:۔

"اسلام کا کوئی دستور مملکت ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کے اصول کیا ہیں؟ اس کی عملی شکل کیا ہو سکتی ہے؟ اور کیا اصول اور عملی تفصیلات میں کوئی چیز بھی ایسی ہے، جس پر تمام اسلامی فرقوں کے علماء متفق ہو سکیں؟"

جواب دینے کے لئے حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی نے کراچی میں تمام اسلامی فرقوں کے چیدہ اور معتمد علیہ علماء کا ایک اجلاس طلب کیا تاکہ وہ ایک ایسا دستوری خاکہ

مرتب کردے، جو تمام اسلامی فرقوں کے لئے قابل قبول ہو۔

اس غرض کے لئے 21-22-23 اور 24 جنوری 1951ء کو ملک کے ہر طبقہ کے مندرجہ ذیل 31 علماء کرام کا ایک اجتماع بصدارت علامہ سید سلیمان ندویؒ منعقد ہوا۔

۱۔ علامہ سید سلیمان ندوی	سابق مدیر رسالہ "معارف" اعظم گڑھ
۲۔ مولانا مفتی محمد حسن امرتسری	مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور
۳۔ مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی	رکن بورڈ تعلیمات اسلام
۴۔ مولانا خیر محمد جالندھری	مہتمم خیر المدارس ملتان
۵۔ مولانا اطہر علی۔	صدر عامل جمیعتہ علماء اسلام مشرقی پاکستان
۶۔ مولانا احتشام الحق تھانوی۔	مہتمم دار العلوم الاسلامیہ اشرف آباد سندھ
۷۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی	شیخ الجامعہ جامعہ عباسیہ بہاول پور۔
۸۔ مولانا شمس الحق فریدپوری	صدر مہتمم مدرسہ اشرف العلوم ڈھاکہ
۹۔ مولانا محمد یوسف نبوری	شیخ التفسیر دار العلوم اسلامیہ اشرف آباد
۱۰۔ مولانا محمد بدر عالم	استاذ الحدیث در العلوم اسلامیہ اشرف آباد ٹنڈو والہ
۱۱۔ مولانا شمس الحق افغانی	وزیر معارف ریاست قلات۔
۱۲۔ قاضی عبد الصمد سربازی	قاضی قلات۔ بلوچستان
۱۳۔ مولانا ابو جعفر محمد صالح۔	امیر حزب اللہ مشرقی پاکستان۔
۱۴۔ مولانا حبیب اللہ	جامعہ دینیہ دار الہدیٰ ٹیڑھی۔ خیر پور میر
۱۵۔ مولانا محمد صادق	مہتمم مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ۔ کراچی
۱۶۔ مولانا راغب احسن	نائب صدر جمیعتہ المدرسین۔ سرسینہ مشرقی پاکستان
۱۷۔ مولانا محمد حبیب الرحمٰن	نائب صدر جمیعتہ المدرسین سرسینہ شریف مشرقی پاکستان
۱۸۔ مولانا احمد علی لاہوری	امیر انجمن خدام الدین لاہور
۱۹۔ مولانا محمد علی جالندھری	صدر مجلس احرار پاکستان
۲۰۔ مولانا محمد عبد الحامد بدایوانی	صدر جمیعتہ علماء پاکستان
۲۱۔ مولانا مفتی صاحب داد	مدرستہ الاسلام سندھ کراچی۔

ٹنڈو سائیں داد سندھ۔

۲۲۔ پیر محمد ہاشم مجددی	صدر جمیعتہ اہلحدیث مغربی پاکستان
۲۳۔ مولانا داؤد غزنوی	ناظم جمیعتہ اہلحدیث مغربی پاکستان
۲۴۔ مولانا محمد اسماعیل	رکن بورڈ تعلیمات اسلام
۲۵۔ مفتی جعفر حسین مجتہد	ادارہ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان
۲۶۔ مفتی کفایت حسین مجتہد	مانکی شریف
۲۷۔ پیر محمد امین الحسنات	خلیفہ حاجی ترنگ زئی
۲۸۔ حاجی خادم الاسلام محمد امین	سیکرٹری بورڈ تعلیمات اسلام
۲۹۔ مولانا ظفر احمد انصاری	رکن بورڈ تعلیمات اسلام
۳۰۔ پروفیسر عبدالخالق	امیر جماعت اسلامی پاکستان
۳۱۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی	

مودودی صاحب کا اعتراض

مولانا احتشام الحق تھانوی کو مختلف الخیال علماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے میں عظیم دشواریوں اور پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری اور بالآخر سب کو ایک جگہ جمع کر کے پہلو بہ پہلو بٹھلانے میں کامیاب ہوگئے۔ آغاز کار ہی میں یہ تجویز ہوئی کہ اس اجتماع کے فیصلہ کو مطالبہ کی صورت میں حکومت پاکستان کے سامنے رکھا جائے بس جونہی ایک صاحب نے یہ تجویز پیش کی' مودودی صاحب بگڑ بیٹھے اور فرمانے لگے کہ چونکہ یہ اجتماع اپنا فیصلہ مطالبہ کی شکل میں حکومت پاکستان کے سامنے رکھنا چاہتا ہے اس لئے میں ایسے اجتماع کی کارروائی میں حصہ نہیں لے سکتا۔ کیونکہ میرا حکومت سے مطالبہ کرنے والے اجتماع میں شریک ہونا' اس حکومت کو تسلیم کرنا ہے' جسے جماعت اسلامی بے دین حکومت سمجھتی ہے۔ اس پر سب ششدر رہ گئے۔ مولانا احتشام الحق صاحب اور ان کے ہم خیال علماء کی یہ امکانی کوشش تھی کہ کوئی ٹوٹنے نہ پائے۔ اس لئے انہوں نے جناب مودودی صاحب کو شریک اجلاس رکھنے کے لئے یہ تجویز پیش کی کہ ہمیں حکومت سے اسلامی دستور کا مطالبہ پیش کرنے کے لئے کام نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ اس غرض سے کام کرنا چاہئے کہ اگر کسی وقت دنیا کے کسی حصہ میں مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہو جائے تو ایسی حکومت کے بنیادی اصول کیا

ہونے چاہئیں۔ اسی لئے مولانا احتشام الحق صاحب نے اس اجتماع کی رپورٹ۔

"اسلامی مملکت کے بنیادی اصول"

کے نام سے شائع کی جس میں پاکستان یا "مطالبہ" کا ذکر تک نہیں۔ اگر علماء کرام نیک نفسی، بے غرضی اور موقع شناسی سے کام نہ لیتے، تو جناب مودودی صاحب کا شمولیت سے انکار افتراق کا باعث ہوتا۔

بنیاد اصول

ملک کے تمام مذہبی فرقوں کے ان مقتدر نمائندوں نے متفقہ طور پر ایک اسلامی مملکت کے لئے بنیادی اصول تجویز کر کے اتحاد و اتفاق کی ایک بے مثال یادگار قائم کر دی۔ وہ بنیادی اصول حسب ذیل تھے:۔

1۔ اصل حاکم تشریعی و تکوینی حیثیت سے اللہ رب العلمین ہے۔

2۔ ملک کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہو گا اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکے گا نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جا سکے گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

(تشریحی نوٹ) اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں، جو کتاب و سنت کے خلاف ہوں، تو اس کی تفریح بھی ضروری ہے کہ وہ بتدریج ایک معینہ مدت کے اندر منسوخ یا شریعت کے مطابق تبدیل کر دیئے جائیں گے۔

3۔ مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں، بلکہ اصول و مقاصد پر مبنی ہو گی، جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطہ حیات ہے۔

4۔ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہو گا کہ قرآن و سنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرے، منکرات کو مٹائے اور شعائر اسلام کے احیاء و اعلاء اور مسلمہ اسلامی فرقوں کے لئے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

5۔ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہو گا کہ وہ مسلمانان عالم کے رشتہ اتحاد و اخوت کو قوی سے قوی تر کرنے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیت جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی، لسانی، علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملت اسلامیہ کی

وحدت کے تحفظ واستحکام کا انتظام کرے۔

6۔ مملکت بالا امتیاز مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ، اور تعلیم کی کفیل ہو گی، جو اکتساب رزق کے قابل نہ ہوں یا نہ رہے ہوں یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعی اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

7۔ باشندگان ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے، جو شریعت اسلامیہ نے ان کو عطا کئے ہیں۔ یعنی حدود قانون کے اندر تحفظ جان، مال و آبرو، آزادی مذہب و مسلک آزادی عبادت، آزادی ذات، آزادی اظہار رائے، آزادی نقل و حرکت، آزادی اجتماع، آزادی اکتساب رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی ادارات سے استفادہ کا حق۔

8۔ مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کی سند جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائے گا۔ اور کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمی موقعہ صفائی و فیصلہ عدالت کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

9۔ مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدود قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔ انہیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہو گا وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا کرنا مناسب ہو گا کہ انہیں کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

10۔ غیر مسلم باشندگان مملکت کو حدود قانون کے اندر مذہب و عبادت تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی حاصل ہو گی۔ اور انہیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم ورواج کے مطابق کرانے کا حق حاصل ہو گا۔

11۔ غیر مسلم باشندگان مملکت سے حدود شرعیہ کے اندر جو معاہدات کئے گئے ہوں، ان کی پابندی لازمی ہو گی۔ اور جن حقوق شہری کا ذکر دفعہ نمبر 7 میں کیا گیا ہے۔ ان میں غیر مسلم باشندگان ملک اور مسلم باشندگان ملک سب برابر کے شریک ہوں گے۔

12۔ رئیس مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدین، صلاحیت اور اصابت رائے پر جمہور یا ان کے منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو۔

13۔ رئیس مملکت ہی نظم مملکت کا اصل ذمہ دار ہو گا، البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی جزو

کسی فرد یا جماعت کو تفویض کر سکتا ہے۔

14۔ رئیس مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں بلکہ شورائی ہو گی۔ یعنی وہ ارکان حکومت اور منتخب نمائندگان جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دیگا۔

15۔ رئیس مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہو گا کہ وہ دستور کا کلاً یا جزواً معطل کر کے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

16۔ جو جماعت رئیس مملکت کے انتخاب کی مجاز ہو گی' وہی کثرت آراء سے اسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہو گی۔

17۔ رئیس مملکت شہری حقوق میں عامتہ المسلمین کے برابر ہو گا اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہو گا۔

18۔ ارکان و عمال حکومت اور عام شہریوں کے لئے ایک ہی قانون و ضابطہ ہو گا اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اس کو نافذ کریں گی۔

19۔ محکمہ عدلیہ' محکمہ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہو گا تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہیئت انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔

20۔ ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہو گی۔ جو مملکت اسلامی کے اساسی اصول و مبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔

21۔ ملک کے مختلف ولایات و اقطاع مملکت واحدہ کے اجزاء انتظامی متصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسلی' لسانی یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہو گی' جنہیں انتظامی سہولتوں کے پیش نظر مرکز کی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہو گا۔ مگر انہیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہو گا۔

22۔ دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہو گی جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

خراج تحسین

جس کام کو ارباب اقتدار چار سال کے عرصہ میں نہ کر سکے۔ وہ مختلف الخیال علماء نے صرف چار دن کے اندر مکمل کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیا۔ جس پر ہر طرف سے تحسین و آفرین کے پیغام اور تار صدر مجلس علامہ سید سلیمان ندوی کو موصول ہونے لگے۔ یہاں

تک کہ وہ ارباب اقتدار جو علماء کرام کو سیاست سے بے بہرہ سمجھتے تھے' ان کے اس بے مثال تاریخی کارنامہ پر سید صاحب کو مبارک باد پیش کرنے پر مجبور ہوگئے۔ اور اس طرح علماء کی سیاست نے ارباب اختیار کی سیاست کو شکست فاش دے کر قریباً اسلامی بنیادی اصولوں کو عالم آشکارا کر دیا' جن کی بورڈ تعلیمات اسلامی نے بھی سفارش کی تھی اور جنہیں حکومت نے پردہ اخفاء میں رکھا ہوا تھا۔ اور علماء کی اس نمائندہ مجلس کو' صدر مجلس کی درخواست کے باوجود دکھلانے سے انکار کر دیا تھا۔ علماء کے اس متفقہ فارمولا نے حکومت کے شائع کردہ بنیادی اصولوں کے پرخچے اڑا دیئے اور ان کا حشر وہی ہوا' جو نہرو رپورٹ کا ہوا تھا۔

دستور قرآنی

تیسرا چیلنج مسٹر بروہی کا تھا کہ قرآن میں دستور مملکت کے متعلق ایک لفظ بھی موجود نہیں۔ اس کے جواب میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی نے ایک رسالہ "دستور قرآنی" لکھا۔ اس رسالہ میں انہوں نے حکومت کے اغراض و مقاصد' طرز حکومت' فرائض حکومت' اوصاف صدر مملکت وغیرہ کے متعلق 18 دستوری دفعات کو قرآن کریم سے بالاجمال پیش کر کے ثابت کیا کہ جس دستور اسلامی کا مطالبہ پاکستان کے مسلمانوں کی طرف سے کیا جارہا ہے وہ صرف ماہرین شریعت علماء و فقہاء کے اجتہادات و قیاسات پر مبنی نہیں بلکہ کتاب اللہ میں موجود ہے۔

اعجاز قرآنی

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان میں اس وقت جماعت اسلامی جیسی منظم جماعت .... اور کوئی نہیں۔ اس کے سوا باقی تمام جماعتوں کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے انہیں میں جمیعتہ العلماء اسلام بھی شامل ہے مگر حیرت ہے کہ جس قدر کام مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور ان کے معدودے چند رفقاء نے سرانجام دیا۔ وہ نتیجہ کے لحاظ سے اس منظم جماعت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگر ان کے پاس اسلامی جماعت جتنا فنڈ اور کارکن ہوتے' تو نتیجہ کچھ اس سے بھی مضاعف ہوتا۔ وہاں تو یہ حالت تھی۔ جیسا کہ مولانا موصوف اپنے ایک گرامی نامہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"دستوری مہم کے اتنے مصارف ہیں کہ عرض کرنا دشوار ہے۔ اپنے

اوپر کہاں تک برداشت کروں۔ جو کوئی ایسا آدمی نظر آتا ہے' اس کو
دستوری مہم پر خرچ کرنے کا مشورہ دیتا ہوں۔"

ایسے حالات میں انہوں نے وہ رسالہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں کثیر تعداد میں شائع کر کے ارکان اسمبلی' ارباب حکومت اور متعلقہ حضرات اور ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ میں مفت تقسیم کیا۔ پھر اسمبلی کے ایام میں ممبران اسمبلی' وزراء کو ملنا' ان کے اعتراضات کا جواب دینا' بعض مخلص اور ہمدرد ممبران دستوریہ کو اپنے ہاں بلانا' اسمبلی میں اٹھائے جانے والے سوالات کے جوابات تیار کرانا' غرضیکہ وہ شب و روز اسی ادھیڑ بن میں لگے رہتے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ :۔

الف۔ دستور ساز اسمبلی میں اسلامی آئین پر بعض ممبران نے اور خصوصاً سردار عبدالرب نشتر نے ایسی پر مغز و پر معلومات تقاریر کیں کہ ہندو ممبران بوکھلا اٹھے اور کہنے لگے کہ ہم یہاں اسلامیات پر لیکچر سننے نہیں آئے۔

ب۔ وہی مسٹر بروہی جو قرآن میں دستور مملکت کی موجودگی کے منکر تھے بلکہ اس کو ثابت کرنے والے کو انعام دینے کا اعلان کر چکے تھے۔ اولین دستوریہ میں بطور وزیر قانون آئین مملکت پیش کرتے ہیں اور اس کے تیسرے باب کی یہ دفعات پیش کر کے منظور کراتے ہیں :۔

دفعہ 4۔ کسی مجلس قانون ساز کو قرآن پاک اور سنت رسولؐ کے خلاف قانون سازی نہ کرنی چاہئے۔

دفعہ 5۔ قرآن پاک اور سنت کی الفاظ جہاں جہاں آئے ہیں' ان کا کسی فرقہ پر اطلاق کے وقت مفہوم وہی لیا جائے گا' جو اس فرقہ کے نزدیک صحیح اور مسلم ہو۔

دفعہ 6۔ یہ اختیارات صرف سپریم کورٹ کو حاصل ہونے چاہئیں کہ وہ فیصلہ کرے کہ کوئی قانون قرآن پاک اور سنت کے خلاف ہے یا ان کے مطابق۔

دفعہ 7۔ مملکت پاکستان کے ہر شہری کو یہ حق حاصل ہونا چاہئے کہ وہ کسی بھی قانون کو قرآن و سنت کے خلاف ہونے کی بناء پر چیلنج کر سکے۔

دفعہ 8۔ یہ درخواست مسودۂ قانون کی منظوری سے تین ماہ کے اندر دائر ہونی چاہیے۔

دفعہ 9۔ سپریم کورٹ کا فل بنچ جو کم سے کم پانچ ججوں پر مشتمل ہو۔ اس مقدمہ کی سماعت

کرے گا اور اس بات کا فیصلہ کہ کوئی قانون خلاف قرآن پاک و سنت ہے یا نہیں ان کی اکثریت کی رائے کے مطابق ہونا چاہیے۔

دفعہ 11 ایک ایسے ادارہ کا قیام عمل میں لایا جائے جو عوام الناس کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے۔

قرآن کے نام پر آئین اسلامی سے انکار و استکبار کرنے والے کی زبان و قلم سے قرآن کے مطابق یہ دفعات پیش کر کے پاس کرانا انتقام قدرت 'یا اعجاز قرآن یا علماء کرام کی مخلصانہ جدو جہد کا نتیجہ نہیں تو اور کیا ہے۔

قرآنی حکومت

"قومی آواز" کے نمائندہ کے اس استفسار کے جواب میں کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہو گا یا سیکولر یعنی غیر مذہبی؟ وزیر داخلہ جنرل سکندر مرزا نے یہ جواب دیا تھا کہ :۔

اس تیرہ سو سال کے عرصہ میں آپ ہی بتائیے' کسی ملک میں بھی حکومت کی بنیاد قرآن پر رہی ہے؟ اور اگر کسی دور میں اسلامی حکومت اس سے پہلے نہیں ہوئی ہے تو آج کیسے ہو سکتی ہے؟" (صدق جدید ج ۴۔۵ ص ۲)

"ادوار ذیل میں تو قرآن برابر آئین سلطنت کا کام دیتا رہا ہے :۔

۱۔ محمد رسول اللہؐ (۶۲۸ء تا ۶۳۲ء) جب رقبہ حکومت ۱۰ لاکھ میل مربع تھا۔ بشمول نجد 'حجاز' یمن وغیرہ۔

۲۔ ابو بکر صدیقؓ (۶۳۲ء تا ۶۳۴ء) جب رقبہ حکومت ۱۳ لاکھ میل مربع تھا۔ بشمول عراق و شام جنوبی وغیرہ۔

۳۔ عمر فاروقؓ (۶۳۴ء تا ۶۴۴ء) جب رقبہ حکومت ۲۷ لاکھ میل مربع تھا۔ بشمول ایران' شام شمالی' مصر' طرابلس وغیرہ۔

۴۔ عثمان غنیؓ (۶۴۴ء تا ۶۵۶ء) جب رقبہ حکومت ۳۵ لاکھ میل مربع تھا۔ بشمول شمالی افریقہ و مغربی جزائر بحیرہ روم وغیرہ۔

۵۔ علی مرتضیٰؓ (۶۵۶ء تا ۶۶۱ء) جب رقبہ حکومت ۳۵ لاکھ میل مربع تھا۔ بشمول شمالی افریقہ و مغربی جزائر بحیرہ۔ روم وغیرہ

۶۔ حسن بن علیؓ (۶۶۱ء تا ۶۶۳ء) جب رقبہ حکومت ۳۵ لاکھ میل مربع تھا۔ بشمول افریقہ مشرقی و جزائر بحیرہ روم وغیرہ۔

۷۔ عمر بن عبدالعزیزؒ (۷۱۷ء تا ۷۲۰ء) جب حدود سلطنت کہیں زیادہ وسیع ہو چکے تھے۔ بشمول افغانستان' کردستان' ترکستان' خراسان' اسپین وغیرہ۔

یہ تو تاریخ کو کھلی ہوئی شہادت ہے۔ ورنہ ان کے علاوہ بھی کیا ہندوستان اور کیا عراق اور کیا شام اور کیا سپین' ہر مسلم ملک کے بیسیوں فرمانروا اپنے آئین حکومت کو قرآن سے قریب لانے کی کوشش کم و بیش کامیابی کے ساتھ کرتے رہے۔ اور پھر سب سے بڑھ کر روشن مثال تو آج کی مملکت حجاز کی ہے نجد و حجاز کا دستور العمل آج بھی قرآن ہی ہے۔ اور ابھی وہی چار سال کی بات ہے کہ جب امریکہ میں ساری دنیا کے ملکوں کے آئین اکٹھے کئے جا رہے تھے تو اس کی مانگ پر سلطان عبدالعزیز ابن مسعود مرحوم نے اپنے ہاں سے قرآن ہی بھجوا دیا تھا' یہ کہہ کر کہ ہمارا آئین و دستور یہی ہے۔

آئیڈئل (مثال نصب العین) کوئی سا بھی ہو' یہ ضروری نہیں کہ اس کے ماننے والے ایک ایک جزئیہ میں اس پر چلنے میں کامیاب ہو جائیں۔ بلکہ جو نصب العین جتنا زیادہ بلند ہوگا' اسی نسبت سے اس کی پیروی بھی دشوار اور ہمت طلب ہو گی۔ لیکن اس سے اس کے مطلوب و مقصود ہونے پر ہرگز کوئی اثر نہیں پڑتا۔" (صدق جدید جلد ۴ نمبر ۵۰ ص ۲)

تمہید از ناشر ۔

مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

مصنف افادات اشرفیہ

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ کمترین خدام بارگاہ اشرفی ناکارہ خلائق محمد شفیع دیوبندی عفا اللہ عنہ عرض گذار ہے کہ سیدی وسندی حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کو حق سبحانہ وتعالیٰ نے عام کمالات علمیہ وعملیہ اور رجوع الی الحق میں ایک خاص امتیاز اور تمام معاملات میں دور بینی اور اصابت رائے اور اس کے ساتھ بے نظیر ہمت واستقلال عطا فرمایا تھا ایکطرف تو آپ شان فاروقی کان وقافا عند حدود اللہ کے مظہر اتم تھے کہ ایک بچہ یا ان پڑھ کے کہنے سے اگر اپنی غلطی معلوم ہو جاوے تو فوراً غلطی کا اعتراف اور اس سے رجوع شائع فرمادیں تصانیف میں سلسلہ ترجیح الراجح اس کے ثبوت کیلئے کافی ہے دوسری طرف جب تک کسی چیز کو حق سمجھیں اس کو کسی دنیوی مصلحت یا عوام کی مخالفت کے سبب چھوڑ بیٹھیں یا اس کا کتمان کریں یہ آپ کی عادات میں ناممکن تھا۔ اسی کیساتھ سب سے بڑی اہم اور قابل تقلید صفت حق تعالیٰ نے یہ عطا فرمائی تھی کہ مسائل اختلافیہ میں ہمیشہ حدود محفوظ رہتی تھیں جس کے اثار آپ کے عمل میں یہ تھے۔

(الف) جن معاملات میں علماء کا اختلاف ہو ان میں بدون کسی مکمل تحقیق وتفتیش کے کوئی فتویٰ یا اعلان شائع نہ فرماتے تھے (ب) مقدور بھر تحقیق کے بعد اگر اعلان کی ضرورت بھی ثابت ہوئی تو اس وقت بھی دوسری جانب کی پوری رعایت رکھ کر اعلان کیا جاتا تھا۔ جس سے اختلاف کی خلیج وسیع ہونے اور عوام کو علماء کیخلاف برسرپیکار آنے کا موقع نہ ملے (ج) اعلان کے بعد بھی تحقیق حال اور مفاہمت باہمی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اور قابل قبول چیزوں کے قبول کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتی تھی پہلی جنگ عظیم اور زوال خلافت کے وقت سے ہندوستان میں موجودہ سیاسی تحریکات کا آغاز ہوا۔ ان میں قیام واستحکام خلافت اور ہندوستان کی آزادی وغیرہ کے مقاصد صحیحہ کیلئے جدوجہد شروع ہوئی مگر کچھ تو طرز عمل کے مفید ومنتج نہ ہونے پر ان میں رائے کا اختلاف رہا اور کچھ مفکرات اس میں شامل ہوگئے جن کے سبب شرکت تحریکات میں علماء کا اختلاف پیش آیا۔ پھر اس وقت سے آج تک سیاسی

نظریات اور عملیات میں بیشمار تغیرات واقع ہونے کی وجہ سے اختلاف کی جہتیں بڑھتی گئیں۔

حضرت اقدس رحمتہ اللہ علیہ کا طبعی رنگ درویشانہ یکسوئی کا تھا اس کا مقتضے یہ تھا کہ ان سیاسی تحریکات میں آپ کوئی دخل نہ دیتے۔ لیکن اس طبعی رنگ کے ساتھ حق تعالیٰ نے آپ کو ایک مجددانہ اصلاح وتربیت اور ہمدردی خلق کا بھی وہ جذبہ صادقہ عطا فرمایا تھا جو آپ کو اکثر بے چین کئے رکھتا تھا اور اسی وجہ سے جب ملک میں کوئی ہنگامی تحریک شروع ہوئی اس پر شرعی حیثیت اور تجربہ کارانہ بصیرت کے ساتھ نظر ڈالکر اپنے نزدیک اس کے حسن وقبح اور پھر صحیح راہ عمل واضح کر دینے کا معمول رہا۔

مسلم لیگ اور کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کے منافع و مضار پر بھی انہیں معمولات کے ماتحت نظر رہی اور حالات وواقعات کی تفتیش بھی جاری رہی لیکن چونکہ علماء کی ایک جماعت کانگریس کیساتھ بھی تعاون کر رہی تھی اس لئے باوجود مشاہدہ منکرات کے حسب دستور اس کی شرکت پر مطلقاً کوئی حکم نہیں فرمایا۔ سوالات کئے گئے تو کانگریس میں پیش آنیوالے معاملات جزئیہ کا علیحدہ علیحدہ حکم شرعی جائز یا ناجائز کر کے تحریر فرمایا مطلقاً اس کی شرکت کو ممنوع و ناجائز نہیں کہا۔ یہاں تک کہ متواتر خطوط اور خبروں سے یہ ثابت ہوا کہ اب کانگریس میں کلی قبضہ اور غلبہ ہندوؤں کا ہے اور مسلمان شرکاء کانگریس کو طوعاً یا کرہاً ان کی متابعت کرنا پڑتی ہے۔ نیز کانگریس کا ڈھائی سالہ دور حکومت بھی اس اثناء میں سامنے آگیا جس نے مسلمانوں سے غداری اور لایالو نکمہ جناح ولا تخفی صدورھم کی تصدیق ظاہر کر دی اس وقت مسلمانوں کی کانگریس سے بیزاری خود بخود بڑھی سوالات کی کثرت ہوئی خود بھی مسلمانوں کی یہ تباہی جو ہندو عزائم کا پس منظر تھا کسی حساس مسلمان کیلئے قابل گوارا نہ تھا۔

دوسری طرف کچھ علماء کی اس میں شرکت اس سے مانع بھی تھی کہ اس کے متعلق کوئی عام حکم لکھا جاوے۔ اس لئے حسب معمول اول یہ ارادہ فرمایا کہ ان علماء سے گفتگو کے ذریعہ سے مفاہمت کیجائے۔ چنانچہ متعدد مرتبہ اکابر جمعیۃ علماء سے اس میں مکالمہ کیا گیا لیکن کانگریس کی شرکت میں جو شرعی نتائج اور مسلمانوں کے قومی مضاد تھے اس کا کوئی شافی جواب نہ ہو سکا تو پھر یہ تجویز فرمایا کہ جمعیت علماء اور مسلم لیگ دونوں سے تحریری سوالات کر کے

مسائل حاضرہ کی مکمل تحقیق بھی کی جائے اور دونوں جماعتوں میں اتحاد کی کوشش بھی۔ لیکن افسوس یہ کہ کوشش بعض ناقابل ذکر اسباب کی وجہ سے نہ چل سکی اور تحریری سوالات کے جواب بھی صرف مسلم لیگ کی طرف سے حاصل ہوئے۔ جمعیت کی طرف سے باوجود چند مرتبہ یاد دہانی کے کوئی جواب نہ آیا۔ اس تمام کاوش و تحقیق کے بعد رسالہ تنظیم المسلمین لکھا گیا جس میں کانگریس کی مہالک پر نظر فرما کر اس کی شرکت کو مسلمانوں کیلئے ممنوع قرار دیا۔ مگر کانگریس سے منقطع ہو کر اگر مسلمان منتشر پراگندہ ہو جاویں تو یہ ان کی سیاسی و موت تھی اس لئے ضرورت ہوئی کہ ان کو خود منظم ہو کر رہنے کا مشورہ دیا جائے مگر ملک کی موجودہ مسلم جماعتوں نے یہ تنظیم مسلمین کا اہتمام نہ کیا یا وہ اہتمام کامیاب نہ ہوا اب بجز مسلم لیگ کے سوا کوئی ایسی جماعت ملک میں نہ تھی جس کو مسلمانوں کی جمہوری طاقت حاصل ہو اس لئے اس کی شرکت و حمایت کی رائے دیگئی پھر چونکہ مسلم لیگ نہ کوئی علماء کی جماعت ہے نہ خاص دینداروں کی اس لئے اس کی قیادت سے بھی جو کچھ دینی مضرتوں کا اندیشہ تھا اس کا حل یہ تجویز فرمایا کہ مسلمانوں میں عموماً اور زعماء لیگ میں خصوصاً تبلیغ احکام کی پوری جدوجہد کیجائے جس سے انکی تنظیم شریعت کیموافق اور اسکی مساعی اسلامی مفاد کے ماتحت ہو جاویں اس کیلئے ایک مجلس علماء بنام "دعوۃ الحق" قائم فرمائی جسکے وفود مختلف اوقات اور مختلف مقامات میں زعماء لیگ اور عام مسلمانوں میں تبلیغ کا کام انجام دیتے رہے اور خود حضرت اقدس نے متعدد خطوط تبلیغی مسٹر جناح اور دوسرے زعماء کے نام لکھے جن کے جواب میں ان حضرات نے احکام دینیہ کی اہتمام کا ارادہ ظاہر فرمایا حضرت اکثر حسرت کیساتھ فرمایا کرتے تھے کہ اگر علماء متفق ہو کر اس تبلیغ کیطرف لگ جاتے تو کچھ بعید نہ تھا کہ مسلم لیگ چند روز میں دینداروں کی جماعت ہو جاتی لیکن افسوس کہ اس کام میں میں متفرد ہی رہا اس کا اتنا ہی اثر ہوا جتنا انفرادی کوشش کا ہو سکتا تھا۔ حضرت اقدس کی یہ تمام تحریرات متعلقہ سیاسیات جسمیں مستقل رسائل بھی ہیں کچھ اشتہادات و مکتوبات الالحفوظات بھی منتشر طور پر موقف رسائل میں شائع ہوتے رہے جنکا جمع کرنا ہر ایک کیلئے آسان نہیں تھا۔ اور چونکہ یہ تحریرات درحقیقت مسلمانوں کی سیاسیات و اجتماعیات کیلئے نہایت صحیح و بے خطر اصول ہیں۔ ضرورت معلوم ہوئی کہ اس سیاسی طوفان کے زمانہ میں انکا مجموعہ یکجا شائع کر دیا جائے۔ جسکے دو مقصد ہیں ایک عام۔ کہ مسلمان ایسے حالات میں افراط و تفریط کے درمیان حدود شریعہ

کو ہر حال میں پیش نظر رکھیں اور جو راہ عمل حضرت اقدس نے تجویز فرمایا ہے وہ اگر دل کو لگے اس کو قبول فرمائیں۔

دوسری خاص کہ حضرت اقدس کے متبعین و متعلقین کو حضرت کا مسلک پوری طرح معلوم ہو جاوے وہ کسی مغالطہ کے شکار نہ ہوں۔ اس لئے اس ناکارہ نے کافی محنت اٹھا کر ان تمام رسائل و مضامین کو جمع کیا۔ انہیں سے اکثر مطبوع و شائع شدہ ہیں اور بعض وہ ہیں جنکے مسودات خانقاہ تھانہ بھون میں محفوظ ہیں مگر ہنوز شائع نہ ہوئے تھے۔ اسکی تفصیل ہر مضمون کے شروع میں لکھدی گئی ہے۔

ایک اہم گذارش

آخر میں عرض ہے کہ مضامین متعلقہ سیاسیات مندرجہ مجموعہ ہذا کا مطالعہ ہر شخص کو پارٹی بندی کے نظریہ سے علیحدہ ہو کر محض آخرت کے پیش نظر کرنا چاہئے اور دیانت اور غور و فکر کیساتھ مطالعہ کرنیکے بعد جو راہ عمل اختیار کریں اختیار ہے لیکن ذیل کے دو کلمے جو دو مقدس بزرگوں کی ارشاد اور متفق علیہ مضامین پر مشتمل ہیں اپنے ہر عمل اور ہر سعی میں انکو پیش نظر رکھیں انمیں ایک ملفوظ ہے قطب عالم سیدی و سندی حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ کا اور دوسرا ملفوظ ہے سیدی و مرشدی حضرت حکیم الامت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کا۔

ملفوظ اول

سیدی حضرت شیخ الہند قدس سرہ مالٹا سے تشریف لانیکے بعد رمضان المبارک میں بعد تراویح ایک شب دار العلوم دیوبند میں دار الافتاء کی چھت پر رونق افروز تھے اور مشتاقین و معتقدین کا مجمع تھا احقر بھی حاضر تھا۔ دوران گفتگو میں فرمایا کہ "مالٹا کی زندگی میں ہم نے تو ایک سبق یاد کیا ہے کہ ہر چیز کو برداشت کر لیا جائے لیکن مسلمانوں کے باہمی تفرقہ کو کسی حال گوارا نہ کیا جائے"۔ بعینہ الفاظ صحیح یاد نہیں لیکن اسکا یقین ہو کہ مضمون یہی تھا۔

ملفوظ دوم

سیدی حضرت حکیم الامتہ قدس سرہ نے مختلف مجلسوں میں بارہا فرمایا کہ اگر کسی مسئلہ میں کسی سے اختلاف ہو تو بدگمانی و بدزبانی سے اجتناب کی پوری کوشش کرنا چاہئے۔ اس سے

اختلاف حدود کے اندر رہتا ہے اور دائرہ خلاف و شقاق وسیع نہیں ہوتا۔ اس میں بھی لفظ بدگمانی و بدزبانی تو بعینہ یاد ہیں بقیہ الفاظ میں ممکن ہے کہ کچھ تغیر ہوا ہو مگر مضمون محفوظ ہے۔ انتہی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہی دو کلمے مسلمانوں کی قومی و سیاسی سب الجھنوں کا حل ہیں۔ واللہ الموفق والمعین۔

ناکارہ خلائق بندہ محمد شفیع دیوبند عفااللہ عنہ ۷/ محرم ۱۳۶۵ھ

سیاسیات حاضرہ

کے متعلق

حضرت حکیم الامت قدس سرہ کا مسلک

ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ میں عام مسلمانوں کی اطلاع اور غلط افواہوں کے ازالہ کے لئے حضرت اقدس نے اپنا مسلک دوبارہ سیاسیات شائع فرمایا تھا جس کی نقل اس وقت نہیں مل سکی غالباً رسالہ الامداد تھانہ بھون کے کسی پرچہ میں ہوگی اور اجمالاً رسالہ الروضۃ الناضرہ کے بیسویں مسئلہ میں بھی مذکور ہے یہ رسالہ اسی مجموعہ میں آگے آتا ہے پھر اس مسلک کی شرح رسالہ النور جمادی الاولیٰ ۱۳۳۹ھ میں شائع کی گئی ہے اور اسی سے اشرف السوانح جلد سوم میں صفحہ ۱۶۱ میں منقول ہے وہ حسب ذیل ہے۔

احقر اشرف علی کی شائع شدہ مسلک کی مختصر اور ضروری شرح

(از اشرف السوانح جلد سوم صفحہ ۱۶۱ تا ۱۶۴)

مبسملاً و حامداً و مصلیاً۔ آغاز ربیع الثانی سنہ رواں میں ایک اعلان بعنوان "مسائل حاضرہ کے متعلق احقر اشرف علی کا مسلک" شائع کیا گیا تھا اسمیں ایک جملہ تھا کہ میں ان شورشوں کو ایک فتنہ سمجھتا ہوں میں اس کو مقصود کے لئے کافی سمجھتا تھا مگر بعضوں کو اسمیں اسوجہ سے غلط فہمی ہوئی کہ انہوں نے اسکا غیر واقعی مبنی اپنی طرف سے مخترع کرلیا اسکے ازالہ کے لئے اس جملہ کی مختصر شرح کرنیکی ضرورت ہے یہ دوسرا اعلان شائع کرتا ہوں اول چند مقدمات سمجھ لئے جاویں (۱) مسائل بعض قطعی ہوتے ہیں ان میں اختلاف کی کچھ گنجائش نہیں ہوتی بعضے اجتہادی و ظنی ہوتے ہیں ان میں سلف سے خلف تک شاگرد نے استاد کے ساتھ مرید نے پیر کیساتھ قلیل جماعت نے کثیر جماعت کیساتھ واحد نے متعدد کیساتھ اختلاف کیا ہے اور علمائے امت نے اس پر نکیر نہیں کیا ہے اور نہ ایک نے دوسرے

کو ضال اور عاصی کہا نہ کسی نے دوسرے کو اپنے ساتھ متفق ہونے پر مجبور کیا نہ اختلاف کے ہوتے ہوئے باہم بغض وعداوت ہوا نہ مناظرہ پر اصرار کیا گیا۔ چنانچہ مشاجرات صحابہ کا اختلاف اور علیحدہ رہنے والوں کی علیحدگی کو سب کا جائز رکھنا معلوم ہے۔ (۲) ایسے مسائل اجتہادیہ ظنیہ میں اختلاف دو طرح سے ہوا ہے ایک دلائل کے اختلاف سے جیسے حنفی شافعی میں قرأت فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں دوسرے واقعات یا عوارض کے اختلاف سے جیسے امام صاحب اور صاحبین میں نکاح صائبات کے مسئلہ میں کہ جن کو تحقیق ہوا کہ وہ اہل کتاب میں سے ہیں انہوں نے اس نکاح کو جائز رکھا اور جنکو تحقیق ہوا کہ وہ اہل کتاب میں سے نہیں انہوں نے اس نکاح کو ناجائز رکھا مگر اس واقعہ کی تحقیق میں اختلاف ہو گیا کہ آیا وہ کتابی ہیں یا غیر کتابی اسلئے فتویٰ میں اختلاف ہوا یا حنفی شافعی میں تعین سورت فی الصلوٰۃ کے مسئلہ میں۔ کہ شافعی نے نفس عمل کو منقول عن الشارع دیکھکر اسکو جائز کہا اور امام صاحب نے عارض اعتقاد یا ابہام اعتقاد وجوب حالاً ما لا پر نظر کر کے اس کو مکروہ فرمایا۔ (۳) حکم شرعی کا محل اور متعلق ہمیشہ معنون ہوتا ہے نہ کہ عنوان مثلاً کوئی شخص مغصوب زمین میں مسجد بنالے اور مالک قاضی اسلام کی اجلاس میں اس کا مغصوب ہونا ثابت کر دے اور قاضی غاصب کو اس مسجد کے انہدام اور زمین کی واپسی کا حکم دیدے تو قاضی پر یہ اعتراض جائز نہ ہو گا کہ اس نے مسجد منہدم کرادی مسجد محض اس کا نام ہے واقع میں وہ مسجد ہی نہیں۔ ان مقدمات کے بعد سمجھنا چاہئے کہ تحریکات حاضرہ کا خلاصہ اس وقت دو امر ہیں ایک تعاون جس کی نفی کا نام ترک موالات رکھا ہے دوسرا اتحاد ہندو مسلم۔ ان دونوں میں دو دو درجے ہیں جن میں سے ایک ایک درجہ میں تو کسی کا اختلاف نہیں اور ایک ایک درجہ میں اس وقت علماء و عقلاء کا آپس میں اختلاف ہے۔

امر اول کا درجہ اول۔

وہ نوکریاں یا وہ لین دین کی صورتیں ہیں جو دلائل شرعیہ سے فی نفسہا ناجائز ہیں اور ان کے ناجائز ہونے پر ہمیشہ علماء فتویٰ دیتے چلے آئے ہیں۔ اور وہی فتویٰ اب بھی باقی ہے مثلاً جن نوکریوں میں سود کی ڈگری دیجائے یا جس تجارت میں سود کا معاملہ ہو اسی طرح وہ دوستانہ معاشرت جو خاص مسلمانوں ہی کا حق ہے یا وہ علوم وفنون حاصل کرنا جو دین میں مضر

ہیں سوان میں واقعات حاضرہ کو کچھ دخل نہیں اور نہ ان میں مسلم وغیر مسلم میں کچھ تفاوت ہے ان سے اختلاف حال میں احتجاج کرنا در حقیقت غلط مبحث اور بالکل بے ربط اور بے محل بات ہے۔

امر ثانی کا درجہ اول

وہ اتحاد ہے جس کا حاصل عدم نزاع ہے یعنی دونوں فریق حدود کے اندر رہ کر اپنے اپنے فرائض مذہبی کو ادا کریں اور ایک دوسرے سے تعرض نہ کریں۔ اور حقوق ہمسائگی کی باہم رعایت رکھیں سو درجہ فی نفسہ جائز ہے اور اب بھی اس کے جواز میں کسی کا اختلاف نہیں۔

امر اول کا دوسرا درجہ

مباح اجارات و تجارات و تعلیمات و استعانات و تعلقات حاکمیت و محکومیت کے ہیں۔

امر ثانی کا دوسرا درجہ

وہ اتحاد ہے جس کی غرض ہندوستان کے لئے آزاد حکومت کا حاصل کرنا ہے اس وقت عقلاء و علماء کا ان ہی دو درجوں میں اختلاف ہے پس بعضے تعاون کے اس درجہ کو جائز اور اتحاد کے اس درجہ کو جائز کہتے ہیں یہ تعیین ہے محل اختلاف کی اب اس اختلاف کی حقیقت اور بنا سمجھئے یہ تعاون یا اتحاد شرعاً فی نفسہ نہ واجب ہے' نہ حرام شرعاً امور مباحہ سے ہے چنانچہ اہل علم پر ظاہر ہے یہاں تک تو کوئی اختلاف نہیں آگے بعض کی نظر تو اس عدم تعاون مع الحکومت اور اتحاد مع الہنود کے مصالح و منافع ضروری التحصیل فی زعمہم پر پڑی اور وہ خلافت کمیٹی والے ہیں ان عوارض پر نظر کر کے انہوں نے ان دونوں امر کو واجب و جائز کہا۔ اور بعض کی نظر اس عدم تعاون اور اتحاد کے مضار و مفاسد دینیہ حالیہ و مالیہ ضروری الاجتناب پر پڑی جن کی تفصیل خاص خاص تحریرات میں شائع بھی ہو چکی ہے ان عوارض پر نظر کر کے انہوں نے ان دونوں امر کو ممنوع کہا اور احقر کی بھی یہی رائے ہے اور اسی بناء پر اعلان اول میں اسکو فتنہ کہا تھا یہ حقیقت اور بناء ہے اس اختلاف کی۔ اب اس سے امور ذیل معلوم ہو گئے ہوں گے ایک یہ کہ اس اختلاف کی یہ دونوں شقین قطعی نہیں ہیں ظنی اجتہادی ہیں پس ان

میں اختلاف کی گنجائش ہے گو کوئی چھوٹے درجہ کا طالب علم ہی کسی بڑے عالم کے ساتھ اختلاف کرے محض اس اختلاف سے کسی فریق کو دوسرے فریق پر طعن و لعن یا سب و شتم یا لعنت و ملامت یا تقلیل و تجہیل یا تفسیق و تکفیر یا جبر و تشدد و ظلم و ایذاء بالقول یا بالعمل یا کسی بزرگ کا اس کو مخالف و بے ادب مشہور کر کے بدنام کرے جائز نہیں (بحکم مقدمہ نمبر ۱) البتہ منکرات شرعیہ پر انکار یا تقبیح یہ واجب ہے اور اس میں کسی مسلمان کا اختلاف نہیں دوسرا امر یہ معلوم ہوا کہ اس اختلاف کا منشاء دلائل کا اختلاف نہیں بعض واقعات و عوارض کا اختلاف ہے جسکی شرعی مثالیں مقدمہ نمبر 2 میں مذکور ہو چکی ہیں اور ایک عرفی مثال اور معروض ہے اختلاف دلائل کی مثال ڈاکٹری اور یونانی اصول کا اختلاف ہے اور اختلاف عوارض کی مثال دو یونانی متحد الاصول طبیبوں کا اختلاف اس مریض کے باب میں ہے جو کمزور بھی ہے اور اس میں کسی مادہ فاسدہ کا بھی غلبہ ہے۔ ایک طبیب نے اس پر نظر کی کہ جب تک مادہ کا تنقیہ نہ کیا جاوے گا قوت نہ آوے گی اس لئے سہل تجویز کر دیا دوسرے طبیب نے اس پر نظر کی کہ جب تک قوت کے بقاء کی تدبیر نہ کیجاویگی مسہل ہی کا متحمل نہ ہوگا اس لئے مسہل کو منع کر دیا اب یہ دونوں اسپر متفق ہیں کہ مادیکا تنقیہ بھی ضروری ہے اور قوت کا تبقیہ بھی ضروری ہے مگر پھر بھی عوارض کے سبب دونوں کی رائے میں اختلاف ہو گیا پس یہ اختلاف ان دونوں مسئلوں کا اسی قبیل سے ہے کہ منافع و مضار پر نظر پڑنا اس کا باعث ہو گیا۔

تیسرا امر یہ معلوم ہوا کہ اس عدم تعاون کا نام جو بعض نے ترک موالات رکھ لیا ہے اس عنوان سے اس کا حکم جو اوپر مذکور ہوا بدل نہ جائے گا (بحکم مقدمہ نمبر 3) جیسا بعض نے یہ ترکیب کر رکھی ہے کہ قرآن مجید میں جو موالات کی ممانعت کی آئتیں آتی ہیں۔ اس عدم تعاون کو ان میں داخل کر کے اختلاف کرنے والے فریق کو قرآن کا مخالف بتا کر عوام الناس کو اس سے متوحش و متنفر کرتے ہیں جس طرح عالمین مولد نے اپنی مجالس متعارفہ کا نام مجلس ذکر رسول اللہ ﷺ اور قیام کا نام تعظیم رسول ﷺ رکھ کر اہل حق کی طرف سے عوام کو بدگمان کر دیا کہ یہ ذکر و تعظیم رسول سے منع کرتے ہیں یا امتناع و امکان کے مسئلہ میں اس طرح بدنام کیا کہ یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ بھی جھوٹ بول سکتا ہے پس ایسے ہی اس اصطلاح ترک موالات سے کام لیا جا رہا ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ کوئی نام رکھدینے سے

حقیقت نہ بدل جاوے گی اس لئے حکم بھی نہ بدلے گا باقی ایسی ترکیبوں سے کام لینا اہل علم کی شان کے بالکل خلاف ہے۔ میں نے اپنے نزدیک ان مسائل اور اس اختلاف اور اپنی مسلک کی حقیقت بالکل صاف کردی ہے اگر اس پر بھی کسی کو بدنام کرنے کا شوق ہو تو اس سے زیادہ نہ کہونگا کہ فصبر جميل والله المستعان على ماتصفون

والسلام۔ احقر اشرف علی تھانہ بھون جمادی الاولیٰ ۱۳۳۹ھ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی قدس سرہ اور انکی سیاسی خدمات

آپ دارالعلوم دیوبند کے طالب علم بھی ہیں اور مہتمم بھی۔ اسی چشمہ فیض سے فیض یافتہ بھی ہیں۔ اور فیض رساں بھی عالم و فاضل بھی اور پیر طریقت بھی علم و عرفان کے دریا بھی ہیں اور تحریر و تقریر کے دھنی بھی۔ نظم و نسق کے ماہر بھی ہیں اکثر سفر میں رہتے ہیں۔ متحدہ ہندوستان میں شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں آپ نے پہنچ کر خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام نہ سنایا ہو یا جہاں آپ کی تصنیفات و تالیفات نہ پہنچی ہوں۔

دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا باہمی تعلق

دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہندوستان میں مسلمانوں کے سب سے بڑی تعلیمی ادارے ہیں۔ جو 1857ء کے انقلاب کے بعد یکے بعد دیگرے عالم وجود میں آئے۔ دارالعلوم نے مسلمانوں میں اسلامی علوم کو زندہ کیا۔ اوز مسلم یونیورسٹی نے عصری اور معاشی علوم کی مدد سے مسلمانوں کو دینوی تباہی سے بچایا۔ یہ دونوں ادارے مسلمانوں کے قائم کردہ ہیں اور مسلمانوں کیلئے ہی کام کرتے رہے ہیں۔ مگر دونوں کے درمیان کوئی براہ راست تعلق قائم نہ تھا۔ تحریک خلافت کے زمانے میں حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ مسلم یونیورسٹی میں تشریف لے گئے اور جامعہ ملیہ کی بنیاد ڈالی۔ تو اس موقع پر حضرت مولانا شیخ الہند نے وہ معرکتہ الااء صدارتی خطبہ دیا تھا۔ جو جامعہ ملیہ کا تاسیسی خطبہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر وہی بے تعلقی کا دور شروع ہو گیا۔ 1940ء مسلم یونیورستی علی گڑھ کی انجمن "اسلامی تاریخ و تمدن" کی جانب سے دارالعلوم کے اکابرین کو "اسلامی ہفتہ" کی تقریب میں دعوت دی گئی۔ اس سلسلے کی ابتدا حضرت قاری صاحب مہتمم دارالعلوم سے ہوئی حضرت قاری صاحب نے "اسلام اور سائنس" کے عنوان پر ایک معرکتہ آلاراء عالمانہ و فلسفیانہ تقریر فرمائی۔ جو مسلم یونیورسٹی کے طلباء و اساتذہ کے حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔ دوسری تقریر "اسلامی تہذیب و تمدن کے عناصر ترکیبی" پر ہوئی۔ اس تقریر کو بھی بہت پسند کیا گیا۔

پہلی تقریر مسلم یونیورسٹی کی انجمن کی طرف سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔ ان تقریروں کا یہ اثر ہوا کہ یونیورسٹی میں علماء کے خلاف جو علمی استخفاف اور بد ظنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دور ہو گئی۔ اس وقت سے اب تک دارالعلوم اور یونیورسٹی کے تعلق میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اور ان دونوں علمی اداروں کے مابین جو بعد واقع تھا۔ وہ ختم ہو چکا ہے۔

انسداد ارتداد مسلمانان دہرہ دون:

دہرہ دون کے نواحی علاقے میں فساد کے بعد مسلمانوں کے ارتداد کا فتنہ زور پکڑ گیا۔ دارالعلوم سے اس فتنے کے انسداد کیلئے مبلغ بھیجا گیا اس مبلغ نے دہرہ دون کو مرکز قرار دیکر دیہات کا دورہ کیا۔ مبلغ کے بروقت پہنچنے سے وہاں کے مسلمانوں کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ مبلغ نے وہاں کے مسلمانوں کو دوبارہ بسانے اور آباد کرنے میں بڑی ہی تن دہی کا ثبوت دیا۔ ان کی جدوجہد سے بہت مرتدین اسلام میں واپس آگئے۔ دیہاتی مسلمانوں میں ہمت واستقلال اور خود اعتمادی سے فسادات کا مقابلہ کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ جو لوگ خوف وہراس کے باعث ترک وطن کر چکے تھے۔ وہ دوبارہ اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔

1368ھجری/1949 مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کورٹ کیلئے علمائے دیوبند کا انتخاب

دیوبند اور علی گڑھ کے مابین عرصے سے جو بعد چلا آرہا تھا۔ وہ 1359 ہجری مطابق 1940ء میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی یونیورسٹی میں تقریریوں کی وجہ سے ختم ہو گیا چنانچہ پہلا موقع تھا کہ مسلم یونیورسٹی کورٹ کیلئے علماء دیوبند کو منتخب کیا گیا۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب۔ مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب' اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا کورٹ کی رکنیت کیلئے انتخاب عمل میں آیا۔ اور اس طرح دونوں عظیم تعلیمی اداروں میں تعاون کی راہیں کھل گئی۔

دارالعلوم کی تلاشی اور احکام عیدالاضحیٰ کی ضبطی

ایک سال عیدالاضحیٰ کے موقع پر حکام کی مداخلت سے دارالعلوم کے ساتھ اہانت آمیز واقع پیش آیا۔ اس سال عیدالاضحیٰ سے قبل ذی الحج کو دارالعلوم کی تلاشی لی گئی۔ ایک مقامی پولیس آفیسر اور تیس پچیس مسلح کانسٹیبلوں کے ساتھ دارالعلوم کے دروازے پر پہنچا

اور ادارہ اہتمام کی کسی رکن سے اجازت اور اخلاقی تقاضوں سے کام لئے بغیر جو اس قسم کے مواقع پر ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ دفتر اہتمام کی تلاشی لیکر عید الاضحیٰ کے ان مطبوعہ احکام رسائل پر قبضہ کرلیا۔ جن میں قربانی کے احکام درج تھے۔ قربانی کے احکام چندے کی اپیل کے ساتھ سالہا سال سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس سے پہلے اس پر کبھی بھی اعتراض نہیں کیا گیا۔ اس مرتبہ حکام کے نزدیک اشتہار کے مضمون کا وہ حصہ خاص طور سے قابل اعتراض تھا۔ جسمیں قربانی کے جانوروں کے ساتھ گائے کا ذکر تھا۔ ان کے نزدیک گائے کے ذکر کے یہ معنی تھے۔ کہ دار العلوم کی طرف سے حکومت کے احکام کے خلاف قربانی کی ترغیب دی گئی۔ حکام کو بتلایا گیا کہ گائے کا ذکر بطور مسئلہ کے کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس میں اونٹ کی قربانی کا ذکر بھی موجود ہے۔ حالانکہ پورے ہندوستان میں اونٹ کی قربانی کہیں بھی نہیں ہوتی۔ نیز اسمیں یہ نوٹ بھی موجود ہے۔ کہ بحالات موجودہ مسلمان وقت کے مصالح کے پیش نظر گردو پیش کے ملکی حالات کو ملحوظ رکھیں۔ ایسے طریقے نہ اختیار کئے جائیں۔ جس سے امن و امان میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو۔ دار العلوم دنیائے اسلام کے مسلمانوں کا مرکزی دینی ادارہ ہے۔ یہ شرعی احکام ہیں جن کا بیان کرنا دار العلوم کا فریضہ ہے۔ یہ رسائل ہندوستان سے باہر بھی بڑی تعداد میں ارسال کئے جاتے ہیں۔ جہاں گائے کی قربانی پر پابندی نہ ہے۔ خود ہندوستان میں بھی بہت سے ایسے مقامات ہیں۔ جہاں گائے کی قربانی ممنوع نہ ہے۔ مگر حکام کا اصرار بدستور باقی رہا۔ چنانچہ ان کی اصرار پر ایک مزید اعلان شائع کرایا گیا۔ کہ جن مقامات پر حکومت کی جانب سے گائے کی قربانی پر پابندی ہے۔ وہاں ملک کے موجودہ حالات اور آپس کے میل میلاپ کیلئے گائے بیل اور بچھڑے کی قربانی سے احتراز کیا جائے۔ نیز حکومت کے احکام کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔ آج یہی ہندوستان ہے جو گائے کی کھالوں کو برآمد کر کے زرمبادلہ کما رہا ہے۔ ملک میں حکام کے اس توہین آمیز اقدام پر جا بجا احتجاجی جلسے کئے گئے اور اخبارات کے ذریعے اس فعل کی مذمت کی گئی۔

پاکستانی طلباء کے داخلے میں حکومت ہند کا تعاون

قیام پاکستان کے بعد دار العلوم میں پاکستانی طلباء کی آمد و رفت بالکل بند ہو گئی۔ دار العلوم کی شہرہ آفاق مرکزیت کے پیش نظر پاکستانی طلباء دار العلوم میں داخلے کے لئے بے

چین تھے۔ اور اس کام کیلئے درخواستوں پر درخواستیں چلی آرہی تھیں۔ چنانچہ اس صورت حال کو حکومت کے سامنے پیش کیا گیا۔ وزارت تعلیم نے پاکستانی طلباء کیلئے ایک سال کی اجازت دی۔ اور ایک سال گذرنے کے بعد صوبائی حکومت نے مزید توسیع کرائی جا سکتی تھی۔ مگر اس اجازت کے باوجود حکومت کے دفتری ضوابط کی وجہ سے زیادہ عرصے تک یہ سلسلہ چل نہ سکا۔

مستشرقین کی کانگریس میں دارالعلوم کی شرکت

مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کا چھبیسواں اجلاس جنوری 1964ء کی شروع تاریخوں میں منعقد ہوا۔ جسمیں گیارہ سو ماہرین شرقیات نے شرکت کی۔ ان میں پانچ سو بیرونی ممالک کے نمائندے شریک تھے۔ اور چھ سو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور علمی اداروں کے فضلاء شامل تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس کانگریس کا اجلاس یورپ سے باہر ایشیاء میں ہوا۔ سب سے پہلے یہ فخر ہندوستان کے دارالحکومت دہلی کو حاصل ہوا۔ اکانگریس کے ابتدائی سالوں میں اسکی مجلسوں میں شرکت صرف یورپی ماہرین شرقیات تک محدود تھی۔ رفتہ رفتہ اس کے دائرے میں توسیع ہوتی گئی۔ اور ایشیائی ملک بھی اسمیں شامل ہو گئے۔ دہلی میں کانگریس کا اجلاس وگیان بھون کی عظیم الشان عمارت میں منعقد ہوا۔ یہ کانگریس دس شعبوں پر مشتمل تھی۔ اس میں ایک شعبہ نوادر مخطوطات کیلئے مخصوص تھا۔ انڈین انسٹیٹوٹ آف اسلامک سٹڈیز نئی دہلی کی درخواست پر دارالعلوم کے منتخب مخطوطات اس موقع پر پیش کئے گئے۔ مستشرقین نے ان کو خاص طور پر پسند کیا۔ اور کئی مخطوطات کے نوٹس لئے۔ اسطرح مستشرقین کی یہ کانگریس دارالعلوم کیلئے وسیع طور پر بین الاقوامی تعارف کا ذریعہ ثابت ہوئی۔

مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کی جدوجہد

اکابر دارالعلوم کو جونہی یہ معلوم ہوا۔ کہ حکومت ہند مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کرنا چاہتی ہے۔ تو اکابر دارالعلوم نے اس پر پوری توجہ مرکوز کر دی۔ علماء نے ملکر اس مسئلہ پر میمورنڈم تیار کیا۔ جو دس دفعات پر مشتمل تھا۔ نومبر 1917ء میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب" مہتمم دارالعلوم دیوبند کی سربراہی میں ایک وفد دہلی پہنچ کر وزیر ہند سے ملا۔ اور

میمورنڈم پیش کیا۔ جسمیں ظاہر کردیا گیا تھا۔ کہ مسلمانوں کے عائلی مسائل میں گورنمنٹ کوئی ایسا ایکٹ وضع نہ کرے۔ جو شرعی قوانین سے متصادم ہو۔ ایسا قانون ہمارے لئے ہرگز قابل قبول نہ ہوگا۔ اس میمورنڈم میں دو بنیادی مطالبے تھے۔ کہ ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کے اجراء کیلئے محکمہ قضاء قائم کیا جائے۔ چونکہ شرعی اصول پر بہت سے مسائل کی تنقید کیلئے مسلم حاکم شرط ہے۔ اس لئے قاضیوں کا تقرر اہل سنت سے ہو۔ اس کونسل میں ہر فرقے کے علماء نمائندے ہو۔ اور مسائل کا فیصلہ ہر فرقے کے اپنے فقہی اصول پر ہو۔ دوسرا یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی شعائر مساجد و مدارس مقابر۔ اوقاف خانقاہوں اور دوسرے دینی رفاہ عام کے تحفظ و نگرانی اور نظم و نسق کیلئے شیخ الاسلام کا عہدہ قائم کیا جائے۔ جو ان تمام شعائر کو تنظیم کے ساتھ چلانے کا ذمہ دار ہو۔ ان مطالبات پر اس دور کے تقریباً پانچ سو علماء کے توثیقی دستخط حاصل کیئے گئے۔ جواب تک دار العلوم کے محافظ خانہ میں محفوظ ہیں۔ اس کے بعد 1929ء میں ہندوستان میں مسلم اوقاف کی تنظیم کا مسئلہ اٹھا۔ جو مسلم پرسنل لا ہی کا ایک جز تھا۔ گورنمنٹ نے ایک کمیٹی مقرر کی۔ جس نے استفساری سوالات ملک کے مختلف حلقوں میں ارسال کیئے۔ اس پر وقف کے مسائل کی تفصیلات مرتب کرائی گئیں۔

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی کی قیادت میں وقف بل کے مسودے پر شریعت اسلامی کے نقطہ نظر سے تنقید کرتے ہوئے پیش کردہ اشکالات کا تحریری حل پیش کیا گیا۔ اور ساتھ ہی ایک تحریر بنام "الانصاف فی قانون الاوقاف" مرتب کی گئی۔ جس پر تمام اکابر علماء کے دستخط ثبت ہوئے۔ اس سلسلے میں وقت کی مناسبت سے تمام ساعی عمل میں لائی گئی۔ پھر برطانوی حکومت ہی کے زمانے میں ساردا ایکٹ کا مسئلہ اٹھا جو پرسنل لا ہی کا ایک جز تھا۔ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی نے ایک مستقبل رسالہ ساردا بل کے بنیادی محرکات و نکاح کی عمر کے متعلق شرعی قانون میں ترمیم کیئے جانے کی تردید کے ساتھ لکھا۔ جسمیں پیش آمدہ مشکلات کا حل پیش کیا گیا تھا۔ قیام پاکستان سے قبل علماء دیوبند کی طرف سے حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی نے ایک کتاب الحیلتہ الناجرہ شائع کرائی۔ جسمیں ظالم خاوندوں سے بے کس اور بے بس عورتوں کی گلو خلاصی کی شرعی صورتیں پیش کی گئیں اس سلسلہ میں دار العلوم دیوبند میں علماء کی ایک کمیٹی قائم کی گئی۔ جس نے ان ہی شرعی اصولوں

کی روشنی میں فیصلے کر کے سینکڑوں عورتوں کو رہائی دلائی اور ان کی مشکلات کا قرار واقعی حل نکالا۔ تقسیم ملک کے بعد گورنمنٹ کی طرف سے تنسیخ زمینداری کا مسئلہ اٹھا۔ جسکا اثر اوقاف کی زمینوں پر بھی پڑا۔ جو پرسنل لاء ہی کا بنیادی جز تھا۔ اس بارے میں ایک وفد مولانا ابوالکلام آزاد سے ملا۔ جسکی قیادت حضرت مولانا قاری طیب صاحب نے فرمائی۔ پھر دوبارہ یہی وفد لکھنؤ جا کر اوقاف سے اس مسئلہ میں بحث و تمحیص کی۔ عائلی قوانین کے مشترک منصوبے کو خلاف شرعی ہونے کی وجہ سے بڑی قوت سے چیلنج کیا گیا۔ مضامین اور مقالات شائع کیے گئے۔ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز عالم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب۔ سابق مفتی دارالعلوم دیوبند نے ایک مطبوعہ رسالہ بنام "ہمارے عائلی مسائل" شائع کیا۔ جسمیں معقول انداز سے ان کا شرعی حل پیش کیا گیا۔

مرزائیت کے خلاف جہاد

حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا قاری طیب صاحب۔ اعلان حق کی آواز بلند کرنے کیلئے کئی دفعہ قادیان تشریف لے گئے۔ اور وہاں کئی پبلک جلسے کئے۔ مرزائیوں نے حکام سے ملکر بہت کوشش کی۔ کہ ان جلسوں پر پابندی لگا دی جائے۔ مگر یہ جلسے جس متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ہوئے تھے۔ اسکی بناء پر پابندی کا کوئی جواز نہ تھا۔ جب قادیانی اپنے منصوبے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ تو حضرت شاہ صاحب اور حضرت قاری صاحب کو دھمکی آمیز خطوط ارسال کرتے رہے کہ اگر تم یہاں آئے تو قتل کر دیئے جاؤ گے اور واپس نہ جاسکو گے اور یہ صرف دھمکی ہی نہ ہوتی تھی بلکہ کئی دفعہ عملاً کوشش بھی کی گئی۔

مخدوم العلماء حضرت مولانا اطہر علی صاحب سلہٹیؒ اور انکی سیاسی خدمات

حضرت مولانا اطہر علی صاحب سلہٹ (مشرقی پاکستان حال بنگلہ دیش) کے رہنے والے تھے۔ آپ نے اپنے علاقہ میں سیاسی' مذہبی' اصلاحی بڑے ہی وسیع پیمانے پر خدمات انجام دیں۔ آپ تحریک آزادی اور جنگ پاکستان میں بھی بھرپور حصہ لیا۔اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی۔ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی کا بھرپور ساتھ دیا۔ آپ نے سلہٹ کے ریفرنڈم میں بڑا کردار ادا کیا۔ آپ نے اپنے علاقے کے لوگوں کی ایسی ذہن سازی کی کہ جب حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی ریفرنڈم کے سلسلہ میں وہاں پہنچے تو انہیں کسی بھی مشکل کا سامنانہ کرنا پڑا۔ قائداعظم محمد علی جناح سلہٹ اور سرحد کے ریفرنڈم کے سلسلہ میں سخت پریشان تھے۔ مسلم لیگ اور قائداعظم ہر صورت میں ریفرنڈم کو جیتنا چاہتے تھے۔ لیکن بادی النظر میں اسمیں کامیابی کے دور دور تک کوئی آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔ قائداعظم نے علامہ حضرت شبیر احمد عثمانی اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی سے ریفرنڈم میں کامیابی کیلئے ساتھ دینے کی درخواست کی۔

پریشانی کے عالم میں قائداعظم یہ درخواست کرتے وقت آبدیدہ ہوگئے۔ لیکن دونوں علماء کرام نے توکل علی اللہ ریفرنڈم جتوانے کا دعدہ کرلیا۔چونکہ ان دونوں کو یقین تھا کہ وہ اسلام کیلئے مخلص ہیں۔اور وہ اس محاذ پر کامیاب ہو جائیں گے۔ حضرت مولانا اطہر علی کو بہت پہلے سلہٹ روانہ کردیا گیا۔ تاکہ وہ وہاں جاکر حالات کا جائزہ لیں۔اور زمین کو ہموار کریں۔ مولانا نے وہاں پہنچ کر اتنی شاندار خدمات انجام دیں کہ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی کو کسی بھی مشکل کا سامنانہ کرنا پڑا۔ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی جس وقت سلہٹ پہنچے اس وقت جمیعتہ العلماء ہند کے ارکان میدان پر چھا چکے تھے۔پاکستان کی مخالفت میں در و دیوار پر ان کے اشتہار چسپاں ہوچکے تھے۔ مگر ان کے وہاں پہنچ کر صرف چار تقریریں کرنے سے ہوا کا رخ تبدیل ہوگیا۔ مخالین نے نہ صرف پاکستان کی مخالفت ترک کردی۔ بلکہ حامیان پاکستان

سے اتحاد کرلیا۔ گہرائی کی نظر سے اگر دیکھا جائے تو سلہٹ ریفرنڈم کے جیتنے کا سہرا حضرت مولانا اطہر علی کو جاتا ہے۔ جسکی وجہ سے قائداعظم اتنے پریشان تھے۔ کہ آپ نے چند دنوں میں انکی پریشانی کا ازالہ کردیا۔ 1949ء کے عام الیکشن میں جب پورے ملک میں روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ عام ہو چکا تھا۔ قریب تھا کہ پورے ملک میں سوشلزم چھا جائے۔ آپ نے مرکزی جمعیت العلماء اسلام کے ٹکٹ پر مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کے ساتھ ملکر سوشلزم کا راستہ روک دیا۔

مخدوم الامت حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ (امرتسری)

اور انکی سیاسی خدمات

متحدہ ہندوستان میں پاکستان کے نام پر لڑنے جانے والے الیکشن جب قریب آگئے۔ تو وقت کی نزاکت کے پیش نظر حضرت مفتی صاحبؒ۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ و مقتدر علماء اسلام نے محسوس کیا۔ کہ مطالبہ پاکستان کیلئے علماء کو اپنا مستقل مرکز قائم کرنا چاہئے چنانچہ اکتوبر 1945ء محمد علی پارک کلکتہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کی زیر صدارت آل انڈیا جمعیت علمائے کانفرنس ہوئی جسمیں پورے ہندوستان سے تقریباً پانچ سو علماء و مشائخ نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں جمعیت علماء اسلام کا قیام عمل میں آیا۔ اور شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ کو اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ حضرت علامہ عثمانی صاحبؒ ان دنوں بیمار تھے اس وجہ سے کانفرنس میں شرکت نہ کر سکے۔ یہ زمانہ تحریک پاکستان کیلئے بڑا ہی نازک تھا۔ کیونکہ اسمیں نشلیسٹ مسلمان' جماعت اسلامی' جمعیت علمائے ہند۔ خدائی خدمت گار' خاکسار اور تقریباً سب مسلمان جماعتیں کانگرس کی تائید اور مطالبہ پاکستان کی مخالفت کر رہی تھیں۔ جمعیت علماء اسلام کے قیام کے فوراً بعد مسلم لیگ کی امداد اور مطالبہ پاکستان کی حمایت میں اپنے اپنے حلقوں میں طوفانی دورے شروع کر دیئے۔ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب مولانا حضرت ظفر احمد عثمانی صاحب' مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے تو ملک کے طول و عرض میں پھیل کر مسلم لیگ کی حمایت کی۔ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ نے اپنے پاؤں کی تکلیف کی وجہ سے دور دراز کے سفر تو نہ کر سکے۔ لیکن اپنی حلقہ میں آپ نے کھل کر مختلف جلسوں میں مطالبہ پاکستان کی حمایت اور مسلم لیگ کی تائید کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ یہ الیکشن بھاری اکثریت سے جیت گئی۔ مسلم لیگ کو یہ جیت جمعیت علماء اسلام کی جدوجہد سے ہوئی۔ جس کا اعتراف خان لیاقت علی خان نے اپنے مکتوب نمبر 5050 مورخہ 17 دسمبر 1945ء میں کیا ہے۔ آخر جمعیت علماء اسلام کی جدوجہد رنگ لائی اور 14 اگست

1947ء کو پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امر تسر سے ہجرت فرما کر لاہور تشریف لے آئے۔ اور 24 ستمبر 1947ء کو آپ نے مول چند بلڈنگ نیلا گنبد میں جامعہ اشرفیہ کی بنیاد رکھی جسکی نسبت انہوں نے اپنی روحانی مرشد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی جانب کی۔ اور حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے اپنے ایک شعر میں اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا۔

یادگار مولوی معنوی

حضرت مولانا مولوی اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ

پاکستان بن گیا۔ حضرت قائداعظم جلد ہی اس دنیا سے انتقال فرماگئے۔ مسلم لیگ کے بڑے بڑے لیڈران اسلام نظام کے بارہ میں کیے گئے وعدوں سے منحرف ہوگئے۔ لیکن جمعیت علماء اسلام نے اسلامی نظام کے متعلق اپنی کوششوں کو جاری رکھا۔ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی و دیگر علماء کرام نے مسلم لیگی لیڈروں سے ملاقاتیں کیں۔ آخر مارچ 1949ء علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کی کوشش سے قرارداد مقاصد ستور ساز اسمبلی سے منظور ہوئی۔ 1950ء میں لیاقت علیخان نے ایک دستور پیش کیا جسکو ملت اسلامیہ نے تسلیم نہ کیا۔ اس پر وزیراعظم خان لیاقت علیخان نے حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی سے یہ کہا کہ میرے دستور کو تو آپ لوگوں نے رد کردیا۔ اب آپ خود ہی بتائیں کہ کون سا دستور بنایا جائے بریلوی دستور۔ دیوبندی دستور یا پھر شیعہ دستور۔ حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی نے لیاقت علیخان کے اس چیلنج کے جواب میں ہر مکتب خیال کے 31 علماء جن میں حضرت مفتی محمد حسن صاحب جامعہ اشرفیہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور آپ کے خلفا میں حضرت مولانا شمس الحق افغانی کراچی میں اکٹھے کیے۔ ان دستوری سفارشات میں حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ اس زمانہ میں آپ نے بیماری کی شدت کے باوجود کراچی کا اتنا لمبا سفر صرف پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کیلئے کیا۔ جو کہ آپ کا بہت بڑا مجاہدہ تھا۔ اس اجلاس کے کچھ عرصہ بعد چند علماء کرام نے کراچی میں اپنے ایک اجلاس میں غور و فکر کے بعد کچھ اصولوں کی وضاحت فرمائی۔ کہ اسلامی اصولوں کے مطابق پاکستان میں حکومت کا قیام ممکن نہیں نیز یہ کہ ہر مکتب فکر کے علماء کی یہ متفقہ رائے ہے کہ پاکستان کی فلاح و بہبود کیلئے اسلام کے بنیادی اصولوں پر عمل پیرا ہونا انتہائی ضروری ہے۔ نومبر 1952ء میں اس وقت کے وزیراعظم خواجہ نظام الدین نے

دستوری مسائل پر غور و فکر کیلئے جن علماء کو کراچی میں مدعو کیا ان میں سر فہرست حضرت مولانا مفتی محمد حسن کا نام تھا۔ جناب حضرت مفتی صاحب نے پاؤں کی شدید تکلیف اور سرد ترین موسم کے باوجود کراچی کا سفر کیا۔ حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کی سرکردگی میں علماء کا یہ قافلہ وزیر اعظم کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ وزیر اعظم نے اپنی کوٹھی سے باہر نکل کر بڑی ہی محبت سے شایان شان استقبال کیا۔ حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی نے فرداً فرداً سب علماء کا تعارف کرایا۔ اس اجلاس میں جو علماء کرام اور وزراء شریک ہوئے ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

علمائے کرام

1۔ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب۔ امر تسریؒ
2۔ حضرت مولانا خیر محمد صاحب۔ جالندھریؒ
3۔ حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ
4۔ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ
5۔ حضرت مولانا مفتی اشفاق الرحمٰن کاندھلویؒ
6۔ حضرت مولانا اطہر علی سلہٹیؒ مشرقی پاکستان
7۔ حضرت مولانا شمس الحق فریدپوری۔ ڈھاکہ مشرقی پاکستان۔
8۔ حضرت مولانا عبد الحق صاحب رکوڑہ خٹک
9۔ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ

وزراء کرام

1۔ خواجہ ناظم الدین صاحب۔ وزیر اعظم پاکستان
2۔ سردار عبد الرب نشتر۔ مرکزی وزیر
3۔ مولوی تمیز الدین

اس کے علاوہ بعض دوسرے وزراء بھی اپنے اپنے سیکرٹریوں سمیت اس اجلاس میں شریک ہوئے یہ اجتماع ایک خاص کمرے میں ہوا درمیان میں ایک لمبا میز تھا۔ جس کے ایک طرف علماء کرام اور دوسری طرف وزراء کرام بیٹھے تھے۔ وزیر اعظم نے قرآن و سنت پر مبنی

دستور پر بعض اشکالات پیش کیۓ وزیراعظم کی ترجمانی سردار عبدالرب نشتر اور مولوی تمیزالدین کرتے تھے۔ علماء کی طرف سے مدلل جواب دیئے جاتے رہے۔ اس کی تفصیل کے فرائض حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی سرانجام دیتے تھے۔ آخر میں علماء کرام نے شرعی دستور مرتب کرنے پر زور دیا۔ اور اس کے سیاسی ملکی اور ملی فوائد بیان فرمائے۔ جن سے وزراء کرام بہت متاثر ہوئے۔ اور علماء کرام بہت قوی امید لیکر فارغ ہوئے۔ بہت امید تھی کہ یہ مجوزہ دستور اسمبلی میں پاس ہو جائے۔ لیکن 17 اپریل 1954ء کو دستوری اور جمہوری روایات کے خلاف خواجہ نظام الدین اور انکی کابینہ کو ملک غلام محمد گورنر جنرل نے برطرف کر دیا۔ جبکہ مجلس قانون ساز کی اکثریت خواجہ صاحب کے ساتھ تھی، لیکن قادیانی مسئلہ میں عوام خواجہ صاحب کے خلاف تھی۔ کیونکہ وہ قادیانیوں کے متعلق نرم گوشہ رکھتے تھے۔ گورنر جنرل نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ اقدام کیا۔ چنانچہ جو دستور تیار ہوا تھا وہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔

جمعیت علمائے اسلام

1949ء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی کا انتقال ہو گیا۔ حضرت علامہ صاحب کے انتقال کے بعد جمعیت العلمائے اسلام کا شیرازہ بکھر گیا۔ باہمی متحد العقائد علماء کرام کا یہ اختلاف اہل علم حضرات کیلئے بہت تکلیف دہ تھا۔ اس لئے حضرت مولانا احمد علی لاہوری کی تحریک سے باہمی اتحاد کی صورت پر غور کیا گیا۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا خیر صاحب جالندھری کا نام گرامی تجویز ہوا چنانچہ 16 دسمبر 1954ء کو حضرت موصوف حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب۔ حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب۔ جمعیت العلمائے اسلام کے ذمہ دار حضرات کو دعوت دیکر کراچی میں جمع کریں اور پھر اس کی اتحاد کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب 18 فروری 1955ء کو حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مہتمم مدرسہ قاسم العلوم ملتان کی ہمراہی میں کراچی تشریف لے گئے اور مندرجہ ذیل حضرات کو وہاں جمع فرمایا۔

1۔ حضرت مولانا اطہر علی "کشور گنج" مشرقی پاکستان

2۔ حضرت مولانا صلاح الدین صاحب
3۔ حضرت مولانا شرف الدین صاحب
4۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی
5۔ حضرت مولانا محمد متین خطیب صاحب
6۔ حضرت مولانا پیر غلام مجدد صاحب کراچی
7۔ حضرت مولانا دلدار علی صاحب
8۔ حضرت مولانا سید محمد داؤد صاحب غزنوی
9۔ حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری

کافی بحث و تمحیص کے بعد یہ طے ہوا کہ جمعیت العلمائے اسلام کے کل پاکستان کے صدر حضرت مولانا مفتی اور محمد حسن صاحب ہو گے۔ حضرت مفتی صاحب کا نام آتے ہی سب کا اتفاق ہو گیا۔ اور ہر شخص آپ کی صدارت پر متفق ہو گیا۔

چند روز بعد حضرت مفتی صاحب کے مکان پر جمعیت العلماء اسلام کا دوبارہ اجتماع ہوا۔ جسمیں ذمہ دار حضرات کے علاوہ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہور' حضرت مولانا شیر محمد صاحب سندھی' حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی' حضرت مولانا محمد متین خطیب صاحب اور حضرت مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی شریک ہوئے۔ اسمیں کل پاکستان جمعیت العلمائے اسلام کا انتخاب ہوا اور مندرجہ ذیل حضرات منتخب ہوئے۔

1۔ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب۔ صدر۔
2۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہور۔ نائب صدر
3۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب۔ دیوبندی۔ نائب صدر
4۔ حضرت مولانا متین الخطیب صاحب ناظم

لیکن حضرت مفتی صاحب اپنی شدید بیماری کی وجہ سے جمعیت کے کام کو سر انجام نہ دے سکے۔ چنانچہ حضرت شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحب لاہوری کی صدارت میں جمعیت کی تشکیل ہوئی اور حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی نظام عمومی مقرر ہوئے۔ حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی نے پورے ملک کا دورہ کیا۔ اور جگہ جگہ جمعیت العلمائے اسلام کا قیام عمل میں آیا۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی اور انکی سیاسی خدمات

شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی نے جنگ پاکستان میں بالعموم اور سلہٹ کے ریفرنڈم میں بالخصوص بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا۔ ریفرنڈم کے دوران جہاں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صوبہ سرحد میں مصروف جہاد تھے۔ وہاں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی سلہٹ میں مصروف عمل تھے۔ کیونکہ ان دونوں محاذوں کے مخصوص حالات کے پیش نظر قائداعظم نے انکی کمان علی الترتیب ان کے سپرد کرر کھی تھی۔ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی جس وقت سلہٹ پہنچے۔ اس وقت جمعیت اعلماء ہند کے ارکان میدان پر چھا چکے تھے۔ پاکستان کی مخالفت میں در و دیوار پر ان کے اشتہار چسپاں ہو چکے تھے۔ مگر ان کے وہاں پہنچ کر صرف چار تقریریں کرنے سے ہوا کارخ تبدیل ہو گیا۔ مخالفین نے نہ صرف پاکستان کی مخالفت ترک کر دی۔ بلکہ حامیان پاکستان سے اتحاد کر لیا۔ جس سے ہندوؤں کو سخت صدمہ پہنچا۔ اور انہوں نے ریفرنڈم کے دوران بڑی گڑ بڑ کی۔ یہاں تک کئی ہندو آفیسر اور ہندو عورتیں گرفتار کر لی گئیں۔ مگر ان ریشہ دوانیوں کے باوجود ریفرنڈم کا نتیجہ پاکستان کے حق میں رہا۔ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی کی طرح حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی بھی قائداعظم کو تبلیغی خطوط لکھتے رہتے تھے جن کا باقاعدہ انگریزی ترجمہ ساتھ ارسال کیا جاتا تھا۔ تاکہ ان کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ پاکستان بننے کے بعد جب سکہ اور ٹکٹ وغیرہ کے اجراء کا سوال پیدا ہوا۔ تو بعض نافہموں نے ان پر قائداعظم کی تصویر چھاپنے کی تجویز پیش کی۔ جسے قائداعظم سے عقیدت کی بناء پر منظور کیا جارہا تھا۔ لیکن حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی۔ حضرت ظفر احمد عثمانی۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی نے ارباب اختیار کو اس مسئلہ کے شرعی پہلو کی طرف توجہ دلائی۔ اور انہیں اس خلاف شرعی فعل سے باز رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ بھی علماء کرام کے ساتھ دستور اسلامی کی تاسیس میں کوشاں رہے۔ اور بعض امور میں ارباب اقتدار ان کے صلاح و مشورہ کرتے رہے۔ بلکہ مشرقی پاکستان کے انتخاب کے سلسلہ میں ان کو خصوصی طور پر امداد حاصل کی گئی۔ اور خواجہ شہاب الدین وزیر داخلہ کی زیر سرکردگی 1949ء میں جو وفد حجاز گیا۔ اس کا بھی انہیں رکن بنایا گیا۔ تحریک پاکستان کے متعلق آپکی خدمات کے اعتراف میں مشرقی پاکستان ڈھاکہ میں پاکستانی پرچم آزاد فضاء میں لہرانے کا آپ کو ہی شرف حاصل ہوا۔

رائس الاتقیاء حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری اور انکی سیاسی خدمات

حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری مدرسہ خیر المدارس جالندھر کے مہتمم تھے۔ آپ نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ آپ کانگریس کے مخالف اور مسلم لیگ کے زبردست حامی تھے۔ 1364 ہجری میں اراکین مجلس دعوۃ الحق بمبئی کے استفناء کے جواب میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی دیوبند نے کانگریس کی مخالفت مسلم لیگ کی حمایت میں فتویٰ دیا تھا۔ وہ فتوی ماہ نومبر 1945ء کو شائع ہوا۔ یہ فتویٰ کانگریس کیلئے ایٹم بم ثابت ہوا۔ اس پر حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، علامہ سید سلیمان ندوی۔ حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی، مولانا شبیر علی تھانوی کے علاوہ مولانا حضرت خیر محمد صاحب جالندھری کی تصدیق ثبت تھی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ بے سرو سامانی کے عالم میں ملتان تشریف لائے۔ ملتان میں آپ نے ایک مندر میں خیر المدراس کا دوبارہ اجراء کیا۔ جس سے ہزاروں طالبات اور تشنگان طریقت مستفید ہونے لگے۔ حاسدین نے مدرسہ کو نقصان پہنچانے کے لئے اور اہل مدرسہ کو بدنام کرنے کے لئے یہ مشہور کردیا کہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب کا تعلق جماعت احرار ہے۔ جو نظریہ پاکستان کی مخالفت تھی۔ اور ان لوگوں نے مدرسہ کی شکل میں یہاں اپنا خفیہ اڈہ قائم کر رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں نے ارباب مسلم لیگ کی مدد سے مدرسہ کی عمارت خالی کرانے اور مولانا موصوف کو شہر بدر کرانے کی مہم بھی شروع کردی۔ حالانکہ یہ الزامات قطعاً بے بنیاد تھے۔ حضرت مولانا خیر محمد صاحب نے وہی رسالہ ارباب اقتدار کو دکھلا کر ان کے ڈھول کا پول کھول دیا۔ جس سے ان کی تمام امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ درس و تدریس کی مصروفیت اور تحریک پاکستان کے زمانہ میں طویل سفروں کی صعوبت برداشت کرتے دیکھ کر ان کے متعلق حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی نے فرمایا تھا۔ کہ "انجن تو چھوٹا سا ہے، مگر گاڑیاں بہت سی کھینچے لا رہا ہے۔" جمعیت العلماء اسلام نے ایک دفعہ لیبر پارٹی سے انتخابی اتحاد کیا۔ تو اس پر بعض جید علماء کرام کی طرف سے شدید رد عمل ہوا۔ مرکزی جمعیت العلماء اسلام کا قیام بھی اسی رد عمل کا نتیجہ تھا۔ اس کے نتیجہ میں جانبین سے کچھ بے اعتدالیاں بھی ہوئیں۔ حضرت

مولانا محمد ادریس کاندھلوی کو بعض غیر ذمہ دار ارکان نے ایسی باتیں سنائیں کہ ملتان کے سالانہ جلسہ میں انہوں نے حضرت مولانا مفتی محمود صاحب کے سیاسی طرز عمل پر شدید نکتہ چینی کا ارادہ کیا۔

حضرت والا کو اس بات کا علم ہوا۔ تو مسکرا کر ان سے فرمایا کہ مفتی صاحب کو میں زیادہ جانتا ہوں۔ چونکہ ان کے قریب ہوں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا کاندھلوی صاحب نے آپ کے فرمانے پر اپنا ارادہ منسوخ کر دیا۔ حضرت والا کا ایک عظیم کارنامہ "وفاق المدارس العربیہ" کی تشکیل ہے۔ قیام پاکستان کے عام مسلمانوں کی رشد و اصلاح و دینی راہنمائی کے لئے شہروں اور دیہات میں متعدد دینی مدرسے اور مدارس قائم ہوئے۔ لیکن یہ سینکڑوں ادارے بکھرے ہوئے تھے۔ جو کہ اپنی اپنی جگہ تابناک تو ضرور تھے لیکن اجتماعی طور پر انہیں کوئی قابل ذکر مقام حاصل نہ تھا۔ حضرت والا نے اس کمزوری کو محسوس فرمایا اور خیر المدارس کی مجلس شوریٰ کے اجلاس منعقدہ 20 شعبان 327 ھجری مطابق 23 مارچ 1957ء میں یہ تجویز پیش فرمائی کہ تمام مدارس عربیہ میں ارتباط و انضباط اور معیار تعلیم اور امتحانات میں یکسانیت کیلئے عملی قدم اٹھایا جائے۔ اس تجویز کی طرح افادیت و اہمیت کے پیش نظر اکابر علماء نے اسکی توثیق فرمائی۔ حضرت مولانا شمس الحق افغانی نے اس تجویز کو خصوصیت کے ساتھ سراہا۔ چنانچہ اجلاس میں موجود حضرات حضرت مولانا شمس الحق افغانی حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی حضرت مولانا مفتی محمد عبداللہ، حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جس کے ذمہ ابتدائی مراحل کی تیاری اور اسے عملی جامہ پہنانے کا کام تھا۔ آج وفاق المدارس العربیہ کی لڑی میں ایک ہزار سے زائد مدارس منسلک ہیں، ۔ جس کا نصاب طریق امتحان سندات وغیرہ یکساں ہیں۔ حکومت پاکستان نے "وفاق" کی تیس سالہ علمی خدمات کے پیش نظر شہادۃ العالمیہ کو ایم۔ اے عربی و اسلامیات کے برابر تسلیم کیا ہے۔ حضرت والا تاحیات "وفاق" کے صدر رہے۔ اور حضرت مولانا مفتی محمود صاحب اس کے ناظم تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب کی مصروفیات کے پیش نظر مفتی محمد انور شاہ صاحب کو ناظم مقرر کیا گیا۔ وفاق کا ادارہ جہاں مدارس عربیہ کے درمیان یک جہتی کے لئے مفید ثابت ہوا وہاں بہت سی آفات و بلیات سے بھی حفاظت کا ذریعہ بنا۔ بعد ازاں مختلف مذہبی طبقات کی طرف سے اپنے حلقہ اثر کے مدارس کی شیرازہ بندی میں وفاق ہی کی پیروی میں تنظیمیں بنائی گئیں۔ جو حضرت مولانا خیر محمد صاحب۔ قدس سرہ کی اصابت رائے ندرت فکر اور حقیقت شناسی کا عملی اعتراف ہے۔

شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی اور انکی سیاسی خدمات

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی دو قومی نظریہ کے زبردست حامی تھے۔ ۱۹۴۵ء میں کلکتہ میں مسلم لیگ کی حمایت کے لئے برصغیر کے علماء اور مشائخ نے مل کر جمعیت علمائے اسلام کے نام سے ایک جماعت قائم کی۔ حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی کو اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس طرح برصغیر کے وہ تمام علماء جو کانگریس کے نظریہ متحدہ قومیت کے خلاف اور دو قومی نظریہ کے قائل تھے۔ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئے۔ درالعلوم دیوبند کے ماحول پر حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا زیادہ اثر تھا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اکثر اساتذہ اور طلبہ مسلم لیگ کے خلاف اور کانگریس کے حامی تھے۔ صورتحال یہ تھی کہ مسلم لیگ قائداعظم اور دو قومی نظریہ کی کھل کر بات کرنا بہت مشکل مرحلہ بن گیا تھا۔ لیکن آپ برملا ایک قومی نظریے کی تردید اور دو قومی نظریے کی حمایت کرتے دوران درس کئی بار مولانا ابوالکلام آزاد کارد کیا۔

۱۹۴۷ء کے اوائل میں دیوبند میں مسلم لیگ کا عظیم الشان جلسہ ہوا سردار عبدالرب نشتر اس میں شرکت کے لئے دیوبند آئے۔ حضرت مولانا علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نے سردار عبدالرب نشتر کے اعزاز میں ضلع کے مسلم لیگی زعماء کی دعوت کی۔ آپ بھی اسمیں شریک تھے۔ اس موقع پر آپ نے سردار عبدالرب نشتر کو مخاطب کر کے ایک شعر کہا۔

عبدربم بہر کافر نشترم۔ دست اخواں، بہر اعدا خنجرم

۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آگیا۔ آپ نے مئی ۱۹۴۹ء میں دارالعلوم دیوبند سے استعفیٰ دے دیا۔ آپ اپنے اہل خانہ سمیت بحری جہاز کے ذریعہ ۲۱ دسمبر ۱۹۴۹ء کو کراچی پہنچ گئے۔ بحری جہاز کا سفر اس لئے اختیار کیا گیا۔ کہ آپ اپنی تمام کتب لکڑیوں کی پیٹیوں میں بند کر کے لائے تھے اور باقی سارا سامان وہیں چھوڑ آئے تھے۔

قوم پرستوں کا مغالطہ

سیرۃ المصطفیٰ میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ قوم پرستوں کا یہ کہنا کہ ایک وطن اور

ایک ملک کے باشندے ایک قوم ہیں۔ یہ ان کا محض ایک مغالطہ اور دھوکہ ہے اس گروہ کا ایک خاص نظریہ اور خاص عقیدہ ہے۔ جو شخص اس عقیدے اور نظریے میں ان کا موافق اور ہم خیال ہے۔ وہ ان کا دوست ہے۔ اگرچہ وہ دوسرے ملک اور دوسرے وطن کا باشندہ ہو۔ اور جو شخص اس نظریے اور اس عقیدے میں ان کا مخالف ہو۔ وہ ان کا دشمن ہے۔ اگرچہ وہ ان کا کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہو۔ مشرق اور مغرب کے باشندے جو اشتراکی عقیدے رکھتے ہو وہ دونوں باوجود بعد المشرقین کے قریب اور ایک ہیں۔ اور دو حقیقی بھائی ایک گھر کے رہنے والے اگر مختلف المسلک ہوں تو وہ دونوں ایک دوسرے غائیت درجہ بعید ہیں۔ اتحاد کا دارو مدار وطنیت اور قومیت پر نہیں بلکہ اتحاد کا مدار مسلک کے اتحاد پر ہے۔ پس اگر شریعت اتحاد اور اخوت کا مدار اسلام اور کفر کو قرار دیتی ہے تو اس کو تعصب اور تنگ نظری کیوں بتاتے ہیں۔

فتنہ متحدہ قومیت

آپ فتنہ متحدہ قومیت کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں۔ ایک ملک کے باشندے ایک زبان کے بولنے والے زمانے کی اصطلاح میں اگرچہ ایک قوم کہلاتے ہیں۔ مگر شریعت مطہرہ کی نظر میں قومیت اور اخوت کا دارومدار ایمان اور کفر ہے۔ شریعت کی نظر میں کافر اور مسلمان دو علیحدہ قومیں ہیں۔ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا۔ اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا اگرچہ ان میں باپ اور بیٹے کا رشتہ ہی کیوں نہ ہو، مسلمان کے جنازے میں کسی کافر کو حاضر ہونے تک کی اجازت نہیں۔

دو قومی نظریہ

دو قومی نظریے کا اعلان خود قرآن کرتا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے وہ ذات پاک ہے۔ جس نے تمہیں پیدا کیا۔ پس تم میں کافر بھی ہیں اور مومن بھی اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اسکی خبر رکھنے والا ہے۔

علاقائی عصبیت اور صوبائی خودمختاری اسلامی وحدت کے خلاف ہے

جب تک مسلمان مسلمان کی حیثیت سے سوچتے رہے۔ دنیا پر انکی عظمت و ہیبت قائم رہی اور کسی قوم کو یہ جرات نہ ہوئی کہ ان کی وحدت ملی اور عظمت کو چیلنج کر سکے۔ مگر جب

انہوں نے عربی۔ عجمی۔ ایرانی۔ مصری۔ شامی اور ترکی کی حیثیت سے سوچنا شروع کر دیا۔ تو ان کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی عظمت و شوکت قصہ پارینہ بن گئی۔ اور بالآخر بیشتر علاقوں میں انہیں اپنی آزادی تک سے ہاتھ دھونا پڑے۔ صوبائی خود مختاری ایک فریب ہے۔ اسکی حقیقت اس سے بڑھکر کچھ نہیں کہ چند حریصیان اقتدار کی خواہش کے مطابق ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے تا کہ اس علاقے کی زمام اقتدار وہاں کے کسی بڑے جاگیردار و سرمایہ دار کے ہاتھوں میں آجائے۔ ظاہر میں یہ خود مختاری ہے مگر اندرونی طور پر اور انجام کار کسی کافر یا کافرہ کی غلامی اور ایسی غلامی ہے جس سے چھٹکارے کے لئے صدیوں جان و مال اور عزت و آبرو کی قربانی دینی پڑتی ہے۔

دستور اسلامی کی تدوین میں حصہ

ایوان اقتدار جو لوگ ہر وقت اسلام کا نام لیتے تھے مگر زیر زمین ان لوگوں کی کوششیں تھیں۔ کہ اسلام کو ملکی' سیاسی اور عملی زندگی میں آنے سے روکا جائے۔ حضرت علامہ عثمانی صاحب کی طبع زیرک ان سیاستدانوں کے تیور بھانپ گئی تھی۔ ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے 9-10 فروری 1949ء کو ڈھاکہ میں جمعیت علمائے اسلام کی ایک کانفرنس بلائی گئی۔ حضرت علامہ عثمانی صاحب نے بصیرت افروز خطبہ صدارت پڑھا۔ اور ارباب حکومت کے عزائم پر سے پردہ اٹھایا۔ لیاقت علی خان وزیر اعظم تھے۔ حضرت علامہ عثمانی کو عوام میں جو بے پناہ مقبولیت حاصل تھی۔ انہیں اپنے الیکشن میں اسکا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا۔ خدا نے انہیں ایسا سحر آفرین انداز خطابت عطا کیا تھا کہ لاکھوں کے مجمع میں آگ لگا دیتے تھے۔ لیاقت علی خان نے اندازہ لگالیا کہ اگر حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی بگڑ گئے تو ملک میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہو گا۔ جسے کوئی روکنے والا نہیں ہو گا۔ اور حضرت علامہ عثمانی صاحب نے اسمبلی کو یہ چیلنج کیا کہ آپ کھل کر انکار کر دیں کہ ہم اسلامی دستور نہیں بنانا چاہتے۔ میں اسمبلی سے استعفیٰ دے دونگا اور مسلمانوں کو یہ بتاؤنگا کہ تمہیں دھوکہ دیا گیا ہے یہ صورتحال دیکھکر لیاقت علی خان نے حضرت علامہ عثمانی صاحب سے قرار داد مقاصد کا مسودہ تیار کرنے کی درخواست کی۔ حضرت علامہ عثمانی صاحب نے مسودہ تیار کیا۔ جو مختصر ہونے کے باوجود انتہائی جامع تھا۔ ارباب اقتدار کی بحث و تمحیص کے بعد ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو دستور ساز اسمبلی نے معمولی ترمیمات کے ساتھ پاس کیا۔ قرار داد مقاصد کی منظوری

حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب کا ایسا کارنامہ تھا جو تاریخ پاکستان میں سنہری حروف سے لکھا گیا۔ دستور اسلامی کی تدوین کے اگلے مراحل کے متعلق ابھی غور و فکر جاری تھا کہ حضرت علامہ عثمانی صاحب کی صحت خراب ہو گئی۔ 13 دسمبر 1949ء کو آپ کا انتقال ہو گیا۔ حضرت علامہ عثمانی صاحب کی وفات کے بعد حکومت کی طرف سے علماء کو یہ طعنہ دیا جانے لگا کہ وہ کسی ایک بات پر متفق نہیں ہیں۔ اس لئے لوگوں کے سامنے کوئی اسلامی دستور خاکہ پیش کرنا بے سود ہے۔ علماء نے اس چیلنج کو قبول کیا۔ حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کی تحریک پر کراچی میں مختلف مکاتب فکر علماء کا ایک نمائندہ اجتماع 21-22-23-24 جنوری 1951ء کو منعقد ہوا جسمیں مشرق و مغربی پاکستان کے 31 علماء کرام نے شرکت کی۔ اس اجتماع میں آپ بھی شریک ہوئے۔ اور آئین پاکستان کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے دوسرے علماء کرام کے ساتھ ملکر بھرپور جدوجہد کی۔ مختلف الخیال علماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا اور انہیں ایک فارمولے پر متحد کرنا بہت مشکل کام تھا۔ مگر حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب کی ہمت بلند نے اس مشکل کام کو آسان کر دیا۔ ملک کے تمام مذہبی مکاتب فکر کے علماء کرام نے متفقہ طور پر اسلامی مملکت کے لئے 22 راہ نما بنیادی اصول مرتب کر کے اتحاد و اتفاق کی بے مثال یادگار قائم کی۔ علماء کرام نے صرف چار روز میں کام مکمل کر کے قوم کی سامنے رکھ دیا۔ وہ لیڈران قوم جو علماء کو سیاست اور امور مملکت سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ دیتے تھے۔ وہ علماء کی پیش کردہ بنیادی سفارشات پر چونک گئے۔ اور مسٹر اے۔ کے۔ بروہی جیسے دانش وروں کے لئے جو یہ دعویٰ کرتے تھے۔ کہ قرآن میں دستور مملکت کے لئے ایک لفظ بھی موجود نہیں غور و فکر کا ایک باب کھل گیا۔ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد خواجہ ناظم الدین وزارت عظمٰی کے منصب پر فائز ہوئے۔ زمام اقتدار ایسے ہاتھوں میں آگئی جو مذہب کو اپنے محلوں سے بہت دور رکھنا چاہتے تھے۔ انہیں ملک و قوم کے مفاد سے زیادہ اپنا ذاتی مفاد عزیز تھا۔ حالات پر مایوسی کے دبیز پردے گرتے دیکھے تو حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی نے 14-15 نومبر 1952ء کو ڈھاکہ میں ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس کے ذریعہ حکومت کو صاف الفاظ میں بتادیا گیا کہ کوئی ایسا دستور قبول نہیں کیا جائے گا جو اسلام کے نام پر بنایا گیا ہو مگر اسکی روح سے خالی ہو۔ اس کانفرنس سے ایوان اقتدار میں زلزلہ آگیا۔ کانفرنس ختم ہوتے ہی اگلے روز خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم کی طرف سے اکابر علماء کرام کو دعوت نامہ جاری کئے

گئے 19 اکتوبر 1952ء کو گفتگو کیلئے کراچی بلایا گیا۔ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی، حضرت مولانا اطہر علی سلہٹی۔ مولانا محمد داؤد غزنوی لاہور۔ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھولی۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحب۔ حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کراچی۔ حضرت مولانا شمس الحق صاحب فرید پوری ڈھاکہ۔ حضرت مولانا خیر محمد جالندھری ملتان۔ حضرت مولانا عبدالحق صاحب۔ حضرت مولانا دین محمد صاح ڈھاکہ رات نو بجے خواجہ صاحب کے ساتھ علماء کا اجلاس ہوا۔ علماء اکرام کی ترجمانی حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی نے فرمائی سردار عبدالرب نشتر اور مولانا تمیز الدین نے کتاب و سنت کے مطابق دستور مرتب کرنے کے سلسلے میں عملی اشکالات پیش کئے۔ علماء نے ان کی تسلی بخش جواب دیئے۔ تمام گفتگو میں افہام و تفہیم کی فضا برقرار رہی۔ آخر میں خواجہ صاحب نے علماء کو یقین دلایا کہ آپ حضرات بے فکر رہیں علماء اور عوام کی خواہش کے مطابق آئین بنایا جائے گا۔ خواجہ صاحب کے اس فقرے پر آپ نے فرمایا ہماری بھی دعا ہے کہ خدا آپ کو ناظم دین بنائے۔ اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس دستوری رپورٹ کو 22 نومبر 1952ء کو پیش ہونا تھا۔ اسے 22 دسمبر تک ملتوی کر دیا گیا۔ اور پھر 22 دسمبر کو جو دستوری خاکہ اسمبلی میں پیش ہوا وہ کافی حد تک اسلامی تھا۔ 14 جنوری 1974ء کو اسلامی نظریاتی کونسل کا آپ کو رکن بنایا گیا۔ آپ نے بطور ممبر اسلامی نظریاتی کونسل تدوین دستور اسلامی میں بھی حصہ لیا۔

○ ○

کتابیات

۱۔ بیس بڑے مسلمان

۲۔ بیس مردان حق

۳۔ سیرت اشرف۔اول' دوئم

۴۔ اسلام اور سیاست

۵۔ تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی

۶۔ کلمتہ الحق

۷۔ ماہنامہ "الحسن" لاہور

۸۔ ماہنامہ "الصیانتہ" لاہور

۹۔ مجالس حکیم الامت

۱۰۔ مولانا اشرف علی تھانوی اور جدوجہد آزادی

۱۱۔ کاروان احرار

۱۲۔ امداد الفتاوی

۱۳۔ اشرف المقالات۔اول۔دوئم

۱۴۔ اشرف السوانح

۱۵۔ مولانا عبیداللہ سندھی کے علوم وافکار

۱۶۔ افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ

حکیم محمد سعید
HAKIM MOHAMMED SAID
HAMDARD HOUSE
KARACHI 74800
(Pakistan)

Karachi Clinic: 215908, Office: 6616001-4, Residence:
Telex: 29370 HAMD PK, Telefax: (92-21) 6611755
E-Mail: hipak@paknet3.ptc.pk.
Madinat al-Hikmah: 6996001-2, 6900000
Lahore: Clinic 7237729
Rawalpindi: Clinic 566716
Peshawar: Clinic 274186

۲۶ جون ۱۹۹۶ء

جناب محترم

السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ

آپ کی کتاب "جوڑوں کا درد اسباب و علاج" مجھے مل گئی تھی۔ اس ہدیہ علمی کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ اس کے بارے میں میرے تاثرات درج ذیل ہیں۔

کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے وجع المفاصل اور عرق النسا جیسے امراض محتاج تشریح نہیں ہیں۔ لاتعداد افراد ان میں مبتلا ہیں اور ہر طریقہ علاج میں اس کی دوائیں بہ کثرت موجود ہیں۔

کتاب کے مرتب رانا محمد اشرف نے اس مرض کے علاج کے لیے مشاہیر اطبا کے مجرب نسخے، دوائیں تیار کرنے کے طریقے، خوراک اور دیگر تمام ضروری تفاصیل یک جا کر دی ہیں اور بڑی خوبی یہ ہے کہ اس مرض میں استعمال کی جانے والی ہومیوپیتھی کی دوائیں بھی ضروری ہدایات کے ساتھ لکھ دی ہیں اس طرح یہ کتاب اس مرض کے علاج کے لیے طب اور ہومیوپیتھی کی ایک مفید کتاب بن گئی ہے۔

علاج سے پہلے تشخیص اور اسباب پر گہری نظر کی ضرورت ہے۔ مولف نے طب اور ہومیوپیتھی دونوں کی روشنی میں قابل ذکر باتیں لکھدی ہیں۔ اطبا اور ہومیوپیتھی کے ڈاکٹروں کے لیے یہ کتاب معاون ہو سکتی ہے۔

رانا محمد اشرف صاحب یہ کتاب افادۂ عام کے لیے اپنی والدہ مرحومہ کی روح کو ایصال ثواب کی نیت سے لکھی ہے، وہ طویل عرصے تک جوڑوں کے درد میں مبتلا رہ کر دار فانی سے کوچ کر چکی ہیں۔

رانا اشرف صاحب نے دوران علالت اپنی والدہ کو طب، ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی کی دوائیں استعمال کرائیں ان کے تجربے کئے اور وہ سارے نسخے اپنے پاس محفوظ رکھے، پھر انھیں سلیقے سے مرتب کر دیا تو یہ اپنے موضوع پر اچھی خاصی کتاب ہو گئی۔

جناب حکیم رانا محمد اشرف صاحب
مکان نمبر ۲۵۴ گلشن اقبال کالونی
ہارون آباد
ضلع بہاولنگر ۶۲۱۰۰